اسلام کا معاشرتی نظام

چودھری غلام رسول ایم۔ اے

ILMI
علمی کتاب خانہ

علمی کتاب خانہ
کبیر سٹریٹ ○ اردو بازار ○ لاہور

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المآئدہ ۵ : ۳)

اِسلام کا معاشرتی نظام

چودھری غلام رسول ایم۔اے

گورنمنٹ کالج گوجرخان

28392

عِلمی کتاب خانہ ... کبیر سٹریٹ اردو بازار لاہور

30/ روپے

MASOOD FAISAL • JHANDIR LIBRARY
ACC NO 065754
★ MAILSI ★

انتساب

میں یہ تصنیف پروفیسر چودھری نذیر احمد ایم اے مرحوم و مغفور سابق پرنسپل کے نام معنون کرتا ہوں، جن کی علمی مجالس نے میری ذہنی استعدادوں کو جلا بخشا اور جن کی محبت میرا سرمایۂ حیات ہے۔

غلام رسول۔

تقدیم ثانی

پہلا ایڈیشن اسلام کے نظامہائے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پر مشتمل تھا۔ کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے تینوں حصوں کو الگ الگ کر دیا گیا ہے ۔ زیر نظر ایڈیشن صحت، ترامیم اور اضافوں کے ساتھ منصۂ شہود پر لایا جا رہا ہے۔ اُمید ہے۔

قارئین حضرات اس ایڈیشن کو مفید پائیں گے۔

غلام رسول

۲۰ نومبر ۱۹۷۷ء

تقدیم

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اپنے فضل سے مجھے سیرت سید البشر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تیسرا حصہ جزو دوم مکمل کرنے کی توفیق عنایت کی ہے اس کے بعد میں اپنے دو عالم دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تصنیف میں میری مدد کی وہ مرزا محمد حسین صاحب بی کام مصنف کتاب "اسلام اینڈ سوشلزم" اور پروفیسر فضیلت حسین صاحب ہیں۔ مرزا صاحب نے "جدید سیاسی نظریات" سے متعلق قیمتی مواد مہیا کیا گیا، اگر وہ مواد مجھے میسّر نہ آتا تو میں "جدید سیاسی نظریات" پر بحث کرنے کا حق ادا نہ کر سکتا۔ پروفیسر موصوف نے جدید اقتصادی نظریات سے متعلق مواد مہیا کر کے دیا۔ ان دو قابل احترام دوستوں کے علاوہ پروفیسر صابر حسین ایم اے بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جو مجھے اپنے پاس بٹھا کر گھنٹوں جدید سیاسی نظریات پر بحث کرتے رہتے۔ جس وجہ سے میرے لیے یہ آسان ہو گیا تھا کہ میں مزید مطالعہ کے ساتھ جدید سیاسی نظریات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔ اس حصّہ میں اسلام کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظاموں پر جدید معاشرتی سیاسی اور اقتصادی نظریات کے ساتھ موازنہ کر کے بحث کی گئی ہے اور دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ اس دَور کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کا حل صرف اسلام کی تعلیم میں مضمر ہے اور یہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر چل کر دُنیا امن اور فلاح سے ہمکنار ہو سکتی ہے اس راستہ کے علاوہ کوئی راستہ نہیں جو بنی نوع انسان کے پیچیدہ مسائل کے حل کا ضامن ہو۔ دُنیا آگ کے گڑھے کی طرف تیزی کے ساتھ جا رہی ہے اللہ تعالیٰ سے "خیر اُمت" کا لقب پانے والے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وُہ اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ دُنیا کو اسلام کی تعلیم سے آگاہ کریں۔ دُنیا ایک ایسے راستہ کی متلاشی ہے جس پر چل کر وُہ امن اور سُکھ کا سانس لے سکے۔ جب وہ اسلام سے آگاہ ہوں گے تو وُہ پکار اُٹھیں گے کہ یہی وُہ راستہ ہے جس کے وُہ متلاشی ہیں۔

خاکپائے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم

غلام رسُول

۲۷-۷-۷۱

دیباچہ

از پروفیسر امان اللہ خان صاحب ایم اے شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

مجھے میرے محترم فاضل دوست چودھری غلام رسول صاحب ایم اے نے اپنی نئی تصنیف بعنوان "اسلام کا معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظام" کا پیش لفظ لکھنے کو کہا۔ میرے لیے باعث مسرت ہے کہ میں ایک دینی اور علمی کتاب کے متعلق چند سطور لکھ رہا ہوں اس مقصد کے لیے میں نے مسودے کے جستہ جستہ حصوں کا مطالعہ کیا ہے مصنف نے بڑی محنت عرقریزی، جانفشانی اور کمال شفقت سے نظامہائے معاشرت سیاست اور اقتصاد پر مختلف اور مفید مصادر سے معلومات کا ذخیرہ فراہم کر کے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ چودھری صاحب کی یہ پُرخلوص سعی قابل تحسین ہے کہ انہوں نے دورِ حاضر میں انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا اور نسلِ انسانی کے تمام مسائل کا حل اسلام ہی قرار دیا ہے۔

برادرم پروفیسر چودھری غلام رسول صاحب علوم اسلامیہ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں، اور اپنی اس دلچسپی کا اظہار مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد کتب لکھ کر کر چکے ہیں جو علمی اور دینی حلقوں میں عموماً اور طلبا میں خصوصاً پسندیدہ نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اب انہوں نے اپنے علمی ذوق کا اظہار زیرِ نظر تصنیف کو پیش کر کے کیا ہے۔ یہ کتاب عین وقت کی آواز ہے۔ اس دور میں اس موضوع پر جتنی کتب لکھی جائیں وہ کم ہیں، کیونکہ نظریاتی جنگ زوروں پر ہے۔ مسلمان مادی نظریات کی رو میں بہہ کر اسلام سے دوری اختیار کرتے جا رہے ہیں اس وجہ سے مادی نظریات سے متا[illegible]رات کو اسلام کے حسین چہرے سے واقف کرانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ پروفیسر صاحب نے مادی نظریات پر اسلام کی برتری ثابت کر کے ایک نہایت ہی اہم دینی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علمی اور دینی حلقوں اور طلباء میں پسندیدہ نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ میں طلباء سے خاص طور پر کہوں گا کہ وہ کتاب کا مطالعہ کریں۔

امان اللہ ۱۵ / ۸ / ۱۹۷۱

فہرست مضامین

حصہ اوّل

اسلام کا معاشرتی نظام

معاشرہ	۱
معاشرہ کا آغاز اور ترقی	۲
قرابتداری، مذہب، امن وحفاظت	۳
معاشرہ کے مقاصد	۳
معاشرہ اور ارتقاء	۵
معاشرہ کی چار منزلیں	۵
اسلامی معاشرے کی خصوصیات	۱۴
انسان کی مدنیت پسندی	۲۳
اسلام اور نظریہ اجتماع	۲۵
ظہورِ اسلام سے قبل دُنیا کی معاشرتی حالت کا نقشہ	۲۹
اسلامی تہذیب	۵۴
ثقافت	۵۴
ثقافت کے عوامل	۵۷
تمدّن	۵۹
تمدن کی اقسام	۶۰
تمدن کے ارتقائی منازل	۶۵
تہذیب	۶۶
ثقافت، تمدن اور تہذیب میں فرق	۶۷
تہذیب کے عناصر ترکیبی	۶۸
اسلامی تہذیب کی رُوح	۷۴
تہذیب اسلامی کی خصوصیات	۷۶
معاشرتی ادارے	۸۶
خاندان	۹۰
معاشرتی زندگی میں خاندان کی اہمیت	۹۰
عائلی زندگی	۹۱
نکاح کی اہمیت ازرُوئے قرآن وحدیث	۹۱
فقہاء کی نظر میں	۹۲
روشن خیال مفکرین کی نظر میں	۹۳
اجتماعی حیثیت سے اہمیت	۹۴
ترکِ لذّت سے ممانعت	۹۴
نکاح کی اساس	۹۵
ناجائز طریقوں سے تکمیل شہوت اسلام کی نظر میں	۹۵
نکاح کے مقاصد	۹۹
حُرمتِ نسب	۱۰۵
حُرمتِ رضاعت	۱۰۵
حُرمت مصاہرت	۱۰۶
محرّمات	۱۰۶
نکاح کے احکام	۱۰۸
تعدّدِ ازدواج	۱۱۲
اسلام میں تعدّد ازدواج	۱۱۳

تعدّد ازدواج کی اصلاح ۱۱۶
تعدّد ازدواج غیروں کی نظر میں ۱۱۷
رسولِ کریمؐ کے تعدّد ازدواج کے اسباب ۱۱۸
طلاق دُوسرے مذاہب میں ۱۲۰
اسلام کا قانونِ طلاق ۱۲۳
طلاق سے پہلے مصالحت کی کوشش ۱۲۳
طلاق پر حد بندیاں ۱۲۴
عدّت تین طہر ہیں ۱۲۵
طلاق کی اقسام ۱۲۶
طلاق دینے کی تین صُورتیں ۱۲۷
شرائط طلاق ۱۲۸
حق حضانت ۱۲۹
نفقہ و سُکنیٰ ۱۳۰
خُلع ۱۳۱
مفقودُالخبر ۱۳۳
عنین و مجبُوب ۱۳۳
ایلاء ۱۳۴
کفّارہ ۱۳۵
ظہار اور اس کا کفّارہ ۱۳۵
اسلام میں عورتوں کی حیثیت ۱۳۷
عورت کا خصوصی حیثیت سے مقام ۱۳۹
گھریلو زندگی اور عورت ۱۴۱
یورپ میں عورت کی آزادی کا نعرہ ۱۴۲
زوجین کے حقوق و فرائض ۱۵۰
بیوی کے حقوق ۱۵۲
خاوند کے حقوق ۱۶۴
حقوق والدین ۱۷۹
حقوق اولاد ۱۸۸
معاشرہ کے دیگر اجزاء کے حقوق و فرائض ۲۰۰
رشتہ داروں کے حقوق ۲۰۰
یتیموں کے حقوق ۲۰۷
ہمسایوں کے حقوق ۲۱۴
حاجت مندوں کے حقوق ۲۱۹
مہمان و میزبان کے حقوق و فرائض ۲۲۳
میزبان کے حقوق ۲۲۵ (بیمار کے حقُوق ۲۲۷)
خادم اور آقا کے فرائض ۲۲۸
آقا کے حقوق ۲۳۶
غلامی کا خاتمہ ۲۳۷
دوستوں کے حقوق ۲۴۶
مسلمانوں کے حقوق و فرائض ۲۴۹
عام انسانوں کے حقوق ۲۵۸
اُمّت ۲۷۳
اُمّت اسلامیہ کے خصوصی امتیازات ۲۷۵
اُمّت مسلمہ کے فرائض ۲۷۹
مکتب ۲۸۳
اقوال در فضائل علم ۲۸۵
مکتب کا آغاز و ارتقاء ۲۸۵
علمی حیثیت سے مشہور مساجد ۲۸۶
مکتب کا آغاز
معاشرے کی اصلاح میں مکتب کے فرائض ۳۰۰

معاشرہ میں استاد کا فرائض ۳۰۳
اساتذہ کے فرائض ۳۰۷
شاگرد کے فرائض ۳۰۹
مسجد ۳۱۲
مسجد کی اہمیت ۳۱۳
مسجد کے آداب ۳۲۰
مسجد کے معاشرتی اثرات ۳۲۶
منڈی ۳۳۶
منڈی کے اقسام ۳۳۹
منڈی بلحاظ وقت ۳۳۹
منڈی بلحاظ محل وقوع ۳۴۰
منڈی بلحاظ جنس ۳۴۲
منڈی بلحاظ مقابلہ ۳۴۲
منڈی کی اہمیت، ارتقاء اور اثرات ۳۴۷
ریاست ۳۵۱
مملکت کے ابتدائی نظریات ۳۵۴
مملکت کی اقسام ۳۵۷
اسلامی ریاست ۳۶۴
اسلامی حکومت کے نام ۳۶۴
اسلامی حکومت کے رئیس کے خطابات ۳۶۵
خلیفہ کا انتخاب ۳۶۶
شرائط امارت یا خلافت ۳۶۸
خلیفہ کے اختیارات پر پابندیاں ۳۶۹
خلیفہ کی معزولی ۳۶۹
اقتدار اعلیٰ ۳۷۱
حکومت کے اختیارات ۳۷۵
غیر مسلم رعایا کے حقوق ۳۹۰
شہریوں کے فرائض ۳۹۹
دستور اساسی ۴۰۲
اسلامی حکومت کا دستور
اسلامی دستور کی خصوصیات ۴۰۴
الٰہی اور انسانی دساتیر میں فرق ۴۰۵
قانون سازی کے مصادر ۴۰۸
اسلامی قانون کی خصوصیات ۴۳۲
اعضائے حکومت ۴۳۸
(مجلس وضع قوانین (مقننہ) ۴۳۸
عاملہ یا انتظامیہ ۴۴۱
عدلیہ ۴۴۶
اسلامی حکومت کے اوصاف ۴۴۸
اسلامی اصول کی خارجہ پالیسی کے اصول ۴۶۵

مُعاشرہ

معاشرہ کیا ہے؟

معاشرہ معاشرت کے لفظ کی ایک صورت ہے جس کے معنی ہیں مِل جُل کر زندگی بسر کرنا لیکن عمرانیات .Sociology میں معاشرہ کی اصطلاح اپنے مخصوص معنی رکھتی ہے۔ اسے وسیع اور محدود دونوں معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ وسیع معنی میں تمام نسلِ انسانی کو معاشرہ یعنی سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور محدود معنی میں اس سے مراد وہ گروہ لیا جاتا ہے جو کچھ لوگوں یا خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

مختلف ماہرینِ عمرانیات .Sociologists نے معاشرہ کی تعریف حسبِ ذیل الفاظ میں کی ہے:

ایف۔ ایچ گڈِنگز F. H. Giodings کہتا ہے:

"معاشرہ یا سماج ایک جیسے خیالات رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے جو ہم خیالی کو پسند کریں اور اِس بنا پر مشترکہ مفادات کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔"

اسپنسر کہتا ہے:

"معاشرہ افراد کی ایک تعداد کا اجتماعی نام ہے اور بس۔"

جان ایف سوبر کہتا ہے:

"یہ ایک ایسا (بہت بڑا) انسانی گروہ ہے جو کافی عرصہ سے اکٹھا رہا ہو حتیٰ کہ منظّم ہو گیا ہو۔ اور جس کے افراد اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظّم کرے۔"

رالف لنٹن۔ Ralph Limton کہتا ہے:

"معاشرہ لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو کافی عرصہ تک اکٹھا رہا ہو اور زندگی گزارتا ہو۔ اس حد تک کہ اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظّم کر لیا ہو۔"

سمیز اور کیلر Summer and Kellar. کے نزدیک معاشرہ "ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو کہ اشتراکِ عمل کے ذریعے وسائل حیات کے حصول اور بقائے نسل کے لیے جدّ و جُہد کرے۔"

میک لیور Macluer معاشرہ کو سماجی تعلقات کا وہ نظام قرار دیتا ہے جس میں اور جس کے ذریعہ ہم زندگی گزارتے ہیں۔"

گمپلورز، معاشرہ کی تعریف میں کہتا ہے "ایک گروہ جو کہ چند ایک یا زیادہ مشترک مفادات پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔"

مذکورہ بالا تعریفوں کے پیشِ نظر ہم حسبِ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

۱۔ معاشرہ افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو مشترک مفادات کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتا ہے۔

۲۔ معاشرہ کو معرضِ وجود میں آنے کے لیے ایک کافی عرصہ کی ضرورت ہے۔

۳۔ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا معاشرے کا فرض ہے۔

۴۔ معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

۵۔ معاشرہ باہمی تعاون اور تعلق کی مستقل بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔

۶۔ ایک معاشرے کے لوگوں کی ثقافت مشترک ہوتی ہے۔

۷۔ معاشرے کے سب ارکان اپنے آپ کو وحدت میں سمجھتے ہیں۔

معاشرہ کا آغاز اور ترقی

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا فطری رجحان ہے۔ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کا محتاج ہے۔ ابتدا میں سوسائٹی سادہ تھی۔ بتدریج سوسائٹی ترقی کرتی چلی گئی۔ آخر کار ابتدائی مملکت کا آغاز ہوا۔

انسان کے اس فطری رجحان کے علاوہ معاشرہ قائم ہونے کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

(۱) ضروریاتِ زندگی کی تکمیل (۲) قرابتداری (۳) مذہب (۴) امن و حفاظت کی ضرورت۔

انسان کی بنیادی ضروریات خوراک اور لباس وغیرہ ہیں۔ ابتدا میں انسان پھل کھا کر اور

درخت کے پتوں سے جسم ڈھانک کر زندگی بسر کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف وسائل معلوم ہو گئے، اور انسانی اوزار اور آلات بنانے لگا، تقسیم کار عمل میں آئی۔ جوں جوں انسانی ضروریات بڑھتی چلی گئیں انسان کو ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور آپس میں متحد ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس طرح ضروریات تکمیل کی بنا پر جماعتی زندگی میں تنظیم شروع ہو گئی۔

قرابت داری معاشرتی زندگی کی تنظیم میں قرابت داری کا بہت اہم حصہ ہے۔ ایک خاندان یا قبیلہ نے مل جل کر زندگی گزارنا شروع کی۔ پھر چند خاندانوں یا قبیلوں نے مل جل کر رہنا شروع کر دیا، گاؤں اور شہر آباد ہونے لگے، اپنی حفاظت کے لیے تنظیم شروع کر دی۔ اور اس تنظیم کے بطن سے مملکت نے جنم لیا۔ ارسطو کہتا ہے کہ خاندانی زندگی کا مقصد معاشی ضرورتوں کو مہیا کرنا ہے اور مملکت کا مقصد انسانی اخلاق اور کردار کی تعمیر ہے۔

مذہب معاشرہ کی تنظیم اور اتحاد میں مذہب کا بہت حصہ ہے۔ ہر نبی نے اپنی اپنی قوم کو اتحاد کی لڑی میں منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔ جماعتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے والدین کے حقوق و فرائض، اولاد کے حقوق و فرائض، زوجین کے حقوق و فرائض، ہمسایہ کے حقوق و فرائض، انسانوں کے باہمی حقوق و بیان کیے۔

امن و حفاظت کی ضرورت ابتدا میں جماعتی زندگی سادہ تھی، کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ اثاثہ نہ ہوتا تھا۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا چلا گیا وسائلِ معاش میں ترقی ہوتی چلی گئی۔ دولت اور ثروت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اندرونی اور بیرونی خطرات بڑھنے شروع ہو گئے۔ ان خطرات سے بچنے کے لیے اِس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے لوگوں کی حفاظت کرے۔

معاشرہ کے مقاصد ۱۔ انسان عالم صغیر ہے۔ اس میں اللہ تعالےٰ نے بے شمار قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ وہ مخفی صلاحیتیں صرف معاشرہ میں ہی نشوونما پا سکتی ہیں۔ جس طرح درخت کا ایک چھوٹا سا بیج ہے اس بیج میں ہی شاخیں، تنے، پتے، پھول اور پھل وغیرہ بننے کی صلاحیتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ جب

اس بیج کو وہ ماحول دے دیا جائے تو اس کی تمام مخفی استعدادیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک ایسا ماحول ہو جس میں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ظاہر کر سکے۔ وہ ماحول صرف سوسائٹی میں میسّر آسکتا ہے۔ پس معاشرہ کا سب سے اہم مقصد افراد کی صلاحیتوں کی آبیاری کرنا ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد افراد میں جذبہ خدمت پیدا کرنا ہے۔ اسلام نے خدمتِ خلق پر بہت زور دیا ہے۔ جب تک معاشرہ کے افراد میں خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تک معاشرہ مستحکم بنیادوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں خدمتِ خلق کے متعلق آتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آلِ عمران ۳: ۱۱۰)

تم بہترین اُمت ہو جو سارے انسانوں کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا۔[۱]

اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ۔[۲]

اور اس کی محبت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو مال دیتے اور غلام آزاد کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے:

تو مومنوں کو ایک دوسرے پر رحم، محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوں۔[۳]

جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا۔ جو کسی مسلمان کی تنگی کو دُور کرے گا تو اللہ اس کے بدلے قیامت میں اس کی تنگی کو دُور کرے گا۔[۴]

۳۔ معاشرہ کا تیسرا مقصد افراد کی مادی ضروریات پوری کرنا ہے۔ رسولِ کریمؐ کی ایک حدیث قدسی ہے جو اِس مقصد کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک انسان سے پوچھے گا اے ابنِ آدمؑ میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری

---

[۱] الدھر ۷۶: ۸ [۲] البقرہ ۲: ۱۷۷ [۳] بخاری کتاب الاداب [۴] ابو داؤد۔

بیمار پرسی نہ کی۔ بندہ متعجب ہو کر کہے گا بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور تُو تو تمام جہانوں کا خود پالنے والا ہے۔ خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی عیادت کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابنِ آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے میں تجھے کیسے کھلاتا۔ آپ تو خود رب العالمین ہیں۔ خدا فرمائے گا تجھے یاد نہیں کہ فلاں میرے بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تُو تو خود پروردگارِ عالم ہے۔ خدا فرمائے گا میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے اِسے پانی نہیں پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔[1]

معاشرہ کا چوتھا مقصد امن قائم کرنا ہے جب تک افراد معاشرہ، امن اور محبت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرتے۔ اس وقت تک معاشرہ حقیقی معنوں میں معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں معاشرہ کا نصب العین ہی امن کا قیام اور باہمی محبت کی فضا پیدا کرنا ہے۔

معاشرہ میں حقیقی امن، جان، مال اور آبرو کی حفاظت سے قائم ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔[2]

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

رسولِ کریم صلعم فرماتے ہیں: اِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا[3] تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے۔

معاشرہ اور ارتقاء

معاشرہ کی چار منزلیں

انسانی معاشرہ ارتقاء پذیر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک معاشرہ

---

[1] مسلم [2] بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳ [3] بخاری کتاب الحج

کی چار ارتقائی منازل ہیں۔ ہر منزل ایک دوسرے کے بعد آتی ہے۔ معاشرہ ارتقاء کی اگلی منزل میں اس وقت قدم رکھتا ہے جب اس نے پہلی منزل طے کر لی ہو۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہر اگلی منزل اس وقت تک نہ آئے جب تک پہلی منزل ہر اعتبار سے مکمل نہ ہو جائے اور یہ خوبی وحُسن اپنے اندر نہ لے لے۔ بلکہ معاشرہ کی اگلی منزل میں پہنچ کر انسان پہلی منزل کے عناصر میں حسن وخوبی اور کمال پیدا کرنے پر زیادہ قادر ہوتا ہے۔

معاشرہ کی پہلی منزل

اللہ تعالےٰ نے انسان کو جوہرِ عقل سے نوازا ہے اور یہی وہ جوہر ہے جو اِس کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔ انسان اور حیوان کی بنیادی ضرورتیں ایک ہی ہیں۔ یعنی کھانے پینے، گرمی سردی سے بچنا اور افزائشِ نسل کے جذبات انسان نے اپنی عقل خداداد کی مدد سے انہی حیوانی ضروریات میں ایک خاص رنگ دے دیا۔ اپنی ضرورتیں حاصل کرکے ان میں اصلاح کی۔ چنانچہ اس نے مختلف اناج تلاش کیے۔ اور تجربوں سے یہ معلوم کیا کہ کون سی غذا اس کی طبیعت کے موافق ہے۔ پھر اناجوں کو کثرت سے حاصل کرنے کی تراکیب سوچیں۔ اس طرح کاشت کرنے، اناج بونے، اس کی آب یاری کرنے، فصل کاٹنے اور اناج کو بھوسے سے الگ کرنے کے طریقے معلوم کیے۔ پھر اپنی عقل خداداد کی مدد سے غذاؤں کو اچھی شکل میں استعمال کرنے کے طریقے معلوم کیے، پانی حاصل کرنے کے لیے کنویں کھودے۔ ضرورت کے وقت پانی کو محفوظ رکھنے کے لیے برتن وغیرہ بنائے، حیوانات سے کام لینا شروع کیا، رہنے کے لیے گھر اور خیمے تیار کیے۔ گرمی اور سردی کی حفاظت اور عُریانی کو چھپانے کے لیے لباس استعمال کرنا شروع کیا۔ اسی منزل میں افزائشِ نسل کے لیے ایک زوجہ منکوحہ معین کرنے کا طریقہ وضع کیا تاکہ بیوی ایک ہی مرد کی خیال کی جائے اور دوسرا مرد جذبہ جنسی کی تسکین کے لیے توجہ نہ کرے۔ غرض کہ انسان نے اس منزل کے لیے تمام حیوانی ضروریات اور احتیاجات کو پورا کرنے میں اپنی عقل خداداد کے ذریعہ حسن وخوبی اور کمال پیدا کیا۔

ابتدائی منزل انسانی معاشرہ کا سنگِ بنیاد ہے۔ کوئی بھی انسانی جماعت خواہ وہ کہیں رہتی ہو، ابتدائی منزل کے اجتماعی اداروں سے کسی حال میں بھی خالی نظر نہیں آتی۔

دوسری منزل

وقت گزارنے کے ساتھ جب نوعِ انسانی کثرت میں تبدیل ہو گئی، زندگی میں ایک تنوع پیدا ہوا اور باہمی معاملات میں اضافہ ہُوا، چھوٹے

چھوٹے گاؤں، شہروں اور قصبوں میں تبدیل ہو گئے تو انسان نے معاشرے کے پہلے درجے پر قناعت نہ کی بلکہ اپنی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اچھے سے اچھے طریقوں کی تلاش کی۔ تجرباتی و مشاہداتی علوم نے ترقی کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک وہ پانچ قسم کے علوم ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ نے ارتقاء کی دوسری منزل میں قدم رکھا وہ یہ ہیں:

(ا) حکمتِ معاشیہ

(ب) حکمتِ منزلیہ

(ج) حکمت اکتسابیہ

(د) حکمتِ تعاملیہ

(ھ) حکمتِ تعاونیہ

(ا) حکمتِ معاشیہ یہ علم انسان کے طعام، شراب، لباس، رہائش، چلنا، پھرنا، نشست و برخاست، سونا، مرض، مصائب، مسرت، تسکین جذبہ جنسی سفر سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً کھانے کے آداب میں یہ بات ضروری ہے وہ خراب نہ ہو، جو انسان کی صحت کو نقصان نہ پہنچائے، کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھوئے، کلی کرے، اس کے بعد دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھائے، بڑے بڑے لقمے لے کر نہ کھائے، اس وقت کھانا کھائے جب بھوک لگی ہوئی ہو۔

پینے کی چیزوں میں یہ ضروری ہے کہ اس میں بدبو نہ آتی ہو، وہ اپنی طبعی حالت پر ہو۔ پینے کی چیزوں میں بدترین وہ چیزیں ہیں جو نشہ آور ہیں۔ کیونکہ اس سے صرف انسان کی عقل ہی نہیں ماری جاتی بلکہ معاشرہ میں فساد برپا ہوتا ہے۔

لباس: جب انسان کو یہ احساس پیدا ہوا کہ عریانی شرمناک ہے تو اس نے اپنی برہنگی کو چھپانے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت اختیار کر لی۔ اب بھی وحشی اقوام میں اپنی برہنگی کو چھپانے کے لیے درختوں کے پتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جب تمام لوگ اس امر پر متفق ہو گئے کہ عریانی بری چیز ہے تو سوچنے لگے کہ بہترین لباس کون سا ہو سکتا ہے۔ آخر انسان کی عقل نے اس طرف راہنمائی کی کہ بہترین لباس وہ ہے جو بدن کو چھپائے اور ریا شانہ تکلف سے پاک ہو۔

رہائش: مکان کا مقصد گرمی سردی سے بچاؤ اور جان اور مال کی حفاظت ہے۔ مکان اس قسم کا ہونا چاہیئے جو اس مقصد کو پورا کرتا ہو۔ مکان کی تعمیر میں عیاشانہ تکلف سے کام نہ لیا جائے۔ بہترین مکان وہ ہے جس کا مواد آسانی سے میسر آ سکتا ہو۔ مکان ہوادار اور کھلا ہوا اور اوسط درجہ کا اونچا ہو۔

چلنا، پھرنا: چلتے وقت میانہ روی سے کام لیا جائے، چال میں غرور اور تکبّر نہ ہو۔

نشست و برخاست: اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے۔ بدترین نشست عام گزرگاہ ہے جہاں سے عورتیں گزرتی ہوں اور ان کے چہرہ پر نظر پڑ سکتی ہو۔

سونا: انسان کو چاہیئے کہ وہ رات کو جلد سوئے اور دماغ کو گندے خیالات سے پاک کر کے سوئے۔

مرض: انسان جب بیمار ہو تو مجرّب دوا استعمال کرے۔

مصائب: مصیبت کے وقت انسان جزع و فزع نہ کرے، صرف اللہ پر بھروسہ کرے اور مصیبت کا سامنا کرے۔

مسرت: خوشی کو صرف اللہ کا فضل سمجھے اور اللہ کو بھول نہ جائے۔ خوشی کے سامانوں سے نوعِ انسانی کو بھی فائدہ پہنچائے۔

تسکین جذبہ جنسی: مرد اور عورت کا میلاپ ضروری امر ہے لیکن انسان کی غیرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ زن شوئی تعلقات پوشیدہ ہوں، مرد کی منکوحہ معین ہو تاکہ دوسرا شخص اس سے تعلق پیدا نہ کر سکے۔

سفر: ضرورتوں کے لیے سفر ضروری ہے۔ ضرورت کے وقت جب سفر درپیش آئے زادِ راہ ساتھ لے لیا جائے۔ اگر ساتھی ہو تو بہت اچھا ہے۔

حکمت منزلیہ

حکمت منزلیہ سے مراد یہ ہے کہ اہل و عیال، اعزّہ و اقرباء، دوستوں، اہل جار اور عام لوگوں سے ایسا سلوک کیا جائے جو اچھے اخلاق، منفعت عامہ اور صحیح تجربات کے مطابق ہو تاکہ انسانی معاشرہ میں خوش گوار ربط پیدا ہو سکے۔

حکمتِ منزلیہ میں خاص طور پر ان چار باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے:

(۱) خاوند اور بیوی کے باہمی حقوق و فرائض۔

(۲) اولاد کے حقوق و فرائض

(۳) آقا اور خادم کے ایک دوسرے پر حقوق اور احکام

(۴) انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض

(ج) **حکمتِ اکتسابیہ** حکمتِ اکتسابیہ یا نظامِ معاش کی تعریف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یہ کی ہے کہ "انسان اپنی معاش میں رفاہیت اور ذوقِ حسن یا ظرافت کا خیال رکھے اور کوشش کرے کہ انسان اپنی تمام ضرورتیں اوسط درجے کی رفاہیت سے پوری کرے۔ اگر یہ کوشش نہ کی جائے تو انسان سخت تکلیف اور رنج و غم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اتنی حاجتیں جمع ہو جاتی ہیں کہ ایک شخص انہیں بطریقِ احسن پورا نہیں کرسکتا؛" [۱]

جب انسانی سوسائٹی کی ضروریات و احتیاجات اتنی بڑھ گئیں اور سب کا پورا کرنا ایک شخص کے لیے مشکل ہوگیا تو لامحالہ دوسرے افراد کی ضرورت پڑی۔ سوسائٹی میں تخصیصِ پیشہ سے کام لیا جانے لگا کہ ایک ایک گروہ ان پیشوں میں مہارت پیدا کرے اور اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے دوسری کی ضرورت پوری کرے۔ تقسیمِ عمل سے مبادلے کی ضرورت پیش آئی۔ مثلاً ایک لوہار کوئی چیز بناتا ہے، اور اس کو جوتے کی ضرورت ہے، اسے توقع تھی کہ اپنی لوہے کی بنائی ہوئی چیز دے کر موچی سے جوتے خریدے گا۔ لیکن موچی کو فی الحال اس لوہے کی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے لوہار اپنی ضرورت پوری نہیں کرسکا۔ معاشرہ میں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگے تو عقل مندوں نے کسی ایسی چیز کی تلاش کی جو معاوضہ کی صلاحیت رکھتی ہو اور جلد خراب نہ ہوتی ہو۔ آہستہ آہستہ سونا چاندی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور سکّے کا رواج شروع ہوگیا۔

جب سوسائٹی میں تخصیصِ پیشہ عمل میں آگئی تو ان پیشوں کو ایک ضابطے میں رکھنے کے لیے ایک طاقت اور سیاسی نظام کی ضرورت پیش آئی کیونکہ اگر پیشوں کو ایک ضابطے اور کنٹرول میں نہ لایا جائے تو معاشرہ انسانی کو بہت سے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً تمام لوگ صنعت و حرفت میں ہی نہ لگ جائیں یا مویشیوں کی پرورش اور کاشت کاری کی طرف نہ مائل ہو جائیں، دفتروں میں ملازمت کے پیچھے نہ دوڑ پڑیں، کیونکہ سب لوگوں کا ایک ہی پیشہ اختیار

---

[۱] ارتفاقاتِ معاشیہ مصنفہ شیخ بشیر احمد بی۔ اے ص ۸۵

کرنے سے دوسرے پیشوں کے لیے آدمیوں کی تعداد گھٹ جائے گی۔ پیشوں کے اس عدم توازن سے معاشرہ میں اجتماعی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ دوم، لوگ ایسا پیشہ اختیار نہ کریں جس سے سوسائٹی پر بُرا اثر پڑتا ہو۔

اِن حالات کو روکنے کے لیے حکومت کی ضرورت پیش آئی۔ جو پیشوں کو ایک ضابطے کے تحت تقسیم کرے اور کوئی ایسا پیشہ عمل میں نہ آنے دے جو افراد معاشرہ کے لیے مخرب الاخلاق ہو۔ اور اسی طرح حکومت ایسے قوانین نافذ کرے جو سوسائٹی کے استحکام اور ترقی کے لیے ضروری ہوں۔ اور لوگوں کے ایسے اعمال کا محاسبہ کرے جو سوسائٹی کے لیے مضر ہیں۔

(د) حکمت تعاملیہ

یہ علم لین دین کے اصول وضع کرتا ہے۔ لین دین کی کئی شکلیں ہیں؛

۱۔ **بیع** : اس میں مال کا مبادلہ مال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۲۔ **ہبہ** : یعنی دنیاوی اور اخروی نفع کے لیے کوئی چیز بلا معاوضہ دینا۔

۳۔ **اعارہ** : اس میں نفع بلا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

۴۔ **دین** : اس میں اعارہ اور بیع دونوں کی صفات پائی جاتی ہیں۔

مبادلے کے اصول

۱۔ جس چیز کی خرید و فروخت کی جائے، اس کی قیمت اور دوسرے ضروری امور سے متعلق ہر بات واضح کر لی جائے۔

۲۔ فریقین سودے کے متعلق ایجاب قبول کریں یا نقد سودا ہو تاکہ فریقین کی رضامندی کا اظہار ہو جائے۔

۳۔ اگر لین دین نقد نہ ہو تو اسے لکھ لیا جائے، جس پر شہادت ثبت ہو یا رہن رکھ لیا جائے تو بھی وثیقہ تحریر کر لیا جائے اس سے معاشرے میں باہمی جھگڑے کم ہو جاتے ہیں۔

سوسائٹی میں جھگڑے کے مواقع کم کرنے کے لیے حسب ذیل قوانین ضروری ہیں:

۱۔ تمام زمین اللہ کی ہے اور اس میں ان کی روزی کا سامان پیدا کیا ہے، سب انسانوں کا حق ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن باہمی تنازعے کے انسداد کے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جو شخص کسی قطعہ زمین سے سب سے پہلے فائدہ حاصل کرنا شروع کر دے وہ اس کی ملکیت ہو گی۔ اسی کا نام حقِ ملکیت[۱] یعنی حق انتفاع ہے۔ زمین پر قبضے کے صرف یہ معنی

---

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک انفرادی ملکیت اسی حد تک جائز ہے کہ وہ مفاد عامہ کے خلاف نہ ہو۔

ہیں کہ وہ شخص دوسرے کی نسبت اس زمین سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

۲۔ ضابطہ معیشت میں سوسائٹی کے تمام افراد اس میں حصہ لیں اور ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

۳۔ جو چیزیں عام فائدہ کے لیے ہیں ان پر کسی کا قبضہ نہ ہو تاکہ ہر شخص ان سے استفادہ کرسکے۔

۴۔ سب لوگ باہمی سوسائٹی سے سوسائٹی کی پیداوار میں اضافہ کریں اور نئی ایجادات اور اختراعات کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کی کوشش کریں۔

۵۔ اجتماعی ترقی اور بہبودی کے لیے ان تمام ناجائز ذرائع کو مسدود کردیا جائے جو اصولِ تمدن کے منافی ہوں۔ مثلاً قمار بازی، سٹہ، سُود اور رشوت وغیرہ۔

(ھ) حکمت تعاونیہ

یہ علم امداد باہمی سے تعلق رکھتا ہے۔ سوسائٹی میں رہنے والے تمام افراد کا حق ہے کہ ان کی تمام طبعی ضروریات پوری ہوں وہ بھوکا نہ رہے، اس کے پاس کپڑے ہوں، رہائش کے لیے مکان ہو، صحت اور تعلیم کی عام ضرورتیں پوری ہوں، تمام افراد یکساں قابلیت اور اہلیت لے کر پیدا نہیں ہوتے، بعض لوگ زیادہ کما سکتے ہیں بعض کم۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی آفت یا حادثے کی وجہ سے کمانے کے قابل نہیں رہتے۔ اس لیے صاحبِ ثروت احباب کا طبعی فرض ہے کہ وہ سوسائٹی کے کم کمانے والوں یا نہ کما سکنے والوں کی ضرریات کا خیال رکھیں۔ اگر صاحبِ ثروت احباب اس طبعی فرائض سے روگردانی کریں گے تو معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

انسانی معاشرہ باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل سے ہی ترقی کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مندرجہ ذیل صورتیں بیان کی ہیں، جو معاشرہ میں پیدا ہو چکی ہیں:

۱۔ **مفاوضت**: اس میں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور دوسرا اس سے تجارت کرتا ہے نفع معاوضت میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ چند آدمی برابر کا مال شریکِ تجارت کر کے کاروبار کرتے ہیں، نفع ونقصان میں برابر شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں۔

۳۔ عنان یہ ہے کہ معین مال میں شریک ہو کر کاروبار کیا جائے، مگر کوئی شخص دوسرے کا کفیل

نہ ہو جس سے وہ آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کر سکیں۔

۴۔ **شرکت صنائع :** اس میں ایک پیشے کے چند افراد مل کر محنت کرتے ہیں اور اجرت آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔

۵۔ **مزارعت :** جس میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دوسرے کی محنت اور آلات۔

تیسری منزل جب سوسائٹی کے مختلف گروہوں کے مابین ربط قائم کرنے، اجتماعی مفاد کی حفاظت کرنے کے لیے ایک سیاسی نظام قائم ہو جاتا ہے تو معاشرہ تیسری منزل میں قدم رکھ لیتا ہے۔

حضرت "شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بدور بازغہ" میں اس تیسرے درجہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں اس سیاسی نظام کو معاشرہ کو درست رکھنے کے لیے پانچ کام انجام دینے پڑتے ہیں:

۱۔ حرص، بخل اور حسد یہ وہ مذموم خصائل ہیں جو افراد معاشرہ کے دلوں میں اختلافات، نفرت اور دشمنی کو جنم دیتے ہیں۔ اگر اختلافات کو دور نہ کیا جائے تو آپس میں قتل و غارت کی نوبت آجاتی ہے۔ ایک قوی اور با اختیار سیاسی نظام کا یہ فرض ہے کہ وہ افراد معاشرہ کے تنازعات اور جھگڑوں کا منصفانہ طور پر فیصلہ کرے اور اپنی قوت سے تمام اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ باہر پھینکے۔

۲۔ بسا اوقات معاشرے کے کچھ لوگ بری عادات اور مخرب الاخلاق عمل میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان پر حیوانی جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ سیاسی نظام کا یہ فرض ہے کہ ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ناپاک ارادوں سے باز رکھے، ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ ان کی وجہ سے معاشرہ بد نتائج اور مہلک امراض کا شکار ہو جائے۔

۳۔ معاشرہ میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد یا تو دوسرے لوگوں کا مال و دولت چھیننا ہوتا ہے یا ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح حکومت پر قابض ہو جائیں اور اپنے ناجائز حوصلوں کی آگ بجھائیں۔ اس قسم کے لوگ اپنے گرد بہت سے شرپسند عناصر کو جمع کرتے ہیں۔ اس لیے سیاسی نظام کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر وقت ایسے فتنہ سامان اور شر انگیز عناصر کے خلاف جدوجہد کرتا رہے، تاکہ معاشرہ بدامنی کا شکار نہ ہو سکے۔

۴۔ ہر دور میں مفکرین امت کے سامنے انسانی اجتماع کو بہترین شکل میں قائم رکھنے کے لیے ایک نصب العین رہتا ہے ۔ ان تمام کی سعی اور جد و جہد اس نصب العین کو حاصل کرنا ہوتا ہے ۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ معاشرہ میں عدالت میں اپنی مکمل ترین شکل میں قائم رہے چنانچہ سیاسی نظام کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس ارفع مقصد کے حصول کے لیے ان مفکرین کے ساتھ مکمل تعاون کرے ۔

۵۔ دنیا کے جھگڑوں میں پھنس کر انسان اپنے اخلاقی اور مذہبی تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے ، اپنے دین اور فرائض کو بھلا دیتا ہے ۔ اچھے سیاسی نظام کے لیے یہ ضروری ہے کہ اخلاقی اقدار اور دینی فرائض کے احیاء کے لیے افراد معاشرہ کو وقتاً فوقتاً رشد و ہدایت کا راستہ بتاتا رہے اور انہیں اپنے خوابِ غفلت سے بیدار کرتا رہے ۔

حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے مالی ضرورت پڑتی ہے ۔ مالی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بیت المال قائم کیا جائے گا جس کی آمدنی کا ذریعہ مختلف قسم کے ٹیکس ہوں گے ۔ اور یہ تمام ٹیکس مالداروں سے لیے جائیں گے

چوتھی منزل

جب ہر قوم کا سیاسی نظام مستحکم ہو جاتا ہے تو یہاں پہنچ کر ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ چوتھی منزل میں قدم رکھ لیتا ہے ۔ وہ نئی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ مختلف سیاسی وحدتیں باہم دست و گریباں ہو جاتی ہیں ۔ ان جھگڑوں کے کئی وجوہ ہیں : یا تو ایک وحدت ہوس ملک گیری کے چکر میں پھنس کر دوسری وحدت پر حملہ کر دیتی ہے ۔ یا کبھی قوم کی معاشی ضرورتیں مجبور کرتی ہیں کہ دوسرے ممالک پر قبضہ کر لیا جائے ۔ بین الاقوامی امن قائم کرنے کے لیے ایک ایسے نظام کی ضرورت پڑتی ہے جو مختلف وحدتوں کے درمیان نظم قائم رکھ سکے ۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک یہ نظام فوجی نقطہ نگاہ سے اتنا مضبوط ہونا چاہیئے کہ مختلف ریاستیں مل کر بھی اس نظام کا مقابلہ کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں ۔ اس نظام کے ماتحت مختلف محکمے ، فوجی ، مالی ، پند و نصائح ، قضا اور پولیس وغیرہ ہوں ۔ اور اس بین الاقوامی تنظیم کا یہ فرض ہوگا کہ اگر کوئی ریاست بین الاقوامی قانون کو توڑنے کی کوشش کرے تو اس کا سختی سے محاسبہ کرے اور اس کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دے ۔

معاشرے کی تعریف

معاشرتی اسلام کی خصوصیات

اسلامی معاشرے کی خصوصیات

اسلامی معاشرہ حسبِ ذیل خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو دنیا کے کسی معاشرے میں پائی نہیں جاتیں:

وحدتِ نسلِ انسانی

اسلام وحدتِ نسلِ انسانی کا داعی ہے۔ تفریق بین الناس کا شدید مخالف ہے۔ قومی، لونی، لسانی اور نسلی امتیازات کو جڑ سے کاٹتا ہے۔ نسلِ انسانی کی وحدت کا نظریہ وہ نظریہ ہے جس کی نظیر دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں نہیں ملتی۔ یہی وہ نظریہ جس پر امن کی عمارت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

نسلِ انسانی کی وحدت کا اعلان

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۔ [1]

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۔ [2]

اور سب لوگ ایک ہی قوم ہیں اور وہ باہم جھگڑتے ہیں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ [3]

یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں، سو مجھ سے ڈرو۔ مگر انہوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ہر گروہ اس پر خوش ہے جو ان کے پاس ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ [4]

---

[1] النساء ۴:۱ [2] یونس ۱۰:۱۹ [3] المؤمنون ۲۳: ۵۲، ۵۳ [4] الانبیاء ۲۱: ۹۲: ۹۳

اور یہ تمہاری قوم ایک ہی قوم ہے اور میں تمہارا رب ہوں - سو میری بندگی کرو مگر انہوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں قطع کر دیا۔ سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ [1]

اور سب کے سب اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [2] مومن سب بھائی بھائی ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحدتِ نسلِ انسانی کے تصوّر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ [3]

ساری مخلوق عیال اللہ ہے، اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق کو سب سے زیادہ چاہتا ہے۔

کونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری) تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اللّٰھم ربنا ورب کل شئ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ۔ [4]

اے ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

عملی اتحاد کی بنیاد تمام تفریقات اور امتیازات کو مٹانے کے لیے سب سے پہلی بنیاد مسجد ہے، جہاں پانچ وقت مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں۔ جہاں غریب امیر کے ساتھ، خادم آقا کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہوتا ہے۔

حج کی عبادت کا بھی ایک عظیم مقصد جاہلیت کے امتیازات کو مٹانا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسولِ کریمؐ نے وحدتِ نسلِ انسانی کے پیغام کو دُہراتے ہوئے فرمایا:

ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی

---

[1] آلِ عمران ۳: ۱۰۳ [2] الحجرات ۴۹: ۱۰ [3] بیہقی کتاب الایمان [4] بخاری

اسود ولا لا سود علی احمر الا بالتقوی۔ [1]

لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے، اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے
ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی
فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب سے۔

وحدت فکر انسانی نسلِ انسانی کے زیغ اور تشتت اور افتراق کی سب سے بڑی وجہ مصنوعی اور غیر فطری فرق ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے تباہ کُن ہے۔ اسلام نے نسلِ انسانی کو وحدتِ فکر کی سلک میں منسلک کرنے کے لیے ایسے اصول وضع کیے ہیں جن کی پابندی انتشار فکر سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسلام نے غور و فکر سے منع نہیں کیا بلکہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ اپنی عقل سے کام لو۔ بلکہ منع اس امر سے کرتا ہے کہ عقل کے گھوڑے کو بے لگام نہ چھوڑو، جہاں چاہے دوڑتا پھرتا رہے۔ بلکہ عقل کی راہنمائی کے لیے کچھ اصول مقرر کیے ہیں۔ ان کی پابندی لازمی ہے وہ اصول قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ہدایت للناس اور ہدایت للمتقین کہا ہے۔

وحدت فکر انسانی کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ
اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ۔ [2]

دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے، اور انہوں نے جن کو کتاب دی گئی اختلاف نہیں کیا مگر اس کے پیچھے کہ ان کے پاس علم آ چکا ہے آپس کی ضد سے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام صرف قرآن مجید کے اصولوں کے ہی داعی تھے۔ لیکن ان کے ماننے والے ان اصولوں کو چھوڑ کر اپنی اغراض اور خواہشات کے پیچھے دوڑ پڑے۔ انتشار فکر کا شکار ہو گئے۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ
وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ
فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ [3]

سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا خوش خبری دینے

---

[1] اخرجہ احمد و ابو داؤد [2] آلِ عمران ۳: ۱۹ [3] البقرہ ۲: ۲۱۳

والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری۔ تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں باہم اختلاف کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وحدت فکر انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمانی اصول نازل کئے ہیں۔ اگر لوگوں کی عقلیں اختلافات اور انتشار کی دلدل میں پھنس جائیں تو آسمان کی روشنی سے کام لے کر وحدت فکری کی سلک میں منسلک ہو جائیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ ؎۱

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین چاہتا ہے تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ وہی سوچ اور سمجھ صحیح ہوگی جو قرآنی اصول کی روشنی میں ہوگی۔ قرآنی اصولوں کو چھوڑ کر جو بھی سوچے گا وہ جادہ صواب سے ہٹ جائے گا۔ اور ہلاکت و بربادی کا راستہ اختیار کرے گا۔

احترام انسانیت

اسلامی معاشرہ میں انسان ہونے کی حیثیت سے سب برابر ہیں۔ نہ تو امارت اور نہ غربت کسی کے لئے وجہ تکریم ہے اور نہ غربت وجہ ذلت۔ اور نہ کوئی نسل کے لحاظ سے مسند صدارت پر بیٹھنے کا زیادہ مستحق ہو سکتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان، احترام کا مستحق ہے

۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ یعنی ہم نے آدمؑ کے بیٹوں کو عزت کے قابل بنایا ہے۔ اب رہا یہ کہ معاشرہ میں لوگوں کی عزت اور ذلت کا معیار کیا ہے۔ سو اس کے لئے قرآن مجید نے اچھے اعمال اور تقویٰ معیار مقرر کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ یعنی ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے لحاظ سے مقرر کردہ۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ تم میں سب سے زیادہ عزت کا مستحق اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ تقویٰ کیا ہے، اللہ کے احکام کی پیروی کرنا۔

؎۱ آل عمران ۳: ۸۵

اسلام
امر بالمعروف ونہی عن المنکر
معاشرہ

کے لئے ایک ایسا ضابطہ اخلاق مقرر کرتا ہے جس سے کسی کو بھی سر مو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ صرف اس ضابطہ اخلاق کو خود اپنانا ہی لازمی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ جو شخص اس سے انحراف کرنے کی طرف مائل ہو اس کو روکا جائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہی معاشرہ میں حسن اور نظم پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر معاشرہ میں فساد اور بگاڑ ہو جاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [1] نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ [2]

تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے پیدا کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ [3] اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔

رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں: من رای منکم منکرًا فلیغیّرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف الایمان [4] تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے درست کر دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے دل میں برا جانے۔ اور یہ کمزور ترین ایمان ہوگا۔

والذی نفسی بیدہ لتامرون بالمعروف ولتنھون عن المنکر اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذابًا من عندہ ثم لتدعنہ ولا یستجاب لکم [5]

---

[1] المائدہ ۵:۲ [2] آل عمران ۳:۱۱۰ [3] آل عمران ۳:۱۰۴ [4] مشکوٰۃ المصابیح کتاب الآداب باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر [5] ایضاً۔

قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہیں ضرور نیکی کی ہدایت کرنا ہوگی اور برائی سے روکنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے پھر تم اسے پکارو گے اور تمہاری پکار کا جواب نہ دیا جائے گا۔

مساوات

اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو ہر قسم کی مساوات حاصل ہے نہ تو کسی کو دوسرے پر نسلی، لونی، قومی فوقیت حاصل ہے اور نہ کسی کو قانونی برتری، اسلامی معاشرہ میں تمام لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ خصوصیت اسلامی معاشرہ کے ہر پہلو میں نمایاں نظر آتی ہے۔ نماز میں سب لوگ ایک ہی حیثیت میں کھڑے ہوتے ہیں۔ امیر غریب شاہ وگدا، آجر اور اجیر سب ایک ہی صف میں دست بستہ خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کے لئے بھی کھڑا ہونے کے لئے کوئی خاص مقام نہیں ہوتا۔ ماہِ رمضان کا آتا ہے تو سب یکساں طور پر بھوکے رہتے ہیں۔ حج کا موسم آتا ہے تو تمام اکناف عالم سے مسلمان مکہ پہنچ جاتا ہے۔ اور سب ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں اور مناسک حج ادا کرتے۔ معاشرہ میں عدل وانصاف قائم رکھنے کے لئے سب لوگ قانون کی نظر میں برابر ہیں، امیر قانون شکنی کرتا ہے تو سزا پاتا ہے

قرآن میں اعلان مساوات

قرآن مجید نے مساوات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً[1]
اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

حدیث میں اعلان مساوات: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ایک مشہور خطبہ میں فرمایا:

ایها الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی۔ اے لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

---

[1] النساء ۴: ۱

آزادی :: اسلام سوائے خدا اور قانون الٰہی کی غلامی کے ہر قسم کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے آزادی کا مقصد بے مہار ہونا نہیں فیثا غورث سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ آزاد آدمی کون ہے۔ اس نے جواب دیا جو نیکی کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ اسلام ہر فرد کو شریعت کی حدود کے اندر رہ کر اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ [1] ۔ یعنی تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔

ایک اور جگہ اللہ فرماتا ہے لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [2] یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

احساس ذمہ داری

اسلام ہر فرد کو اپنے فرض کی ادائیگی کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ [3] خبردار تم میں سے ہر ایک شخص ذمہ دار ہے اور اس کی ذمہ داری کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔

خدا پرستی

اسلام کی تعلیم کا بنیادی پتھر توحید ہے یعنی خدا کو اس کی ذات صفات اور اعمال میں ایک جاننا اور اسی کی عبادت بجا لانا۔ ماسوا اللہ کے نقوش کو دل سے مٹا دینا اس وجہ سے اسلامی معاشرہ کی اہم اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام افراد صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔ خدا پرستی ہی وہ خصوصیت ہے جس سے اسلامی معاشرہ کی تمیز دوسرے معاشروں سے کی جاسکتی ہے۔

اطاعتِ رسول

اطاعتِ رسول توحید کا لازمہ ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے اطاعتِ رسول پر بہت ہی زور دیا ہے قرآن مجید میں آتا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [4]

یعنی تمہارے لئے اللہ کے رسول میں عمل کا نمونہ ہے یعنی رسول کے نقش قدم پر چلو۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [5]

اور یعنی رسول جو کچھ تمہیں دے اس کو لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

فاتقوا اللہ واصلحوا ذات بینکم واطیعوا اللہ ورسولہ

---

[1] الکفرون ۶ : ۱۰۹ [2] البقرہ ۲ : ۲۵۶ [3] بخاری مسلم [4] الاحزاب ۳۳ : ۲۱ [5] الحشر ۵۹ : ۷

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور باہمی مصالحانہ رویہ اختیار کرو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔

شرفِ انسانیت

توحید کا لازمی نتیجہ شرف انسانیت ہے کیونکہ توحید انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلاتی ہے اور اس کو اشرف المخلوقات قرار دیتی ہے۔ اس دور میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو حقیقی توحید کا علمبردار ہے۔ ہندو مذہب آگ ہوا سورج اور پانی کی پرستش کی تعلیم دیتا ہے پھر تمام معاشرے کو درجہ بندی کے ساتھ چار ذاتوں برہمن، کشتری، ویش اور شودر میں تقسیم کیا ہے۔ اور ان چار ذاتوں میں شودر نہایت ہی ذلیل درن ہے منو میں لکھا ہے کہ برہما نے شودر کو برہمنوں کی خدمت کے واسطے بنایا ہے۔ اور اس کے لئے خواہ شودر ہو یا غلام ہو اس سے کام برابر لینا چاہیے۔ (۴۱۳/۸)

ہندو ازم نے انسانوں کے ایک حصے کو شرف انسانیت سے گرا دیا ہے۔ بدھ ازم نے انسانوں کو حقیقی نجات حاصل کرنے کے لئے ترک دنیا کی تعلیم دے کر انسانیت کے مقام ارفع سے گرا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بیشمار مخفی قوتیں اور استعدادیں دی ہیں جن کا اظہار دنیا میں رہ کر ہی ہو سکتا ہے۔ ان کے اظہار میں ہی عظمت آدمیت ہے۔

شنتو ازم مظاہر پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کا سب سے بڑا معبود سورج ہے اس کے علاوہ ان کے ان گنت معبود ہیں۔

عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔ آدم اور حوا نے جو گناہ کیا وہ وراثتہً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص گنہگار قرار دینا شرف انسانیت سے گرا کر قعر مذلت میں پھینکنا ہے۔

تمام مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو شرف انسانیت کا علمبردار ہے جس نے پوری کائنات پر اس کو برتری دی ہے۔

عظمت آدمیت کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔

لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۔ [1]

---

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰

اور یقیناً ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے۔ بڑی فضیلت دی ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۱؎
اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم سے فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی۔ مگر ابلیس نے نہ کی اس آیت کریمہ میں انسان کو اپنی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے مسجود ملائک قرار دیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۲؎ یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے احسن تقویم میں عظمت انسانیت کی طرف اشارہ ہے۔
اور انسان کو یہ عظمت اور بزرگی صرف اللہ کا نائب ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے اور اسی کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے کائنات کی ہر چیز اس خدمت کی لئے پیدا کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۳؎ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۴؎ کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۵؎ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بنو۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۶؎ جو کچھ زمین میں ہے اس نے صرف انسانوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖ ۷؎
کیا تونے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور

۱؎ البقرۃ ۲:۳۴ ۲؎ التین ۹۵:۴ ۳؎ البقرہ ۲:۳۰ ۴؎ الذاریات ۵؎ بقرہ ۲:۲۱
۶؎ البقرہ ۲:۲۹ ۷؎ الحج ۲۲:۶۵

اور کشتی کو بھی کہ وہ دریاؤں میں اس کے حکم پر چلتی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ [1]

اور اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ تمہارے رزق کے لئے پھل پیدا کئے اور کشتی کو تمہارے کام میں لگایا جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے اور تمہارے لئے نہریں مسخر کر دیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ [2]

اور تمہارے لئے سورج اور چاند، دن اور رات مسخر کئے۔

قرآن مجید میں اس مضمون کی بے شمار آیات ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

انسان کی مدنیت پسندی

انسانوں اور حیوانوں میں کم و بیش جماعت پسندی کا فطری رجحان ہے ایک تاریخی مسلمہ امر ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش سے کسی نہ کسی شکل میں معاشرہ سے وابستہ رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار سال قبل یونانی فلاسفر ارسطو نے یہ کہا تھا کہ انسان مدنی الطبع ہے وہ سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے پروان چڑھتا ہے اور اس میں رہتا ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے

"افراد انسانی کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے" [3]

کومے اپنی کتاب (Humature and the Social Order) میں فرد اور معاشرہ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فرد اور معاشرہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انفرادیت وقت اور اخلاقی رتبہ سے کسی طرح بھی معاشرہ پسندی سے نہ برتر ہے اور نہ اولیت رکھتی ہے۔ انفرادیت اور معاشرت پسندی دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آئے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اسی بنا پر وہ کہتا ہے۔

Self and Society are Twin born.

---

[1] ابراہیم ۱۴: ۳۲ [2] ابراہیم ۱۴: ۳۳

[3] ابن خلدون المقدمہ صفحہ ۴۹ مطبوعہ بیروت

ڈاکٹر بینی پرشاد نے انسان کو تین اسباب کی بنا پر مدنی الطبع قرار دیا ہے۔
اول : پیدائش کے وقت کی بے بسی۔
دوم : اس کی پیدائشی صلاحیتیں
سوم : بچپن سے اس کا دماغ لچکدار ہونا۔
مفکر اسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی انسان کی مدنی الطبع دو وجوہ کی بنا پر برقرار دیتے ہیں۔
اول : حفظ نفس : بھوک پیاس سردی گرمی اور دشمن کے بچاؤ کے طریقے۔
دوم : بقاء نسل : جنسی خواہش عورت اور مرد کے تعلقات اولاد ماں باپ کا تعلق ہی وہ بنیادی وجوہ ہیں جن کی بنا پر انسان اور کم و بیش حیوان اجتماع پسند ہیں۔
حضرت شاہ صاحب انسان میں تین ایسی خواہشات بھی تسلیم کرتے ہیں جو دوسرے حیوانات میں پائی نہیں جاتیں۔ انہی خواہشات کی وجہ سے انسانی معاشرہ میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اس کے ارتقاء کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس کے برعکس حیوانات میں ان خواہشات کا فقدان حیوانی معاشرہ کو جامد بنا دیتا ہے۔

۱۔ انسان کے ہر کام کا سبب نظام اعصاب کی فوری تحریک نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے کاموں کے لئے منفی تقاضے بھی محرک ہوتے ہیں۔ انسان ہر کام سے پہلے یہ سوچے گا کہ آیا اس کا کام انسانیت کے لئے غیر مفید تو نہیں جو کام انسانیت کے لئے غیر مفید ہوگا تو وہ اس سے کنارہ کش رہے گا۔ حیوانوں کا ہر کام نظام اعصاب کی فوری تحریک کے تحت ہوتا ہے۔ حیوان کام کرنے سے پہلے یہ نہیں سوچتا کہ وہ دوسرے حیوانوں کے لئے مفید ہے یا نہیں۔ شاہ صاحب انسان کی اس خواہش کو رائے کلی کے مطابق عمل کرنے کی خواہش سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ انسان دوسرے حیوانات کی طرح محض حفظ نفس اور بقاء نسل کی ابتدائی ضروریات پوری کرنے پر ہی قناعت نہیں کرتا۔ اس کی نظر ایک مقام پر ٹھہری رہتی ہے بلکہ اس کا ذوق لطیف اور ذوق جمال بلند سے بلند تر مقام کی طرف دوڑتا پھرتا ہے خوب سے خوب تر حاصل کرنے کی تڑپ انسان کو کبھی ایجادات اور اختراعات کی دنیا میں لے جاتی ہے۔

۳۔ تیسری بات جو انسان کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ حیوان اپنی

خواہشات کو صرف فطری الہامات سے انجام دیتے ہیں جب کبھی بھی خواہش کے پورا کرنے کا وقت آتا ہے تو فطری الہام اس خواہش کے پورا کرنے کی کوشش کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس انسان صرف الہامات سے ہی نوازا نہیں گیا بلکہ عقل اور وحی کی نعمت سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ جب انسانی احتیاجات اور ضروریات بڑھتی ہیں تو انسان اپنی عقل کے ذریعہ اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے انسان نے تسخیر کائنات کی مہم محض ضروریات اور احتیاجات کی تکمیل کے لئے شروع کی ہے۔

اسلام اور نظریّہ اجتماع

قرآن مجید اور احادیث سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ انسان فطری طور پر معاشرت پسند ہے قرآن مجید میں کہیں یہ ذکر ہے کہ سب لوگ ایک امت ہیں کہیں یہ ذکر ہے اللہ تعالے نے تمہیں قومیں اور خاندان بنایا ہے کہیں یہ ذکر کیا ہے کہ اتحاد کو قائم رکھو اور جدا نہ جاؤ۔ رسول کریم صلعم اسلامی نظریہ اجتماع بیان کرتے ہوئے کہیں یہ فرماتے ہیں الخلق عیال اللہ۔ کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے کہیں انسانی اجتماع کو ایک عمارت سے تشبیہ دیتے ہیں کہیں ایک جسم سے کہیں انسانی اجتماع سے فرار کرنیوالے کو عذاب الیم کی خبر دیتے ہیں۔

غرض کہ اسلام انسان کو معاشرت پسند قرار دیتا ہے قرآن اور حدیث کی روشنی میں تفصیل حسب ذیل ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً [1]

اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً [2]

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی

---

[1] الروم ۳۰: ۲۱ [2] النساء ۴: ۱

سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

اس آیت میں ساری نسلِ انسانی کو ایک کنبہ قرار دیا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا [1]

اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ [2]

اور یہ کہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو میرا تقوی کرو۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا [3]

اور وہی جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسے نسب اور سسرال والا بنایا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ [4]

مومن بھائی بھائی ہیں۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً [5]

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں

خلیفہ کا لفظ بنی آدم کی معاشرت پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر انسان معاشرت پسند نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کا اپنا جانشین بنانا بے معنی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی خصلت اجتماع پسندی کا ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ بھی ذکر کیا ہے اگر انسان نے اجتماع اور اتحاد کو پارہ پارہ کیا اور اپنی طبعی خصلت سے منہ پھیر لیا تو وہ ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا۔ چونکہ اسلام فطری دین ہے اس لیے فطری دین کے ساتھ ساتھ ان غیر فطری امور کی طرف بھی اشارہ کرتا جاتا ہے۔ جن پر چلنے سے انسان کی دینی اور دنیاوی ہلاکت ہوتی ہے۔

معاشرے اور اجتماع کو برباد کرنے کے خطرناک نتائج کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ
إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ [6]

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی فرقے بن گئے تیرا ان

---

١ یونس ١٠: ١٩ ٢ المومنون ٢٣: ٥٢ ٣ الفرقان ٢٥: ٥٤ ٤ الحجرات ٤٩: ١٠

٥ البقرہ ٢: ٣٠ ٦ الانعام ٦: ١٥٩

سے کچھ واسطہ نہیں ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر وہ بتائے گا جو وہ کرتے تھے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ [۱]

اور اُن کی طرف نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے پاس کھلی باتیں آچکی تھیں اور انہی کے لئے بڑا عذاب ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا [۲]

اور سب کے سب اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑو اور تفرقہ نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معاشرت اور اجتماعیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عياله [۳]

ساری مخلوق اللہ کی عیال (اولاد) ہے۔

اللہ سب سے محبت اس سے کرتا ہے۔ جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

اللهم ربنا ورب كل شيء انی اشهد ان العباد كلهم اخوة [۴]

اے ہمارے رب اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

كونوا عباد الله اخوانا [۵] تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اسلام جماعتی نظام چاہتا ہے۔

الاسلام احوج الى الجماعة [۶] جماعت رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

ترى المومنين فى تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد اذا اشتكى عضوتداعى له سائر الجسده بالسهر والحمى [۵]

تو مومنین کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسے دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارا جسم بخار اور بیداری میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔

۱۔ آل عمران ۳: ۱۰۵ ۲۔ آل عمران ۳: ۱۰۲ ۳۔ بیہقی کتاب الایمان ۴۔ اخراجہ احمد ابوداؤد ۵۔ بخاری ۶۔ کنوز الحقائق حرف الہمزہ

۵۔ بخاری کتاب الادب

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ ثم شبک بین اصابعہ [1]

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے
ایسا ہے جیسا کہ ایک عمارت کا ایک جزو دوسرے جزو کو قوت دیتا ہے پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال دی۔ کہ اس طرح ایک دوسرے سے مل کر قوت دیتے ہیں۔

حدیث قدسی قال اللہ تعالیٰ انا الرحمٰن انا خلقت الرحم وشققت لھا اسما من اسمی فمن وصلھا وصلتہ ومن قطعھا قطعتہ ومن بتھا بتتہ [2]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں رحمٰن ہوں۔ میں نے رحم پیدا کیا ہے (اپنے نام) سے اس کا نام نکالا ہے جس نے اسے پیوست رکھا اور جس نے اسے کاٹ دیا میں نے اسے کاٹ دیا۔

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء [3]

تم اہل زمین پر مہربانی کرو خدا تم پر مہربان ہوگا۔

اسلام کی تعلیم کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلعم نے فرمایا۔

التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ [4]

اللہ کے احکام کی تعظیم کرو اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرو۔

تفرقہ کے برے نتائج بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلعم نے فرمایا:

انما اھلک من کان قبلکم الاختلاف [5]

اگلے لوگوں کو اختلاف نے ہلاک کیا

اسلام نے عبادات اور تقریبات میں بھی اجتماعیت کے احساس کی آبیاری کی ہے تاکہ انسان کبھی بھی اس فطری ضرورت کو نہ بھلائے۔

---

[1] بخاری کتاب الادب

[2] مختصر شرح جامع المناوی جزثانی

[3] بخاری کتاب الادب

[4] بیہقی کتاب الایمان

[5] کنوز الحقائق حرف الھمزہ

ظہورِ اسلام سے قبل دُنیا کی معاشرتی حالت کا نقشہ

ظہورِ اسلام سے قبل چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف انسانی تاریخ کا تاریک دَور تھا۔ دنیا بھر کے لوگوں کی حالت ہر لحاظ سے گرگوں تھی۔ ہر سُو تشتت و انتشار کا دَور دَورہ تھا۔ لوگوں کے عقول و قلوب سے جان و مال اور آبرو کا احترام مٹ چکا تھا۔ معاشرہ مختلف طبقات میں بٹ چکا تھا عورت کا معاشرتی زندگی میں کوئی مقام نہ تھا غلام ایک بدترین مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ سیاسی حیثیت سے تمام دنیا میں بادشاہت کا دورہ تھا۔

دنیا کے مختلف ممالک کے معاشرتی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ کہ کسطرح اسلامی تعلیمات سے روشناس ہونے کے بعد کرۂ ارض میں معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔

رُوم کی معاشرتی زندگی

قرونِ وسطیٰ میں اخوت، مساوات ایک بے معنی لفظ تھا۔ ہر جگہ سماج مختلف طبقات میں منقسم تھا۔ اس طبقاتی تفریق کو قائم اور دائم رکھنے کے لیے نئے نئے قوانین وضع کئے جاتے تھے۔ جسٹی نین نے رومی قانون کی تدوین کی تھی، وہ قانونی نقطۂ نگاہ سے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ ہنسٹرس Honestiores. یعنی ملک کا اعلیٰ ترین طبقہ جو امراء پر مشتمل تھا۔ بغاوت کے علاوہ اس طبقہ کے کسی فرد کو کسی بھی جرم میں سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی۔

۲۔ ہمولرس Humiliores. اس طبقہ کو غیر معمولی حالات میں موت کی سزا دی جاسکتی تھی۔

۳۔ سروی Servi سب سے نیچا طبقہ تھا۔ جس کے افراد کو معمولی معمولی جرائم کی پاداش میں قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ آگ میں جلادیا جاتا تھا درندوں کے سامنے پھینک کر ہڈیاں چبوادی جاتی تھیں [1]

روم میں عورت کا مقام: "لیکی" روم میں عورت کی حیثیت کے متعلق لکھتا ہے کہ عورت کا مرتبہ رومی قانون نے ایک عرصہ تک نہایت پست رکھا افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر اسے اپنی بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا۔ اور عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے

---

[1] Cambridge Medieval History Vol. II PP. 106—107.

کی مطلق رسم نہ تھی۔ اور باپ کو اس قدر اختیار تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا۔ زمانہ بعد یعنی تاریخی دور میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اور اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے۔ کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔ [1]

وادیٔ دجلہ وفرات کی معاشرتی زندگی

ا:۔ سمیری معاشرہ مندرجہ ذیل طبقات پر مشتمل تھا۔

۱: فرمانروا:۔ اس طبقہ کے ہاتھ میں تمام حکومت تھی اسے قانون بنانے اور حکومت کرنے کا اختیار تھا۔

۲:۔ کاہن وپجاری، وہ مذہبی طبقہ تھا جو عوام اور خواص کا مرجع اور علوم وفنون کا واحد اجارہ دار تھا۔ سیاسی اور مذہبی اختیارات کی علیحدگی نے گو مندروں اور محلوں کو دو مخالف مرکزوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر بھی فرمانرواؤں کو اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے اس مذہبی طبقہ کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔

۳:۔ امرا:۔ یہ بڑے بڑے زمینداروں، تاجروں اور ساہوکاروں پر مشتمل تھا۔ ملک کے تمام مادی وسائل پر قابض تھا، اس وجہ سے اس کا اثر ونفوذ پورے معاشرے پر گہرا تھا۔

۴:۔ اہل ہنر اور اہل پیشہ:۔ اس طبقہ میں اطبا، قانون گو، صناع اور ملازمین شامل تھے۔ سمیری معاشرہ کا یہ بھی ایک بااثر طبقہ تھا۔

۵:۔ زرعی مزدور وکاشت کار:۔ یہ طبقہ تہی دست ومفلس تھا۔ اس کی حالت غلاموں سے بہتر نہ تھی۔ اپنی عرق ریزی کا معاوضہ اتنا کم پاتا تھا۔ کہ اپنے اہل وعیال کو فاقے سے بچانا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔

۶:۔ غلام:۔ معاشرہ کا سب سے گرا ہوا اور پست طبقہ تھا۔ اس طبقہ میں زیادہ تر اسیران جنگ شامل تھے۔ مجرم اور مقروض بھی اکثر غلام بنائے جاتے تھے۔ جو تمام انسانی اور شہری حقوق سے محروم تھا۔ سمیری عدالت اور مذہب نے ان کو تمام حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔

ب:۔ بابلی حکومت کی معاشرتی زندگی:۔ اکادیوں کے بعد اموریوں نے وادیٔ دجلہ

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ لیکی ج دوم صفحہ ۱۹

Sumu Abu

دفرات پر تسلط قائم کیا۔ ان کے ایک سردار سوموابو کی سرکردگی میں کش تک پھیل گئے اور ایک غیر معروف شہر بابل پر تسلط قائم کرکے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد رکھی جو بابل کا پہلا شاہی خاندان کہلاتا ہے بابل میں دیگر قدیم اقوام کی طرح یہ نظریہ تھا کہ بیٹی باپ کی جائیداد کا ایک حصہ ہے، اسے بیٹی کو بیچنے کا حق ہے لڑکے کے نکاح کی ذمہ داری باپ پر تھی وہ اس کے لئے کوئی لڑکی خرید کر لے آتا تھا اور اس سے شادی کر دیتا تھا، عام رواج یہ تھا کہ لڑکے کا باپ لڑکی کے باپ کے پاس جاتا اور اس کی قیمت طے کرتا تھا اور قیمت طے ہو جاتی تو باضابطہ ایک معاہدے کے ذریعے نکاح نامہ تحریر کر دیا جاتا لڑکی باپ کی جائیداد پر جہیز کے علاوہ کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔ وہ قانونی اور مذہبی طور پر ترکہ اور میراث سے محروم تھی، مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل تھا۔ وہ کسی عذر اور کسی بنا پر بیوی کو علیحدہ کر سکتا تھا۔ اسے بیوی کو بھی فروخت کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔ عورت کسی حالت میں بھی اپنی خوشی سے شوہر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر غلطی سے وہ شوہر سے کہہ دیتی کہ "تم میرے شوہر نہیں ہو۔" تو اسے بڑا جرم سمجھا جاتا تھا، اور اسے اس جرم میں دریا میں ڈبو دیا جاتا۔

بابل میں کثرت ازدواج کا بھی رواج تھا بیویوں اور لونڈیوں کی تعداد مرد کی مالی حالت پر منحصر تھی، بابلی شہروں میں غلاموں اور عورتوں کی خرید و فروخت کے لئے بازار لگتے تھے ان بازاروں میں باپ اپنی بیٹیوں کو فروخت کے لئے لے جاتے تھے اور زیادہ داموں پر فروخت کرنے کی کوشش کرتے اس طرح خرید و فروخت مذہبی اور قانونی طور پر جائز تھی۔

ایران کی معاشرتی زندگی

ایران کی سوسائٹی چار حصوں میں منقسم تھی۔[1]

۱۔ آذرواں	مذہبی طبقہ
۲۔ ارتشیاراں	فوجی طبقہ
۳۔ دبیراں	عمال طبقہ
۴۔ استریوشاں وہتخشان	عوام پیشہ ور لوگ اور کاشت کار

ایران کا قانون اس طبقاتی تقسیم کو قائم رکھنے کی نظر سے وضع کیا گیا تھا عوام کو حکومت

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں از پروفیسر آرتھر کرسٹن، ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال ص ۱۲۶

کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ نیچی ذات کا کوئی شخص نہ سرکاری دفاتر میں ملازم ہو سکتا تھا[1] اور نہ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی جائیداد خرید سکتا تھا۔[2]

عورت کی حیثیت :- مانی نے رہبانیت پر زور دیا۔ یہ عورت کے حقوق سے دست برداری کی تعلیم تھی۔ مزدک نے عورت کو آگ پانی اور چارے کی طرح مردوں کی مشترکہ جائیداد قرار دیا دختر اور ہمشیرہ تک سے نکاح جائز اور بعض مواقع پر تو باعث ثواب تھا۔ ایران میں دو طرح کی بیویاں ہوتی تھیں :- زن پادشائی ہا (۲) زن چیگاری ہا[3] پہلی قسم کی بیویوں اور ان اولاد کو جائیداد میں حصہ ملتا تھا۔ زن چیگاری ہا اور اس کی اولاد جائیداد سے محروم رہتی تھی۔[4] قانون کی نظر میں عورتوں کا کوئی حق یا مرتبہ نہیں تھا[5] بیویاں اس میں بدل جا سکتی تھیں، قانون نے غلام اور بیوی کو ایک درجہ پر رکھا تھا۔[6]

غلام کی حالت اہل ایران غلاموں کی کثرت کو وجہ وجاہت اور امارت خیال کرتے تھے، غلاموں کی حالت زار کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کو آرام و راحت نصیب نہیں ہوتا تھا دوبارہ غلطی کرنے اور عادت کی اصلاح نہ کرنے پر اس کی زندگی کو ختم کر دیا جاتا چنانچہ ہیروڈوٹ کہتا ہے۔ کہ کسی ایرانی کو یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے غلام کو کسی ایک گناہ پر ایسی سزا دے جو شدت اور درشتگی کی حد کو پہنچ چکی ہو، لیکن جب غلام کسی گناہ کا دوبارہ ارتکاب کرے، تو اس کے آقا کو حق حاصل ہے۔ کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ یا اس کو ہر قسم کا عذاب دے جو تصور میں سما سکتا ہے۔[7]

ہندوستان کی معاشرتی حالت

ہندوستان کا سماجی نظام بھی طبقاتی تقسیم کی بیڑیوں میں بری طرح جکڑا ہوا تھا، جس کی تقسیم علی الترتیب مندرجہ ذیل چار ذاتوں پر تھی!

۱:- برہمن

۲:- چھتری

۳:- ویش

۴:- شودر

ان چار ذاتوں کے علاوہ عوام کا شمار تھا جن کو انتیجا **Antyaja**، ہدی **Hadi**،

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۴ [2] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۰ [3] ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۲۶ [4] ، [5] ، [6] ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۴۴، ۳۴۷ [7] اسلام کا نظام حیات مصنفہ عبدالوہاب ظہوری ص ۲۰۳

ڈومر Doma چنڈالہ Chandala بدھاتو Badhatu وغیرہ نام دیئے گئے تھے۔ ان کو اونچی ذات کے لوگوں سے دور شہر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔

ہر طبقہ کے ذمے الگ الگ کام تفویض تھے جن کو وہ سرانجام دیتے تھے، برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا، چھتری کا یہ کام تھا۔ کہ خلقت کی حفاظت کرے۔ دان دے چڑھاوے چڑھائے وید پڑھے اور شہوات نفسیانی میں نہ پڑے۔ ویش کا کام کھیتی باڑی کرنا سود لینا چارپایہ کی پرورش کرنا تھا۔ شودر کا کام برہمنوں کی خدمت کرنا تھا۔ ہندوستان میں طبقاتی تقسیم کے لحاظ سے شودر جانوروں سے بھی پست درجہ رکھتا تھا۔

عورت کی حیثیت

عورت مال سے محروم تھی اور لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں بن سکتی تھی۔ بیوہ کو بیع و فروخت کا کوئی اختیار نہ تھا۔ عورت رکھے جوئے میں داؤ پر لگانے کا رواج تھا۔ شوہر کی موت کے بعد بیوہ کو عقد ثانی کی اجازت نہ تھی اس لئے خاوند کے مرنے کے بعد بعض عورتیں آگ میں زندہ جل جانا پسند کرتی تھیں، عورت فروخت کی جاتی تھی اسے وید پڑھنے کی اجازت نہ تھی، نہ مذہبی رسوم میں شریک ہو سکتی تھی، راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد عملاً نامقرر نہ تھی ہندوستان میں شاکت مت جیسے فرقے پیدا ہو گئے تھے، جن میں ماں بہن تک کی حرمت باقی نہ رہی۔

مصر کی معاشرتی زندگی

معاشرہ تین طبقات میں منقسم تھا۔ ا شاہی افراد ۲۔ پروہت ۳۔ عوام۔ بادشاہ اور شاہی افراد معاشرہ میں بااثر اور مصر کی معاشرتی زندگی کا مرکز اور محور ہوتے تھے وہی تمام طاقت اور اختیارات کا منابع اور مصادر ہوتے تھے دستوری طور پر بادشاہ کے اختیارات پر کوئی پابندی اور حدبندی عائد نہیں کی جا سکتی تھی دوسرا طبقہ مذہبی پروہت ملک کے اندر بڑے بااثر ہوتے تھے اس کا حکم بادشاہ کے محل میں زلزلہ ڈال سکتا تھا۔ اس کے حکم پر خون کی ندیاں بہہ سکتی تھیں اور بادشاہ شاہی اقتدار سے محروم ہو سکتے تھے۔ بادشاہ پروہتوں کے اعتبار سے ہی اپنے اقتدار کا سکہ چلا سکتا تھا۔ پروہتوں کی رہائش کے لئے بڑے بڑے عالی شان محلات مندروں سے ملحق ہوتے تھے، ان اسباب کی وجہ سے وہ معاشرہ کے مرکز بن گئے تھے۔ اپنے وسیع اختیارات کی وجہ سے انہوں نے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کر لی تھیں۔

لہ تفصیل کے لئے البیرونی کی کتاب الہند کا مطالعہ کیجئے۔

عورت اور غلام کی حیثیت

مصر میں قحبہ گری تھی مصری فراعنہ کے حرم میں بے انتہا عورتیں ہوتی تھیں، اکثر وہ اپنی سگی بہنوں سے شادی کرتے تھے۔ کبھی کبھی بیٹیوں سے بھی محرمات کے اندر صرف سگی ماں داخل ہوتی تھی بادشاہوں کے حرم میں ان شرفا کی بیٹیاں اور وہ عورتیں بھی شامل تھیں، جو تحفتہً بادشاہ کے آگے بھیجی جاتی تھیں مصر میں عورت کا مقام بہت ہی پست اور گھٹیا تھا۔

مصر میں غلامی کا عام رواج تھا۔ غلام بادشاہوں کے محلوں، کاہنوں اور سپہ سالاروں کے گھروں میں موجود رہتے جنگ میں جو قیدی بنائے جاتے وہ حکومت کے غلام متصور ہوتے سب کی ضرورتوں کے مطابق کام انجام دیتے یا ملک کی آرائش اور اس کے حسن کی تشکیل کے متقاضی فرائض کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قومی مصلحتوں اور عام حاجتوں کو بھی پورا کرتے تھے۔

آقاؤں کا غلاموں پر ہر طرح کا تسلط و تغلب تھا۔ زندہ رکھیں یا قتل کر دیں۔

یونان کی معاشرتی زندگی

یونان قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ ان ملکوں میں عورتوں کو کچھ ضرور حقوق حاصل تھے لیکن پھر بھی وہ نہایت ہی گھٹیا اور کم درجہ کی مخلوق تصور کی جاتی تھی مشہور غیر مسلم مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان تمدن عرب میں بیان کرتا ہے۔

"یونانی عموماً عورتوں کو کم درجہ کی مخلوق سمجھتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ اگر کسی عورت کا بچہ خلاف فطرت پیدا ہوتا تو اس کو مار ڈالتے تھے۔"[1]

لیکی عورت کی اس ذلت اور پستی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"بہ حیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا اس کی زندگی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی لڑکپن میں اپنے والدین کی جوانی میں اپنے شوہر اور بیوگی میں اپنے فرزندوں کی وراثت میں اس کے مقابلہ میں اس کے مرد، اعزہ کا حق ہمیشہ فائق سمجھا جاتا تھا، طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا تاہم وہ عملاً اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کہ عدالت میں اس کا اظہار دینا یونانی ناموس حیا کے منافی تھا، البتہ وہ اپنے ساتھ جہیز ضرور لاتی تھی اور لڑکیوں کو بھی شادی کے وقت جہیز دینا اس کے فرائض میں داخل تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ اثینیا کا قانون یتیم لڑکیوں پر خاص طور سے مہربان تھا لیکن بس ان دو باتوں کے سوا کوئی شے حقوق نسوان کی تائید میں پیش نہیں کی جاسکتی افلاطون نے بلاشبہ مرد اور عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔"[2]

---

[1] تمدن عرب ص ۲۷۲ [2] تاریخ اخلاق یورپ ج ۲ ص ۱۸۲

غلام کی حیثیت

یونان میں غلامی کا عام رواج تھا، یونان کے بڑے بڑے فلاسفہ بھی غلامی کے بارے میں رائے عامہ کے ہم خیال تھے ارسطو اکثر کہا کرتا تھا کہ "غلام ایک آلہ ہے۔ مگر ذی روح اور ایک کھلونا ہے مگر جاندار" یونان میں دو طبقے تھے۔ احرار اور غلام پھر غلام دو قسم کے تھے ایک وہ جن پر زبردستی استیلا حاصل کر لیا گیا ہو۔ دوسری قسم ان غلاموں کی تھی جن کو بازار سے خرید کیا گیا ہو۔ پہلی قسم کے غلام محض نام کے غلام تھے اور ان کو زمینوں کے تابع سمجھا جاتا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ان کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

دوسری قسم کے غلام اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ آقا معمولی معمولی خطاؤں پر غلاموں کو سنگین سزائیں دیتے تھے۔

چین میں معاشرتی زندگی

چین میں معاشرتی زندگی کی بنیاد چار طبقات پر تھی ۱۔ حاکم ۲۔ امرا ۳۔ عوام اور ۴۔ غلام۔ اہل چین بھی اپنے مذہبی اور ملکی دستور کے مطابق غلام پر ہر قسم کا تسلط اور استیلا رکھتے تھے لیکن چینیوں کے اخلاق و عادات دوسری اقوام کی بہ نسبت اچھے تھے اس لئے وہ غلاموں کے ساتھ دیگر اقوام کی طرح زیادہ وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک روا نہیں رکھتے تھے پہلی صدی عیسوی میں ان کے ہاں ایسے قوانین بنائے گئے تھے جن کی رو سے ہر شخص کو اپنے غلام کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔

ہندو مذہب میں معاشرتی تعلیم

طبقاتی تفریق

ہندوؤں میں انسانیت سوز ذات پات کا امتیاز ہے۔ اس انسانیت سوز تعلیم کا سرچشمہ ان کی مذہبی کتابیں ہیں، وید کی رو سے ہندو معاشرہ چار طبقات میں منقسم ہے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔

وید میں لکھا ہے، برہمن پرماتما کے منہ سے، کھشتری بازوؤں سے، ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔ (رگ وید، یجر وید، اتھر وید)

وید کے لئے برہمن، حکومت کے لئے چھتری، کاروبار کے لئے ویش اور دکھ اٹھانے کے لئے شودر پیدا کیا ہے (یجر وید ۳۰۔ ۵)

منو شاستر ہندوؤں کی قانون کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مختلف ذاتوں کے حقوق و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور پڑھنا اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کو چڑھاوے چڑھانا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا ہے۔ باب اول

"چھتری کو اس نے حکم دیا ہے کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں "نہ پڑے"۔ (باب اول ۸۹)

"ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے۔ دان دے چڑھاوے تجارت یعنی لین دین اور زراعت کرے"۔ (باب اول ۹۰)

"شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے کہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے باب اول ۹۱" ہندوؤں کی مذہبی کتب میں شودروں کے متعلق حسب ذیل تعزیتی دفعات ہیں:

۱۔ برہمن شودر کو اپنی خدمت پر مجبور کر سکتا ہے۔ خواہ اس نے اس کو خرید کیا ہو یا نہ کیا ہو

۲ شودر کا آقا اگر اس کو آزاد کر دے تب بھی اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ جو خدمت چاہے لے کیونکہ شودر کی گردن پر غلامی کا جوا مستقل اور دائمی ہے۔

۳۔ اگر کسی برہمن کو کسی شودر کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کی سزا بجز قتل کے اور کوئی نہیں،

۴۔ کسی شودر کی زبان سے کسی برہمن کے لئے گالی نکل جائے، تو سزا کے طور پر اس کی زبان گدی سے باہر کھینچ لی جائے۔

۵۔ کوئی شودر کسی برہمن یا اس کے خاندان سے حقارت آمیز لہجہ میں کلام کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ ایک خنجر جس کا طول دس انگل ہو سخت گرم کر کے بعد اس کے منہ میں رکھا جائے

۶۔ شودر کی زبان سے کوئی کلمہ نصیحت نکل جائے تو اس کے منہ اور کان میں کھولتا ہوا تیل ڈالا جائے

۷۔ برہمن اگر کسی شودر کی چوری کرے تو اس کی سزا صرف یہ ہے شودر کو مال کا تاوان دلایا جائے اگر شودر کسی برہمن کی چوری کرتا ہے، تو شودر کو دہکتی ہوئی آگ میں جلا دیا جائے

۸۔ شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے اگر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو کمر پر داغ لگا کر، چوتڑ کٹوا کر ملک سے باہر نکال دیا جائے (باب ہشتم ۲۸۱)

۹۔ شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیئے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے (منو باب ہشتم ۱۲۷)

ہندوؤں کی تمام مذہبی قوانین کی کتب میں غلامی کا ذکر موجود ہے منو کی کتاب میں غلام بنانے کے آٹھ اسباب ہیں۔

۱۔ لڑائی میں فتح ہوا ۲۔ خوراک پر غلامی منظور کرنے والا ۳۔ کسی جرم کے عوض غلامی قبول کرنے والا ۴۔ کسی باندی کے بطن سے پیدا ہونا ۵۔ خرید کیا ہوا ۶ بطور ہبہ یا تحفہ

حاصل کرنا، ۷۔ اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملا ہوا ۸۔ بھگت
نارد نے غلاموں کی پندرہ قسمیں بیان کی ہیں جن میں سے آٹھ تو یہی ہیں اور سات ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں قمار بازی میں ہار کر کسی کا غلام بن جانا اور قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے کسی کا غلام بن جانا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں
اولاد کی حیثیت قدیم ہندو قانون کے مطابق والدین کو اس بات کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کر دیں۔ یا بطور بخشش کسی غلامی میں دے دیں۔[۱]

عورتوں کے متعلق تعلیم

عورت معاشرہ کا ایک اہم ترین رکن ہے لیکن ویدک دھرم نے ان کو قعرِ مذلت میں گرا کر ان کے ہر قسم کے معاشرتی حقوق کو چھین لیا ہے۔
رگوید منڈل ۱۰۔ اشوکت ۹۵ منتر ۱۵ میں لکھا ہے۔
"عورتوں کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی، عورتوں کے دل فی الحقیقت بھیڑیوں کی بھٹ ہیں"۔ دوسری جگہ آتا ہے۔
"اندر (آریوں کے ایشور) نے خود یہ کہا ہے کہ عورت کا دل استقلال سے خالی ہے اور وہ عقل کی رو سے ایک نہایت ہلکی چیز ہے"۔ (رگوید منڈل ۸ شوکت ۳۳ منتر ۱۷)
ان دو منتروں سے چار امور مستنبط ہوتے ہیں۔
۱۔ کسی عورت سے مستقل محبت نہیں کی جا سکتی
۲۔ عورت دھوکے باز ہے۔
۳۔ ہر عورت کی عصمت مشتبہ ہے۔
۴۔ عورت کم عقل ہے۔
مندرجہ بالا چار وجوہ کی بنا پر برہمن گرنتھوں اور دھرم شاستر کاروں نے حسب ذیل قوانین مرتب کئے ہیں،
۱۔ عورت اور شودر دونوں کو نردھن (مال سے محروم) کہا گیا ہے (یجروید ادھیا ۸ منتر ۵، منو ادھیا ۸ شلوک ۴۱۶، ادھیا ۹ شلوک ۱۹۹)

---

[۱] دائرۃ المعارف فرید وجدی اور مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا

۲۔لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں (اتھروید کانڈ اشوکت ۷، امنترا) یجر وید ۸: ۵
نرکت ۳،۴-منو ۹: ۱۹۹)
۳۔کسی عورت کو خاوند سے حکومت نہیں مل سکتی (اتھروید کانڈ اشوکت ۷، امنترا)
۴۔اگر کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی طرف سے جائیداد ملتی ہے. تو اسے جائیداد کی بیع و فروخت کا کوئی اختیار نہیں (اتھروید کانڈ اسوکت ۷، امنتر)
۵۔اولاد ذکر کے نہ ہوتے ہوئے بھی بیٹی وارث نہیں بلکہ متبنی جو غیر کا بیٹا ہوتا ہے وارث ہوتا ہے (منو ادھیائے ۹)
۶۔نکاح ثانی کی ممانعت ہے، کیونکہ ایک جائیداد بلا وجہ دوسرے کے قبضہ میں نہیں جاسکتی (منو ۱۵: ۱۵۱)
۷۔خلع کی ممانعت یعنی خاوند خواہ کیسا ہی بے رحم اور ظالم ہو، دائم المریض ہو مگر عورت کو اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں (منو ۵: ۱۵۱)
۸۔عورت کا وجود صرف اس لئے ہے، کہ بچے دیں، ان کی پرورش کریں اور ہر روز خانہ داری کے کام میں مصروف رہیں (منو نواں باب ۲۷)
۹۔کسی لڑکی یا نوجوان عورت یا بڈھی عورت کو کبھی اپنے گھر میں بھی کوئی کام اپنے اختیار سے نہیں کرنا چاہئے، طفولیت میں عورت کو باپ کے تابع رہنا چاہئے اور جوانی میں شوہر یا بیٹوں کا اگر وہ انہیں چھوڑ کر چلی جائے تو اپنے اور اپنے شوہر دونوں کے خاندان پر بدنامی کا دھبہ ڈالے گی (منو شاستر پانچواں باب ۱۴۸، ۱۴۹)
۱۰۔عورت کو جوئے میں ہارنے اور فروخت کرنے کا جواز (نرکت ۳: ۴)
۱۱۔جن لڑکیوں کے بھائی نہ ہوں ان کی شادی نہیں ہوسکتی (اتھروید ۱: ۱۷: ۱)

ہندو وکیل کی رائے

"جس طرح درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے. اسی طرح قوموں کے تمدن اور تہذیب پر ان کے رسم و رواج کا اثر ہے ہندو دھرم میں مردوں کے حقوق نہایت احتیاط کے ساتھ تمام معاملات میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں، مگر یہ ایک افسوس ناک امر ہے کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کی گئی نہایت رنجدہ بات ہے کہ قدیم ہندو دھرم کی بنا پر عورت کو جائیداد سمجھا گیا ہے. یا ایک ایسی ہستی جو مرد سے عقل اور اخلاق کی بنا پر نہایت کم تر درجہ پر ہے اس لئے ہندو شاستروں کا زور عورت کے فرائض پر ہے حقوق پر نہیں اس لئے یہ نتیجہ نکالا

جاسکتا ہے۔ کہ ہندو سوسائٹی کے بنانے میں عورت کا کوئی حصہ نہیں عورت کی پیدائش سے لے کر وفات تک تمام افعال زندگی مشکلات اور مصائب بلکہ زندگی کے معمولی مقتضیات کھانے پینے، جاگنے، سونے، غسل کرنے، باہر کے معمولی کاروبار میں مرد کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اسے عورت کے لئے نمبر ۲ خدا بنا دیا گیا ہے" (بھگت رام سیکرٹری انجمن ہمدرد حیوانات فیروز جھاؤنی۔)

ویدک دھرم میں عورت کی رُوحانی حیثیت

۱۔ عورتوں کے لئے مذہبی تعلیم کی ممانعت ہے (منو ۹ : ۱۸)۔

۲۔ مرد اور عورت دونوں کے لئے نجات کے الگ الگ راستے ہیں مرد اپنے زور بازو سے مکتی مارگ (طریقہ نجات) پکڑ سکتا ہے مگر عورت کی نجات خاوند پر مر مٹنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ وہ براہ راست خدا سے نجات حاصل نہیں کر سکتی (منو ۲: ۶۶۔ ۹: ۱۸ اور ۵:۱۵۵)

۳۔ گیتا میں بنیا عورت اور شودر کو پاپ یونی (گناہ کے قالب) قرار دیا گیا ہے (گیتا ادھیائے ۹ شلوک ۳۲)

۴۔ عورت کی عصمت و پاکیزگی کے خلاف منو ادھیائے اور ستیتھ، برہمن، رگوید یجروید، اتھر وید کا مطالعہ ضروری ہے۔

قانونی تفاوت

منو کے قانون میں جرائم کی سزائیں عدل و انصاف پر مبنی نہیں طبقاتی تقسیم کے اصول کو، ذہن میں رکھ کر سزاؤں کو نافذ کیا جاتا تھا، منو لکھتا ہے۔

" ایسے جرائم کے لئے جن کا ذکر باب ہشتم، ۲۳ میں ہے برہمن کو درمیانی سزا دی جائے گی یا وہ ملک بدر کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کا روپیہ اور مال اس سے نہ لیا جائے گا لیکن دوسری ذاتوں کے اشخاص کی جو عمداً" ان جرائم کے مرتکب ہوں کل جائیداد ضبط ہونی چاہئے اور اگر عمداً نہ مرتکب ہوں تو وہ ملک بدر کر دیئے جائیں (منو باب نہم ۲۴۱، ۲۴۲)

غلامی۔ منو کی کتاب میں غلام بنانے کے سات اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ جنگ میں گرفتار ہونا

۲۔ نان و نفقہ کے لئے برضا و رغبت اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دے دینا۔

۳. کسی باندی کے بطن سے پیدا ہونا
۴. خریدنا۔
۵. بطور ہبہ یا تحفہ کے حاصل کرنا
۶. اپنے بزرگوں سے ورثہ پانا
۷. کسی جرم کے عوض غلامی قبول کرنا۔

ناروئے غلاموں کی پندرہ قسمیں بیان کی ہیں جن میں سات تو یہی ہیں اور آٹھ ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں جوا میں ہار کر کسی کا غلام بن جانا اور قرض ادا نہ کر سکنے پر کسی کا غلام ہو جانا۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہودیت کا معاشرتی نظام

یہودیت اور عورت:۔ بائبل کی عربی زبان میں شوہر کو بعل (مالک خداوند) اور بیوی کو بعولہ یعنی جائیداد منقولہ کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے یہودی قسم کی شادی کو بعل (میرج Baal Marriage جس میں عورت کے حقوق سلب ہو جاتے ہیں) کہا گیا ہے

بائبل آدم اور حوا کے واقعہ میں حوا کو مجرم قرار دیتی ہے۔ اور اس جرم کی پاداش میں عورت کو مرد کا بالکل محکوم بنا دیا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے۔

"اور خداوند نے کہا، تیرے درد حمل کو بڑھاؤں گا۔ تو درد زہ کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی۔ اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔[۱]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے۔

"یہودی قانون میں مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی ہے۔ نیز عورت کو خاوند کے مرجانے کے بعد دوسری شادی کا حق نہیں رہتا"۔[۲] اگر کوئی مرد کسی عورت کو اغوا کرے تو یہودی قانون کے مطابق وہ لڑکی کے والد کو جرمانہ یا قیمت ادا کرے چنانچہ خروج ۲۲ : ۱۶ میں لکھا ہے:

"اگر کوئی ایک چھوکری کو جو اس کی منگیتر نہیں فریب دے کہ اس سے مباشرت کرے۔ وہ البتہ اس کی قیمت دے کہ اس سے نکاح کرے اگر اس کا باپ راضی نہ ہو کہ اسے اس کو دے تو وہ کنواریوں کے اجر کے موافق اسے نقدی دے"۔ اس کی وضاحت کتاب استثناء ۲۲ : ۲۸، ۲۹ میں کی گئی ہے۔

---

[۱] پیدائش باب ۳ [۲] مقالہ یہودیت

"اگر کوئی آدمی کنواری لڑکی پاوے۔ جو کسی کی منگیتر نہ ہو۔ اور اسے پکڑ کر اس سے ہم بستر ہو اور وہ پکڑے جائیں تو وہ مرد جو اس کے ساتھ ہم بستر ہوا لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی دے اور وہ اس کی جورو ہو کیونکہ اس نے اسے رسوا کیا اور اپنی زندگی بھر اسے طلاق نہ دے۔

عورت کو خاوند کے مرجانے کے بعد شادی کا حق نہیں رہتا۔ ؎

عہد نامہ قدیم میں داؤد علیہ السلام کی نوے بیویاں اور یعقوب کی کئی سو بیویاں بیان کی گئی ہیں۔

یہودیت اور غلام

اسرائیلی شریعت میں مالک کو غلام پر ہر طرح سے اختیار حاصل تھا مگر وہ اس کو جان سے نہیں مار سکتا تھا۔ صرف استثنا کی چند ایک صورتیں تھیں۔ جو خروج باب ۲۱ آیت ۲۰، ۲۱ میں مذکور ہیں۔

"اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے اور لاٹھیاں کھاتے ہوئے مرجائے تو اسے سزا دی جائے لیکن اگر وہ ایک دن یا دو دن جیوے تو اسے سزا نہ دی جائے اس لئے کہ وہ اس کا مال ہے۔"

اگر آزاد آدمی کسی دوسرے کے غلام یا لونڈی کو مار دیتا تو صرف خون بہا مالک کو دینا ہوتا تھا۔ (خروج باب ۲۱ آیت ۳۲)

جو غلام اسرائیلی قوم کے ہوتے تھے ان سے غیر اسرائیلیوں کی نسبت عمل سلوک ہوتا تھا چھ سال غلام رہنے کے بعد وہ آزاد سمجھے جاتے تھے (خروج باب ۱ آیت ۲۰)

مگر عبرانی لونڈی کے ساتھ غیر اسرائیلی غلام شادی نہ کر سکتا تھا اور مالک یا مالک کا بیٹا ہی اس پر یہ تصرف کر سکتا تھا۔ اسرائیلی غلام چھ سال کے بعد آزاد ہوتا تو مالک کو حکم ہوتا کہ اسے رخصت کرتے وقت کچھ دے۔ (استثنا باب ۱۵ آیت ۱۳، ۱۴)

عیسائیت کا معاشرتی نظام

عیسائیت میں عورت کا مقام:

مگر گزشتی ہوئی عیسائیت نے بھی عورت کو نہایت ہی پست مقام دیا ہے پولس کہتا ہے "عورت کے ذریعے ہی گناہ دنیا میں آیا ؎

ترتولیان جو عیسائیت کے دور ابتدائی کا امام تھا وہ عورت کے متعلق لکھتا ہے:

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے، جو شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی۔ خدا کے قانون کو

؎ انسائیکلوپیڈیا مقالہ یہودیت ؎ پولس کا پہلا خط قرنتیوں کے نام باب ۲

توڑنے والی اور خدا کی تصویر اور مرد کو غارت کرنے والی ہے"
مسیحی عالم کرائی سوسٹم عورت کے متعلق کہتا ہے:-
"ایک ناگزیر برائی ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ ایک غارت گر دلبربائی اور ایک آراستہ مصیبت"۔[۲]

غلام کی حیثیت

اسکندریہ کے سینٹ کائرل Cyril نے آقا اور غلام دونوں کو صانع اور مصنوع سے تشبیہہ دی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسیحی حضرات غلام کو بنظر استخفاف دیکھتے تھے۔[۳]

انجیل میں جابجا غلاموں کو اپنے آقاؤں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، پولس نے ایک خط میں جو اس نے افیسس کے نام لکھا ہے۔ غلاموں کا ذکر کیا ہے اور ان کو تاکید کی ہے کہ تم اپنے آقاؤں کی اطاعت ایسی ہی کرو جیسی حضرت عیسیٰ کی کرتے ہو۔

جو خط تیموتاوس کو لکھا ہے۔ اس میں بھی یہی تحریر کیا ہے۔ آخر میں یہ وضاحت کردی ہے۔ کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں۔ وہ حضرت مسیح کی بعینہٖ تعلیم ہے۔ اور جو شخص اس سے انکار کرتا ہے جھوٹا ہے"

حضرت عیسیٰؑ کے ایک دوسرے حواری پطرس نے بھی غلاموں کی وصیت کی ہے کہ "انہیں چاہیئے ہر وقت اپنے آقاؤں کے اطاعت گزار و فرمانبردار بنے رہیں"

پولوس نے جو خط اہل افیسس کے نام تحریر کیا تھا قدیس باسیلیوس نے اپنی کتاب القواعد الادبیہ میں اس کے بعض حصوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ کہ "یہ خط اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ غلام پر اپنے آقاؤں کی اطاعت واجب ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کی تعظیم ہے"

علامہ فرید وجدی نے لاردس کی انسائیکلو پیڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ تمام عیسائی علماء اس کا اقرار کرتے ہیں۔ کہ غلام بنانے کا رواج ان کے ہاں شروع تھا اور مذہبی احکام میں داخل تھا۔

عرب کی معاشرتی حالت

اندرونی حصوں میں عرب کے قبائل کی دو قسمیں تھیں۔ ایک حضری جو کسی مقام پر مستقل

---

[۱] بحوالہ پردہ ص ۱۰۶ ابوالاعلیٰ مودودی [۲] پردہ ص ۳۰
[۳] مذہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا مضمون غلام۔

مکانوں میں بود و باش رکھتے تھے ۔ عرب کے بڑے بڑے شہر مکہ ۔ یثرب ۔ طائف ۔ صنعا ۔ یمامہ وغیرہ ان قبائل کے مسکن تھے ۔ شہری لوگوں میں جو امراء تھے ۔ وہ اہل یونان کی طرح اپنے گھروں میں غلام رکھتے تھے ۔ منڈیوں میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی ۔ آقا کو یہ حق تھا کہ غلاموں اور لونڈیوں سے ہر قسم کی خدمت لے ہر قسم کی خدمت لینے کے باوجود ان سے بڑا سلوک روا رکھا جاتا تھا ۔ اہل عرب اپنے ہاتھ سے استعمال کی چیزوں کو تیار کرنے سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ صنعت کے میدان میں کافی پس ماندہ تھے ۔ دوسرے بدوی تھے یعنی خانہ بدوش ، ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ ہوتا تھا ۔ جہاں اپنے مویشیوں کے لئے گھاس پانی پایا وہیں خیمے نصب کر لئے جب گھاس پانی ختم ہوا تو وہاں سے اپنا اثاثہ اونٹوں وغیرہ پر لادا ، کسی اور مقام پر جا ڈیرا لگایا ۔ رومال یا عمامہ کا عام رواج تھا ۔

عرب معاشرہ میں عورت کا مقام

عرب میں عورت کی حالت نہایت پست تھی ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے ۔ ایک مرد جس قدر چاہتا شادیاں کر لیتا ، دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنے کا عرب میں رواج تھا ۔ باپ مر جاتا تو اس کی کل بیویاں سوائے حقیقی ماں کے بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں لونڈیوں سے پیشہ کروا کر روپیہ کماتے ۔

عرب میں استبضاع کی رسم تھی جس کی تشریح اہل لغت نے یہ کی ہے کہ عورت صرف خواہش اولاد کے لئے اپنے خاوند کے سوائے دوسرے سے تعلق پیدا کرے بلکہ لکھا ہے کہ مرد اپنی عورت یا لونڈی کو کہہ دیتا تھا اَرْسِلِي اِلٰى فُلَانٍ فَاسْتَبْضِعِي مِنْهُ یعنی فلاں کو کہلا بھیجو اور اس سے اولاد حاصل کرنے کے لئے تعلق پیدا کر و ۔

طلاق دینے کے بھی ظالمانہ طریقے رائج تھے ، اگر ایک مرد چاہتا تو ایک عورت کو ہزار مرتبہ بھی طلاق دے کر عدت کے اندر رجوع کر لیتا ۔

شعرا اپنے معاشقے کی داستانیں اپنے قصائد میں بیان کرتے اسی طرح جس گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو رنج ہوتا اسی وجہ سے دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی ۔ ہاشم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام قبائل میں رائج تھا ۔ ایک اس پر عمل کرتا تو دس چھوڑتے تھے یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اسلام نہیں آیا[۱] بعض ننگ و عار کی بنا پر بعض مفلسی کی بنا پر اولاد کو قتل کرتے ۔ عرب کے بعض شرفاء

---

[۱] سید الیٰ

ادھر رؤسا بچوں کی جان بچانے خرید لیتے۔ صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا۔ لہ

عورت وراثت میں حصہ دار نہیں ہوتی تھی عرب کے جاہلی معاشرہ میں ہمسائیگی کے حقوق کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ نہ غریب، بےکس، یتیم کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا معاشرہ کا سب سے نچلا اور ذلیل طبقہ غلاموں کا تھا۔ ان کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی رہتی تھی۔ ان بیچاروں پر سخت مظالم ڈھائے جاتے تھے کسی کی کوئی داد فریاد نہ ہوتی تھی۔ ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جاتے تھے۔

معاشرتی تقسیم عرب میں قبیلے کی بنیاد پر بڑی سخت عصبیت تھی، عربی معاشرہ خاندانوں کی بنیاد پر مختلف طبقات پر مشتمل تھا ایک خاندان دوسرے سے اپنے آپ کو افضل اور بہتر سمجھتا تھا۔ بعض خاندان اپنے سے کم تر خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بعض رسوم میں شرکت نہیں کرتے تھے حج کے مناسک میں قریش اور کنانہ عام حجاج سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ وہ عرفات میں عام حاجیوں کے ساتھ قیام کرنا باعث عار سمجھتے تھے۔ آنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے قرآن مجید میں اس قبائلی عصبیت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (البقرہ ۲: ۱۹۹) (پھر تم وہاں سے ہو کر چلو جہاں سے لوگ ہو کر چلتے ہیں۔

دُنیا کی سیاسی حالت کا نقشہ

معاشرے کا سب سے اہم ادارہ ریاست ہے کیونکہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا تحفظ اور بقا امن و سلامتی نظم و ضبط کا انحصار ریاست پر ہے۔ ہمارے اس دور کے تمام ماہرین عمرانیات نے ریاست کو معاشرہ کے بنیادی اداروں میں کلیدی حیثیت دی۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے۔ کہ اسلام سے قبل دنیا کی سیاسی حالت پر بھی تبصرہ کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے۔ کہ اسلام نے معاشرہ کے اس اہم ادارہ میں کیا اہم انقلابی اصلاحات کی ہیں۔

مصر حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے، سام، حام، یافث، سام سے سامی نسل چلی یعنی عرب یہودی وغیرہ یافث ترکوں اور دوسری عجمی اقوام کا جد امجد ہے حام کی اولاد براعظم افریقہ میں پھیلی، حام کے دوسرے فرزند کا نام "مصر" تھا جسے عبرانی میں

لہ کتاب الاغانی

"تمراِمُ" کہتے تھے۔ معلوم ہوتا کہ مصر یا مصراِمُ نے اپنی اولاد کے لئے وہی خطہ منتخب کیا جسے ہم مصر کہتے ہیں۔

بحر روم سے متصل اور جانب جنوب "مصر" واقع ہے جب سے انسان نے معاشرتی اور اجتماعی زندگی کا آغاز کیا تب سے انہیں نظامِ حیات چلانے کے لئے حکومت کا انتظام کرنا پڑا اور بادشاہوں کی بنیاد پڑی، مصر میں کئی کئی چھوٹی شہری حکومتیں قائم ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں اور طاقتور حکومت کمزور کو اپنے اندر ضم کر لیتی، یہاں تک کہ مصر میں دو حکومتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک بالائی مصر اور دوسری وسط مصر، بالآخر وسط مصر کی حکومت کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا۔ اور دوسری شہری حکومتیں وسط مصر کی حکومت کی باجگذار بنتی گئیں جس سے نظام جاگیرداری کا آغاز ہوا بالائی اور وسط مصر کے بعد وہ رقبہ آباد ہوا جہاں نیل کی سات شاخیں ہو جانے سے جو مثلث بنتے ہیں جو زیریں مصر کہلاتا ہے۔ مصر میں ابتدا سے لے کر سکندر یونانی کے زمانے تک یکے بعد دیگرے اکتیس خاندانوں نے حکومت کی۔

نظامِ حکومت اور شاہی اختیارات

مصری حکومت شخصی اور مطلق العنان تھی تمام اختیارات کا منبع اور مصدر بادشاہ کی ذات ہوتی تھی، وہ اپنا جانشین نامزد کرتا تھا، اور اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنی زندگی میں ہی شریک کر لیتا تھا عموماً بڑا بیٹا ہی اس کا جانشین ہوتا تھا۔ بادشاہ خود سپہ سالار عدالت کا قاضی اور انتظامیہ کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا اس کا حکم قانون تھا دستوری طور پر اس کے اختیارات کی کوئی حدبندی نہیں کی جاسکتی تھی، مصری بادشاہ کا لقب "فرعون" فرو تھا جس کے معنی ہیں۔ بڑے عالی شان محل میں رہنے والا یہ لقب Pharoah or Phero.
خود ہی بادشاہ کی اعلیٰ حیثیت اور عوام پر اس کی اعلیٰ حیثیت اور عوام پر اس کی برتری اور فضیلت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور حقیقتاً وہ سب سے بڑے محل میں رہا کرتا تھا، شان و شوکت تزک و احتشام، حشم و خدم اور سطوت و جلال کے اعتبار سے کوئی اس کا مدِّ مقابل نہ تھا۔

بادشاہ کے سامان آرائش و زیبائش کی دیکھ بھال کے لئے بیسیوں حکام مقرر تھے۔ غلاموں کا ایک جم غفیر ہر وقت دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔ دربار کے وقت بلا امتیاز ہر آنے والا بادشاہ کو سجدہ کرتا تھا۔

وادئ دجلہ وفرات کی تہذیب

مشرق کی دوسری قدیم تہذیب وادئ دجلہ وفرات کی ہے جو تاریخ میں سمیری تہذیب کے نام سے موسوم ہے۔ سمیری تہذیب دجلہ وفرات کی وادی میں پھلی پھولی وادی دجلہ وفرات میں ان کی آمد کا زمانہ تو صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا، مگر ۵۰۰۰ ق۔م سے ان کے شہر کے نشانات و آثار ملتے ہیں۔ یہ لوگ کہاں سے آئے اور کس نسل سے تعلق رکھتے تھے؟ یہ بھی معلوم نہیں۔ ان کی تحریروں سے پہاڑوں کا تذکرہ ملتا ہے اور ان کی زبان قدر منگول زبان سے ملتی جلتی ہے اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ منگول نسل سے تعلق رکھتے تھے، اور کوہ قاف وسطی ایشیا یا آرمینیا کے پہاڑی علاقوں سے ترک وطن کر کے وادی دجلہ وفرات میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے چند شہر آباد کئے، جن میں کش، نفر، اردخ، اُر، لغاش، اُمّا اور لرسا نے زیادہ شہرت حاصل کی ابتدا میں ان میں بادشاہت کا رواج نہ تھا۔ اور نہ وہ سیاسی زندگی سے واقف تھے۔ ان کے قبیلے کے ممتاز لوگ جو زیادہ تر کاہن اور پجاری ہوتے تھے، شہر کی دیکھ بھال اور انتظام و انصرام کرتے تھے جنگ کی ضرورت سے ملک کے فوجی سپہ سالاروں کا ایک مضبوط طبقہ پیدا ہو گیا۔ اس لئے کاہنوں اور پروہتوں کے اقتدار میں کمی آتی چلی گئی اور طاقت سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں منتقل ہوتی چلی گئی آخر کار انہوں نے شہری ریاستوں کی بنیاد رکھ دی، ان شہری ریاستوں میں جو سمیری سپہ سالاروں نے قائم کی تھیں، پہلا نام کش کا آتا ہے۔ جس کے پہلے حکمران کا نام مسیلم تھا جس کی اطاعت غالباً جنوب کے حکمرانوں نے قبول کر لی۔

اس عہد میں کش کے بعد لغاش کی ریاست نے زیادہ شہرت حاصل کی جس کے نامور حکمرانوں میں لوغل شاغنغر Lugal—Sha—Gengur سب سے پہلے آتا ہے اس کے بعد ارنینا Ur-Nina کا نام ملتا ہے جس کا زمانہ ۳۱۰۰ ق م کے قریب قریب ہے۔ ارنینا کے بعد ایک حکمران اردخ آغن Urukagian کا نام ملتا ہے جس کا زمانہ ۲۸۰۰ ق م کے قریب متعین کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مصلح اور شریف النفس حکمران تھا۔ اس نے ملک میں اہم اصلاحات نافذ کیں، ان اصلاحات کی زد پروہتوں، کاہنوں، زمینی امراء اور دولت مندوں پر پڑتی تھی۔ انہوں نے ملک میں فساد برپا کر دیا اور ملک داخلی انتشار کا شکار ہو گیا اُمّا کے حاکم لوغل زغیسی Lugal Zaggis نے داخلی انتشار سے فائدہ اٹھا کر لغاش پر حملہ کر کے بارونق شہر کو پیوند خاک کر دیا لغاش کی فتح کے بعد دوسرے علاقوں اور

شہروں کی طرف توجہ کی اور خلیج فارس سے لے کر بحیرہ روم تک تمام علاقے کو روند ڈالا، لوغل زغیسی کے عہد تک سمیریوں کی شہری ریاستیں ایک بڑی سلطنت بن چکی تھیں۔

طرز حکومت اور شاہی اختیارات

سمیری حکمران مطلق العنان اور تمام اختیارات کا سرچشمہ ہوتے تھے، ان کے اختیارات تمام قیود سے آزاد اور ان کی ذات تمام عیوب سے منزا سمجھی جاتی تھی، وہ خدا کے نائب ہی نہیں اس کے شریک تصور کئے جاتے ان کا حکم قانون اور ان کا آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ سمیری بادشاہوں کے دربار بڑے پر تکلف اور زیبائش و آرائش کا مرقع ہوتے تھے، وہ شاہانہ زرق برق لباس میں ملبوس ہو کر شاہی دستے کے ساتھ دربار میں آتے اور پھر تخت پر متمکن ہوتے تھے، بعد ازاں عام لوگوں کو دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دی جاتی تھی۔

دنیا کے قدیم شہروں میں شہر بابل **Babylon** ایک اہم تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ حضرت مسیح سے تقریباً تین ہزار سال قبل یہ شہر دریائے فرات کے بائیں جانب آباد ہوا۔ یہ بتانا دشوار ہے۔ کہ اس کے سب سے قدیم باشندے اور آباد کرنے والے کون لوگ تھے۔ اور کہاں سے آئے تھے۔

لفظ بابل دو الفاظ باب اور ایل سے مرکب ہے باب کے معنی دروازے کے ہیں اور ایل کے معنی الہٰ ہے۔ یعنی خدا کا دروازہ، چونکہ یہ دونوں الفاظ سامی یا قدیم عبرانی ہیں اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کو آباد کرنے والے لوگ سامی النسل تھے

شاہی اختیارات اور نظام حکمرانی۔

بابلی حکومت شخصی اور مطلق العنان تھی۔ بادشاہ تمام قوانین سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ دستوری طور پر اس کے اختیارات کی حد بندی نہیں کی جا سکتی تھی، ریاست کے اندر اس کی ذات سب سے بلند اور مقتدر تھی، وہ عدالت کا حاکم اعلیٰ، فوج کا قائد اور مذہبی پیشوا تھا۔ اس کی سکونت کے لیے پایہ تخت میں بڑے بڑے قلعے تھے، جہاں وہ شان و شوکت کے ساتھ رہتا تھا، لوگ دربار میں آکر سے سجدہ کرتے تھے، جب دربار کرتا تو حکام اور شاہزادے اس کے ارد گرد نہایت ادب کے ساتھ بیٹھتے اس کا ولی بالعموم بادشاہ کا بڑا لڑکا تھا، بعض حالتوں میں دوسرے بیٹے یا بیٹے کی غیر موجودگی میں اپنے داماد یا کسی دوسرے عزیز کو ولی بنا دیتا، ملکی انتظام کے لئے ریاست صوبوں اور اضلاع میں منقسم

تھی جس کے اعلیٰ حکام کو خود بادشاہ مقرر کرتا تھا۔ اعلیٰ حکام مقامی سرداروں اور جاگیرداروں اور زمینداروں کے تعاون سے اپنے علاقے کا انتظام کرتے تھے ہر صوبے میں فوج کا ایک دستہ بھی ہوتا تھا جس کا خرچ صوبے کے افراج سے پورا کیا جاتا تھا۔ بعض علاقوں میں جاگیردار اور بڑے زمیندار ہی نظم ونسق کا کام سرانجام دیتے تھے۔ صوبائی حاکم جملہ شاہی مطالبات اور محصولات وصول کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیتے تھے۔

آشوری سلطنت

وادیٔ دجلہ وفرات کی دوسری اہم تہذیب کا نام آشوری تہذیب ہے اس تہذیب کو بھی جنم دینے والا ایک سامی قبیلہ جو اموریوں کی طرح جزیرہ عرب سے ہی اٹھا تھا۔ ایک بت کی پرستش کرتا تھا جو آشور Ashur کے نام سے مشہور تھا اس بت کی طرف منسوب ہو کر وہ قبیلہ آشور اور اس کی ریاست آشوریہ کے نام سے مشہور ہوئی، آشوریوں نے اس دیوتا کے نام پر ایک شہر بھی بابل سے شمال کی طرف تقریباً تین سو میل کے فاصلہ پر دریائے دجلہ کے کنارے آباد کیا تھا۔ آشوری حکومت کے دورِ اوّل میں وہی ریاست کا پایہ تخت رہا۔ ۱۱۰۰ ق م۔ کے قریب اس ریاست نے بہت ترقی کی، آشور ناصر (نیذر) پال Ashur—Nasir Pal نے ۸۸۴ ق م سے ۸۶۰ ق م میں حکومت کی توسیع کی ۲۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۸۵۹ ق م میں مرا۔ آشور ناصر پال کی وفات کے بعد اس کا جانشین شلما ناصر دوم Shalm Naser II ۸۵۴ سے ۸۲۴ ق م میں حکمران رہا۔ اس زمانے میں حضرت یونس علیہ السلام تبلیغ مذہب کے لئے نینوا آئے تھے جہاں وہ قید کر لئے گئے تھے۔ اس کے ایک صدی بعد تغلط پلاسر سوم Tiglath Pilaser III نے ۷۴۵-۷۲۷ ق م میں حکومت کی اور اس کے عہد میں سلطنت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس نے شہر بابل زیر کیا، اس وقت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے مالک کا جس قدر رقبہ تھا۔ اس میں بیالیس فی صد تنہا بابل کی حکومت کے قبضہ میں تھا۔

شاہ موصوف کے بیٹے کی چند سالہ حکومت کے بعد ایک سپہ سالار نے تخت وتاج پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا، سارگن دوم لقب اختیار کیا، اس نے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کے دس قبائل کو اپنے گھروں سے اجاڑ کر دوسرے علاقوں میں آباد کیا اور مغرب کی طرف سلطنت کو بہت وسیع کیا۔ اشور بنی پال Ashur—Ban—Pal نے ۶۶۸-۶۲۶ ق م میں مصر وشام سے لے کر ایران تک اور آرمینیا سے لے کر شمالی عرب تک حکومت کی اس نے پہلی بار لوہے کے ہتھیار استعمال کئے، شاہ مذکور نے نینوا میں عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جس میں دس ہزار لکھی ہوئی اینٹیں پچھلے زمانہ میں برآمد ہوئی ہیں۔ اس کے انتقال پر نینوا کی حکومت ختم ہو کر پھر بابل کی طرف منتقل ہو گئی۔

طرزِ حکومت آشوری حکومت شخصی اور مطلق العنان تھی باپ کے بعد بیٹے کی تخت نشینی کا رواج تھا۔ عموماً بڑا بیٹا باپ کی جگہ لیتا تھا۔ مگر بڑے بیٹوں کی موجودگی میں چھوٹے کی جانشینی کی مثال ملتی ہے۔ آشوری بادشاہ آشور دیوتا کا مظہر اور نائب خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی ذات تمام غلطیوں سے پاک اور منزہ تصور کی جاتی تھی تمام احکامات آشور کے نام پر جاری و ساری ہوتے تھے۔ اسی کے نام پر محصولات لگائے جاتے تھے اور اسی کے نام پر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔

سلطنتِ روما چھٹی صدی عیسوی تک سلطنتِ روما دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ مشرقی سلطنت روما اور مغربی سلطنت روما۔ مشرقی سلطنت روما کو بازنطینی سلطنت کہتے تھے۔ اس کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا۔ اور بادشاہ کا لقب قیصر تھا۔ مشرقی سلطنت روما مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔

طرزِ حکومت بادشاہ مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے ملک پر حکومت کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو ظلِ سبحانی سمجھتا تھا۔ تمام اختیارات اور طاقت کا سرچشمہ شہنشاہ کی ذات ہوتی تھی۔ عدلیہ، انتظامیہ، اور فوج کا سربراہ ہوتا تھا۔ بادشاہ تمام قوانین سے بالا سمجھا جاتا تھا۔

مغربی رومی سلطنت مغربی رومی سلطنت کا بڑا امتیاز ان کی شہنشاہیت پسندی استعماری روح اور زندگی کا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ تھا۔ جرمن نومسلم عالم محمد اسد اپنی کتاب "اسلام دوراہے پر" میں رقمطراز ہے "رومی شہنشاہی پر جو خالص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری کا خیال اور مادرِ وطن کے لئے دوسری قوموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لوٹ کھسوٹ کرنا تھا۔ رومی رؤسا امراء اور اونچے طبقہ کے لوگ اپنے لئے فارغ البالی اور امارت کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لئے کسی ظلم و بیدردی کو عیب نہیں سمجھتے تھے باقی وہ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ تھا وہ محض رومیوں کے لئے تھا۔ یہ مخصوص سیرت و کریکٹر زندگی اور تمدن کے محض مادی تصور ہی پر قائم ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ان کی مادیت میں آراستگی لطافت ذوق پیدا ہو گئی تھی لیکن تمام روحانی قدروں سے وہ بالکل بیگانہ تھی۔ رومیوں نے کبھی بھی سنجیدگی اور واقعیت کے ساتھ دینداری اختیار نہ کی تھی۔ ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی خطابات اور خرافات کی پھیکی نقل تھے۔ انہوں نے اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت کے خیال سے ان ارواح کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ان دیوتاؤں کو اپنی عملی زندگی میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے ان کا کام صرف اتنا تھا کہ جب ان سے فرمائش کی جائے تو اپنے مجاوروں کی پیش گوئیاں کردی

لیکن ان کو انہوں نے یہ حق نہیں دیا تھا۔ کہ وہ لوگوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں۔

ایران قدیم ایران تین صوبوں پر مشتمل تھا۔ شمال میں عیلام، مغرب میں میڈیا اور جنوب میں فارس، ان تینوں صوبوں کے باشندوں کی ابتدائی تاریخ جدا جدا ہے مگر امتدادِ زمانہ سے تینوں صوبے ایک حکومت کے تحت آگئے اور چھٹی صدی قبل مسیح میں دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت ہوگئی یہ سلطنت آریہ قوم کی تھی جس کے نام پر اس ملک کا نام "ایران" ہوا۔ آریوں کی یہ سب سے پہلی وسیع سلطنت تھی جس کی وجہ سے یورپ اور ایشیا میں پہلی بار اس قوم کا نام روشن ہوا۔

طرزِ حکومت اور اختیارات ایرانی حکومت شخصی اور مطلق العنان تھی تمام اختیارات کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات تھی بادشاہ وقت کو لوگ دیوتا کا درجہ دیتے تھے ایرانی بادشاہوں کا یہ دعویٰ تھا۔ کہ ان میں خدائی خون ہے۔ رعایا ان کے آگے سربسجود ہوتی اور ان کی الوہیت کے گیت گاتی تھی۔ لوگوں کے مال و جان پر ان کا مکمل قبضہ ہوتا تھا، رعایا کو حکومت کے مقابلے میں کوئی حقوق حاصل نہیں تھے۔ اور ان کی حیثیت غلاموں سے بدتر تھی کسی بادشاہ کے افعال کا محاسبہ کرنے کا حق نہیں تھا۔ اس کی ذات تک عوام کی رسائی ناممکن تھی۔ البتہ نوروز اور چند دیگر مواقع پر لوگوں کو بادشاہ کے حضور اپنی شکایات پیش کرنے کی اجازت تھی۔

جاپان جاپان میں بادشاہوں نے سورج دیوی کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا سب سے پہلے جیموٹیمو نے کیا، اہل جاپان کے نزدیک جس طرح یہ سورج دیوی تمام معبودوں کی آقا ہے۔ اسی طرح بادشاہ بھی تمام جاپانیوں کا مخدوم اور سردار ہے، بادشاہ کی ذات ہی مذہب اور سیاست کی مرکز اور محور تھی سورج دیوی کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بادشاہ آہستہ آہستہ خدائی درجہ پر فائز ہوگیا۔ بادشاہ تمام اختیارات کا سرچشمہ تھا۔ اس کا حکم قانون کا درجہ رکھتا تھا۔

چین دنیا کے دیگر ممالک کی طرح چین میں بھی بادشاہت کا دور دورہ تھا چینیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہ کا تقرر آسمان کی طرف سے ہوتا ہے۔

ہندوستان

مورخین ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے تھے۔ پہلا دور ویدک کا دور تھا، جو دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر تقریباً چودہ سو سال قبل مسیح تک رہا۔

دوسرا دور وہ دور ہے جس میں کوروؤں اور پانڈووں کی لڑائیاں لڑی گئیں جو چودہ سو قبل مسیح سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا۔

تیسرا دور علم و ہنر کا دور ہے جس میں ہیئت، ریاضی، فلسفہ، وغیرہ علوم میں ہندوؤں نے کمال دکھایا جو ایک ہزار سال قبل مسیح سے لے کر تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا۔

چوتھا دور بدھ مذہب کا ہے جس میں اس مذہب کو عروج حاصل ہوا اور دو سو پچاس سال قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک رہا۔

پانچواں دور پرانک دور کہلاتا ہے یہ دور تقریباً پانچویں صدی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کی فتح تک قائم رہا۔

طرزِ حکومت ہندوستان کے راجہ چاند اور سورج سے اپنا رشتۂ نسب جوڑتے تھے اور ملک میں بادشاہت تھی، اور بادشاہ ہی تمام اختیارات کا سرچشمہ تھا۔ اور اسی کا فرمان حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اور رعایا فرامین شاہی کو بجا لانے پر مجبور تھی۔

چین کی سیاسی حالت عہدِ نبوی کے آغاز سے قبل چین میں بادشاہت کا دور دورہ تھا ہن Huns خاندان کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اور اس کی جگہ وائی Wai اور شو Shw کی بادشاہتیں قائم ہو چکی تھیں بادشاہ ہی تمام اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ اسی کا حکم آخری ہوتا۔

عرب کی سیاسی حالت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی تمام عرب قبائل میں بٹا ہوا تھا۔ ان قبائل کی باہمی شیرازہ بندی نسب اور اتحادِ خون کے واسطے سے ہوتی تھی۔ قبیلہ کی حکومت جمہوری طرز پر ہوتی تھی۔ ہر قبیلہ کا رئیس اعلےٰ اہل قبیلہ سے ہوتا جمہوری اصول کے مطابق وہی شخص منصب سیادت کا اہل ہوتا تھا جس کے حامی سب سے زیادہ ہوں اور وہ شجاعت، مہمان نوازی اور فیاضی میں ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔ قبیلہ کا رئیس اعلیٰ کنبوں کے دوسرے سرداروں کو جمع کرتا اس سے مجلس شیخ القبیلہ تشکیل پاتی تھی اس میں جنگ و صلح یا دوسرے اہم امور کے متعلق گفتگو ہوتی، قبیلہ کا کوئی قانون نہ ہوتا۔ عرب میں مرکزی حکومت کے فقدان کی وجہ سے نہ کوئی محکمہ عدلیہ تھا نظم امن کو قائم رکھنے کے لئے محکمہ پولیس تھا اور نہ خارجی خطرات کے دفاع کے لئے فوجی نظام نہ ان کے پاس اپنا سکہ یا ٹکسال تھی۔

مرکزی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہی ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر حملہ کر دیتا مظلوم

قبیلہ کے مرد وزن کو تہ تیغ کر دیتا۔ قریش نے مکہ میں ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈالی۔

امارت حجاز حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو پرانی بنیادوں پر کھڑا کیا اس گھر کا سب سے پہلا متولی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مقرر کیا گیا۔ آہستہ آہستہ لوگ اس جگہ پر آباد ہونے شروع ہوگئے سب سے پہلے قبیلہ جرہم آباد ہوا حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس قبیلہ کے سردار مضاض کی لڑکی سے شادی کرلی اس سے بارہ اولادیں ہوئیں ان میں نابت اور قیدار کی نسل نے بہت دنیاوی عروج حاصل کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے لڑکے نابت بیت اللہ کے متولی بنے اور دو پشتوں کے بعد آل اسماعیل میں اتنی کثرت ہوئی کہ وہ طلب معاش کے لئے باہر چلے گئے ان کے مکہ سے باہر چلے جانے کے بعد بنی جرہم نے خانہ کعبہ کی تولیت پر قبضہ کر لیا۔ آل اسماعیلؑ نے خیال رشتہ کی وجہ سے ان کا کوئی مقابلہ نہ کیا۔ بلکہ بنی جرہم تولیت کے غرور میں اتنے بدمست ہوئے کہ ان سے ہر قسم کی بدعنوانیاں شروع ہوگئیں۔

یمن کے سیلاب کی وجہ سے جب حارثہ بن عمر جس کا لقب خزاعہ تھا اپنا قبیلہ لے کر مکہ پہنچا تو وہاں کے باشندوں نے نکال دیا یہ لوگ نجد، عراق اور بحرین میں جا بسے مکہ اور اس کے اطراف میں آل اسماعیلؑ میں سے صرف قریش کی اولاد رہ گئی، جب خاندان قریش سے قصیؔ پیدا ہوا۔ یہ شخص بہت حوصلہ مند اور زیرک تھا۔ اس نے تمام منتشر قبائل کو جمع کیا، اور بنی کنانہ کی مدد سے بنی خزاعہ سے بیت اللہ کا قبضہ لیا اور تمام قریش کو مکہ میں آباد کیا۔ اور اس کی تنظیم کر کے ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس دن سے قریش کو حجاز میں سیاسی اور اجتماعی اہمیت حاصل ہوگئی۔ قصی نے اس ریاست کی بنیاد جمہوری طرز پر رکھی، اس کے کئی شعبہ جات تھے جو مختلف قبائل میں منقسم تھے بڑے تین شعبے تھے، فوجی، عدالتی اور مذہبی پھر یہ تینوں آگے کئی شعبوں میں تقسیم تھے شعبہ جات قریش کی مختلف شاخوں میں تقسیم تھے اسلام سے قبل ان کی تقسیم حسب ذیل تھی

۱۔ عقاب۔ یعنی قومی نشان کی علمبرداری۔ بنی اُمیّہ۔
۲۔ قبہ اور اعنہ یعنی فوجی کیمپ کا نظم و انصرام اور سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری بنی مخزوم
۳۔ سفارت یعنی دوسری حکومتوں سے خط و کتابت کا ادارہ۔ بنی عدی۔
۴۔ ندوہ یعنی عدالت اور قومی جلسوں کا انتظام، بنی عبد دار
۵۔ مشورہ یعنی اہم امور میں صلاح مشورہ بنی اسد۔
۶۔ اشناق یعنی جہاں جرمانہ اور تاوان کی نگہداشت ہوئی تھی بنی تیم۔
۷۔ حکومت یعنی جہاں مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے

۸۔ سقایہ یعنی حاجیوں کی خورد و نوش کا انتظام
۹۔ عمارہ یعنی خانہ کعبہ کا انتظام بنی ہاشم
۱۰۔ رفادہ یعنی حاجیوں کی مہمان نوازی اور مالی امداد۔ بنی نوفل
۱۱۔ سدانہ یعنی خانہ کعبہ کی کلید برادری کا کام بنی عبد دار
۱۲۔ الیسار یعنی بتوں سے استخارہ کرنے کا کام۔ بنی جمح۔
۱۳۔ اموال المحجہ یعنی بتوں کی بھینٹ بتوں کے چڑھاوے کا انتظام۔ بنی سہم

قصی کے چھ لڑکے تھے، عبد دار، عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد، الخمز اور برہ مرتے وقت قصی نے حرم کے تمام منصب عبد دار کو تفویض کر دیئے، عبد مناف کے لڑکے ہاشم نے بنی عبد دار کی نااہلی کی وجہ سے ان سے سقایہ اور رفادہ کے منصب لے لیے ہاشم مفوضہ خدمات کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ حاجیوں کی بڑی فیاضی سے خدمت کی جس وجہ سے قریش میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

اسلامی تہذیب

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک روحانی اور دوسرا مادی' انسان کی شخصیت کی اس وقت تک تعمیر نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں پہلو نشوونما نہ پائیں۔ اسلام نے ان دونوں پہلوؤں کی نشوونما کی تعلیم دی۔

ثقافت

ثقافت کا مفہوم عربی کے لفظ ثقافت انگریزی کا لفظ کلچر (Culture) کا مترادف ہے ثَقِفَ، ثَقُفَ اور ثَقَافَۃ کے معنی ہیں زیرکی، دانائی اور کسی کام کے کرنے میں عقلمندی اور مہارت۔ ثقف وہ زیرک اور دانا حاذق ہوا۔ ثَقِفٌ، ثِقْفٌ، ثَقُفٌ اور ثَقِيْفٌ زیرک، ذہین اور حاذق شخص کو کہتے ہیں۔

ثَقِفَ یعنی کسی نے کسی امر کو پا لیا۔ کامیاب ہوا فتح مند ہوا ثَقِيْفٌ کامیاب اور فاتح شخص ثَقِفَ الْحَدِيْثَ یعنی بات تیزی سے سمجھ لی۔

ثقافت اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے نیزے سیدھے کئے جاتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ کسی چیز کے بھانپ لینے اور کسی کام کے کرنے میں مہارت اور حذاقت کا نام ثَقْفٌ ہے اس سے کا لفظ مشتق ہے۔ جس کے معنی باہم شمشیر زنی کے ہیں رُمْحٌ مُثَقَّفٌ کے معنی ہیں۔ سیدھا کیا ہوا نیزہ اور جس آلہ سے نیزے کو سیدھا کیا جاتا ہے وہ ثقافت کہلاتا ہے۔

ثَقِفْتُ كَذَا کے معنی ہیں کہ میں نے وقت نظر سے کسی چیز کو تاڑ لیا' پھر بھی یہی لفظ گرفت اور پانے میں استعمال کیا جانے لگا۔ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (بقرہ ۲: ۱۹۱) اور جہاں ان کو پاؤ مار دو۔ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ (الانفال ۸: ۵۷) اگر تم ان کو لڑائی میں پا مَلْعُوْنِيْنَ أَيْنَمَا ثُقِفُوْا أُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (الاحزاب ۳۳: ۶۱) پھٹکارے ہوئے جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور قتل کئے جائیں گے۔

علامہ زمخشری اپنی کتاب "اساس" میں لکھتا ہے کہ مجازاً آداب سکھانے اور مہذب بنانے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ وَلَوْ تَثْقِیفُکَ وَتَوْقِیفُکَ لَمَا کُنْتُ شَیْئاً۔ یعنی اگر مجھے نہ سنوارتا اور باخبر نہ کرتا تو میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس طرح یوں بھی کہا جاتا ہے: هَلْ تَهَذَّبْتُ وَتَثَقَّفْتُ اِلَّا عَلٰی یَدِكَ۔ یعنی میں نے تجھ سے ہی ادب اور تہذیب سیکھی!

راغب الی بیروتی اپنے رسالہ الثقافۃ میں لکھتا ہے: الثقافة: هل هي الا اصلاح النفس الصحیح الکامل بحیث یکون صاحبها مرآة الکمال والفضائل .... اصلاح الفاسد وتقویم المعوج[1]

یعنی ثقافت نام ہے نفس کی صحیح اور کامل اصلاح کا اس طرح کہ مثقف آدمی کی ذات کمال اور فضائل کی آئینہ ہو.... فاسد کی اصلاح اور ٹیڑھے کو سیدھا کرنا ثقافت ہے۔

ارنلڈ اپنی کتاب (Culture and Anarchy) میں کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"کلچر انسان کو کامل بنانے کی بے لوث سعی ہے۔ کلچر کمال کی تحصیل ہے"[2]

ٹی ایس ایلیٹ ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ثقافت آداب کی شائستگی کا نام ہے یعنی مدنیت اور انسانیت"[3]

پھر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ثقافت سے میری اولین مراد یہ ہے جسے ماہرین لسانیات بیان کرتے ہیں۔ یعنی ایک خاص مقام پر رہنے والے مخصوص افراد کا طرز حیات"[4]

محسن مہدی لکھتا ہے۔

"ثقافت نہ تو صلاحیت و استعداد کا نام ہے اور نہ ان خواہشات کا جو آدمی کی ذات کے اندر موجود ہیں۔ بلکہ صحیح طور پر معاشرتی اور فنی تخلیقات کی عادی اور رسمی صورت کا نام ہے"[5]

فلپ بگ بی Philip Bagby لکھتا ہے۔

"ثقافت معاشرے کے افراد کے داخلی اور ابدی طرز عمل کی باقاعدگیوں کا نام ہے۔ اس میں وہ باقاعدگیاں بھی شامل ہیں جو صاف طور پر موروثی بنیاد رکھتی ہیں"[6]

---

[1] الثقافۃ صفحہ ۱۹ مکتبہ اہلیہ بیروت [2] ترجمہ ثقافت و انتشار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ص ۱۶۱

3 Note towards the Defination of Culture P. 13 [4] Note towa the Defination of Culture P. 120 [5] Ibn Khaldun's Philoso of History P. 181 : Culture and History

فیضی لکھتا ہے۔

کلچر کسی مخصوص زمانے یا ملک کے عام دانشورانہ معیار کا نام ہے"[1]

پروفیسر ہیری شیپرو Harry Shapiro نے اُسے فقط اکتسابی طرزِ عمل کا نام دیا ہے"[2]

ہاب ہاؤس Hob House کے نزدیک۔

ہر وہ شے جو افراد کے جذبات اور احساسات سے وجود میں آئے ثقافت ہے"

میلی نوسکی Mali Nowski کے نزدیک۔

" زندہ رہنے کے مجموعی سلیقے کا نام ثقافت ہے جو ہمہ قسم کے ذہنی، معاشرتی اور مادی آلات پر مشتمل ہے"

گستاف کلائم Gustave Clame کے نزدیک رسوم و روایات اکتسابی طریق کار امن و جنگ کے دِنوں میں شخصی اور اجتماعی زندگی مذہب، سائنس اور فنون کا ایک ایسا مجموعہ جو ماضی کا ورثہ ہے اور مستقبل کے لئے تجربہ بھی"[3]

رابرٹ ریڈ فیلڈ Robert Red Field لکھتا ہے۔

"کسی انسانی گروہ کے علوم اور خود ساختہ فنون کا ایک ایسا مصالحتی نظام جو باقاعدگی سے رواں دواں ہو"[4]

ڈاکٹر برہان الدین احمد فاروقی لکھتا ہے۔

یہ جرمن کے لفظ کلٹور Kulture سے ماخوذ ہے، جس میں جوتنے بونے اور اُگانے کا استعارہ پایا جاتا ہے، مگر جو کچھ جوتا جاتا ہے وہ زمین نہیں انفرادی اور اجتماعی ذہن ہے۔ جو کچھ بویا جاتا ہے وہ بیج نہیں تصورات ہیں، اور جو کچھ اُگایا جاتا ہے وہ اناج کی فصل نہیں بلکہ یکسانئے کردار کا نمونہ ہے جس کی بدولت کسی گروہ میں وحدت کا شعور راسخ ہوتا ہے"[5]

مذکورہ بالا تعریفات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ثقافت (کلچر) کی اصطلاح کتنی مبہم ہے اور ہر ماہرِ فن نے ایک دوسرے سے مختلف تعریف کی ہے۔ قرآن مجید میں کلچر کا مترادف لفظ فلاح آیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے آغاز میں اولٰئکَ ھُمُ المُفلِحُونَ کے الفاظ آئے ہیں

---

[1] Islamic Culture

[2] ثقافت کا مسئلہ (ترجمہ سید قاسم محمود) ص۳۵ بینی ڈگٹ بحوالہ سید قاسم محمود قدیم تہذیب اور جدید انسان ص۵۱۷ شیش محل کتاب گھر لاہور۔

[3] Ogburn W. F. and Nimkoff M. F. Sociology P. 50

[5] بحوالہ سید قاسم محمود ص۵۱۸

فَلَحَ کے اصل معنی شق یعنی پھاڑنا ہیں۔ زمین پر ہل چلانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اس لئے کسان کو عربی زبان میں فلاّح کہا جاتا ہے۔ فلاح کے معنی ظفر اور ادراک بغیہ ہیں (امام راغب) یعنی کامیابی اور مطلوب کو پالینا یہی لغوی معنی کلچر کے ہیں۔ یعنی ہل چلانا۔ عام وسیع مفہوم میں انسانی اعمال کے ثمرات پر بولا جاتا ہے۔

پس قرآنی نقطۂ نگاہ سے ثقافت سے مراد ان قوائے مضمرہ کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں ودیعت کر رکھے ہیں۔

جب انسان کی مخفی استعدادیں ظاہر ہو جائیں، اور کائنات کے ذرّے ذرّے کو اپنا تابع بنالیں، تب کلچر (ثقافت) اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کے قوائے مضمرہ اور مخفی استعدادوں کو نشوو نما دینے کے لئے دوؔ چیزیں عنایت کی ہیں، اوّل، وحی الٰہی، یہ وہ آسمانی پانی ہے جو دلوں کی مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے، اور انسان کی مخفی استعدادیں جاگ اٹھتی ہیں۔ دوم، عقل اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے تاکہ اس کے ذریعے انسان اپنی مخفی استعدادوں کو بروئے کار لاسکے، گویا اسلامی نقطۂ نگاہ سے ثقافت کا سرچشمہ وحی الٰہی اور عقل ہیں۔

بحث کا ماحصل: مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ثقافت سے مراد بڑے بڑے شہروں کا آباد کرنا، عالیشان عمارات کا تعمیر کرنا۔ چوڑی اور وسیع سڑکیں بنانا۔ موسیقی چنگ و رباب رقص و سرود کی محفلیں جمانا۔ یا عیش و عشرت کے سامان کا حصول نہیں ہے بلکہ ثقافت سے مراد مخفی استعدادوں کی نشوو نما ہے، کیونکہ مخفی استعدادوں کی نشوونما میں ہی انسانی ترقی کا راز مضمر ہے۔

جس طرح کسی درخت کا ایک بیج ہوتا ہے۔ اس بیج میں ہی بالقوۃ پھل پھول، شاخیں۔ پتّے ٹہنیاں وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ جب اس بیج کو مناسب آب و ہوا اور زمین میسر آتی ہے، اسی بیج سے بالفعل پھل پھول، شاخیں، پتّے اور ٹہنیاں نکل آتی ہیں۔ اس بیج کی زندگی ان مخفی استعدادوں کے ظہور سے ہے۔ اسی طرح انسان کی ترقی انسان کی مخفی استعدادوں کی نشوونما سے ہے، جب مخفی استعدادیں ظاہر ہوتی ہیں تو ثقافت کی تشکیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

ثقافت کے عوامل

ثقافت کے عوامل دو قسم کے ہیں، جن سے ثقافت نشوونما پاتی ہے، خارجی عناصر اور داخلی عناصر۔

ثقافت کے خارجی عناصر وہ ہیں جو مؤثرات خارجی کی پیداوار ہیں۔ مؤثرات خارجی کی دو اقسام ہیں۔

طبعی حالات: ثقافت کی تشکیل و تعمیر میں طبعی حالات کو بڑا دخل ہے، یعنی آب و ہوا۔ دریا۔ پہاڑ۔ جنگل۔ میدان۔ پھل پھول وغیرہ۔ یعنی انسان کا خارجی ماحول اس کے رہن سہن، خوراک و پوشاک، ذریعہ معاش، مزاج و مذاق، عادات و جذبات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ معتدل ممالک کے باشندے عموماً آرام طلب، کاہل اور عیش پرست ہوتے ہیں۔ غیر معتدل ملکوں کے لوگ عموماً جفاکش، محنتی، چاق و چوبند ہوتے ہیں۔ گرم ممالک کے رہنے والے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ اور سرد ممالک کے رہنے والے دیر سے متاثر ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کے لوگ میدانی علاقوں کے باشندوں سے زیادہ محنتی، مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش ان بچوں کو دیکھیں جو تیرو و تار کوٹھڑیوں میں بود و باش رکھتے ہیں۔ گندی اور بدبودار گلیوں میں کھیلتے ہیں، جسم پر موسم کے مطابق پہننے کو لباس نہیں ہے، پیٹ بھرنے کے لئے خوراک میسر نہیں، بیمار ہو جائیں تو علاج کے لئے پیسہ نہیں۔ جب تعلیم حاصل کرنے کی عمر کو پہنچ جائیں تو والدین مدرسہ بھیجنے کی بجائے فیکٹریوں یا امرا کے گھروں میں کام کاج کے لئے بھیج دیتے ہیں، ان بچوں کی شخصیت ان بچوں سے بہت مختلف ہے جن کو زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔

سماجی اقدار: کسی معاشرے میں رسم و رواج، طرز بود و باش، روابط و سلوک اور اظہارِ فن کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہ معاشرے کے سماجی اقدار کہلاتے ہیں۔ ان اقدار کی تشکیل و تعمیر کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں، اس وجہ سے لوگ ان سماجی اقدار پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ جو شخص معاشرے کی اقدار پر عمل پیرا نہ ہوتا تو قبیلہ کے لوگ اس کو قبیلہ سے خارج کر دیتے تھے مثلاً عربوں کی قبیلہ داری نظام کی بنیاد "عصبیت" پر ہوتی۔ اگر کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جاتا تو تمام قبیلہ اس کا بدلہ لینے کے درپے ہو جاتا۔ جب تک مقتول کے ورثاً یا قبیلہ بدلہ لے لیتا، عرب اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کو پناہ دینے سے گریز کرتا تو اس کو بزدل خیال کیا جاتا اور عرب کی نظروں میں گر جاتا۔ ہندو معاشرے میں ذات پات کی تمیز سماجی قدر ہے ایک ہندو کی شخصیت اسی سماجی قدر سے نشوونما پائے گی۔ معاشرے میں سماجی اقدار نافع اور مضرت رساں دونوں قسم کی رائج ہو جاتی ہیں۔ جب مضرت رساں سماجی اقدار معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا موجب بننا شروع ہوتی ہیں تو کوئی مصلح ان فاسد سماجی اقداروں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مفید قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرح مضرت رساں قدریں وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی جاتی ہیں۔ سماجی اقدار کا ثقافت کی تعمیر و تشکیل میں بڑا دخل ہے۔ معاشرے میں جس قسم کی قدریں ہوں گی۔ فرد کی شخصیت بھی ویسے نشوونما پائے گی۔

آلات و اوزار: ثقافت کی ترقی کا دار و مدار آلات و اوزار پر منحصر ہے۔ جس قسم

کے آلات واوزار ہوں گے۔ ثقافت بھی اسی قسم کی ہوگی۔ اسی لئے مورخین نے ثقافت کے مختلف ارتقائی ادوار آلات واوزار کی مناسبت سے متعین کئے ہیں۔ مثلاً پتھر کے زمانے کی ثقافت، کانسی کے زمانے کی ثقافت اور لوہے کے زمانے کی ثقافت جس قسم کے اوزار ہوں گے۔ لوگوں کا رہنا سہنا، رسم و رواج، عادات واطوار سوچنے سمجھنے کے انداز بھی انہی کے تابع ہوں گے۔ جوں جوں اوزار اور آلات میں تبدیلی آتی جارہی ہے۔ ثقافت میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ مثلاً پتھر کے زمانے کے لوگوں کا رہنا سہنا، رسم و رواج بعد کے آنے والے زمانوں سے یکسر مختلف ہے۔ آلات و اوزار کی تبدیلی کے ساتھ ثقافت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگالیا جائے۔ جب لوگ ہل بیل سے کاشت کرتے تھے تو دیہی معاشرے کی کیا شکل تھی، جب کاشت فارموں کی شکل میں ٹریکٹروں کے ذریعے ہو رہی ہے تو اس کی کیا شکل ہے۔ جوں جوں آلات و اوزار اور بھاری مشینیں ترقی کے مراحل طے کرتی چلی جارہی ہیں۔ معاشرے کی سماجی اقدار میں انقلاب آتا چلا جارہا ہے۔

داخلی عناصر: داخلی عناصر وہ ہیں جو انسان کے مخفی استعدادوں اور قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کے بھی دو مصادر ہیں۔ ایک وراثت اور دوسرا فکر واحساس۔

وراثت: بچے میں اپنے والدین اور آباؤاجداد کے عادات واطوار موروثی طور پر کچھ نہ کچھ ضرور منتقل ہوتے ہیں عربی مثل ہے: اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ یعنی بچہ باپ کے عادات واطوار کے مشابہ ہے۔

فکر واحساس: فکر واحساس انسانی خصلت ہے۔ فکر واحساس کا مصدر و منبع ذہن ہے۔ انسان کے تمام افعال اور ارادے دماغ کے تابع ہیں۔ جوں جوں انسانی ضروریات و احتیاجات بڑھتی جاتی ہیں۔ انسان اپنی قوتِ فکریہ کو کام میں لاکر ان ضروریات کو پورا کرتا ہے اور نت نئی ایجادات واکتشافات کرکے ثقافت کو ترقی دیتا ہے۔ اگر قوتِ فکریہ ختم ہوجائے تو ثقافتی ترقی بھی رک جائے گی۔ جس قوم نے بھی فکر واحساس سے کام لیا ہے وہی قوم ثقافت کے میدان میں سبقت لے جاتی ہے۔

تمدّن

لفظ تمدّن کی تشریح: تمدّن کا مادہ "مدن" ہے جس کے معنی جگہ، بستی اور شہر کے ہیں تمدّن کے ٹھیک معنی ہیں آپس میں مل جل کر رہنا۔

اصطلاح میں تمدن کہتے ہیں آپس میں ملنے جلنے، رہنے سہنے کے قواعد وضوابط شخصی و جماعتی آزادی، شخصی واجتماعی حقوق وفرائض بجالانے کے قوانین اور انسانی حقوق وفرائض ادا کرنے کے

طریقے جو اخلاقی اصول پر منضبط ہوتے ہیں۔

تمدّن کی اقسام

تمدّن کی چار اقسام ہیں۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے چار اہم تمدّن ہیں ۱۔ حسّی تمدّن۔ ۲۔ عقلی تمدّن، ۳۔ اشراقی تمدّن، ۴۔ الہامی تمدّن۔

حسّی تمدّن، دنیا کا مقبول ترین تمدّن ہے۔ جس کی بنیاد حواس اور ان کے نتائج پر ہے یہ وہ تمدّن ہے۔ جس کو ہر زمانہ کے لوگوں نے آسانی سے قبول کیا۔ اس تمدّن کی حسب ذیل خصوصیات ہیں:۔

۱۔ ہر ایسی چیز کا انکار جو حواس کی گرفت میں نہیں آتی۔ اور ہر اس چیز کی تصدیق جس کی مجرد حواس ظاہری کرتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ کسی ان دیکھی حقیقت پر ایمان نہیں ہوتا جو حواس سے بالاتر ہے۔ جب ان دیکھی حقیقتوں پر ایمان نہیں تو ان سے خوف یا اُمید پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ ان دیکھی حقیقتوں کے انکار کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر لذتیت حظِّ نفس، انفرادی افادیت، ذاتی منافع کے حصول کے لئے شب و روز سعی پیہم میں گرفتار رہتا ہے۔ اس نظام تمدّن میں استحصال، نفع اندوزی اور خود غرضی پوری جلوہ گر ہوتی ہے

۳۔ استحصال اور خود غرضی کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ دو طبقوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ضروریاتِ زندگی کے تمام وسائل آجاتے ہیں۔ وہی طبقہ ملک کا حکمران ہوتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو نان و نفقہ کے لئے پہلے طبقہ کا دست نگر ہوتا ہے، حکمران طبقہ اپنی حکمرانی اور بالادستی کو قائم رکھنے کے لئے ظالمانہ قوانین وضع کرتا ہے۔ تاکہ محکوم طبقہ کو بے بسی کی زنجیروں میں ہمیشہ کے لئے جکڑے رکھے۔ اسی تمدّن کی پیداوار غلامی ہے۔

۴۔ اعلیٰ اور حکمران طبقہ اپنی زندگی کو خوشگوار اور لطف اندوز بنانے کے لئے پہاڑوں کے سینوں کو چیر کر نہریں نکالتا ہے۔ زمین کو آباد کرتا ہے۔ شاندار، پُرشکوہ محلات تعمیر کرتا ہے۔ ان خوبصورت محلات میں کام و دہن اور جنسی لذّت کے لئے ہر قسم کا سامان موجود رہتا ہے۔

جزیرۃ العرب میں عہد قدیم عاد کے نام سے ایک قوم ہوئی ہے جو اپنے عہد میں حسی تمدّن کی نمائندہ تھی۔ ان کا تمدّن اس زمانہ کا بڑا ترقی یافتہ تمدّن تھا۔ وہ قوم محض اپنی شان و شوکت جاہ جلال اور نام و نمود کے لئے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آتا ہے۔ ان کے پیغمبر ہود نے ان کو مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (شعراء ۲۶: ۱۲۸-۱۳۰)

کیا تم ہر اونچی جگہ پر یادگاریں بناتے ہو عبث کام کرتے ہو اور کاریگری کے کام بناتے ہو

کہ شاید تم ہمیشہ رہو اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو سختی سے پکڑتے ہو۔

جب عاد قوم صفحۂ ہستی سے مٹی تو اس کی جانشین قوم ثمود نے بھی اپنی ترقی کی بنیاد حسی تمدن پر رکھی۔ تو وہ بھی دنیاوی لذتوں میں منہمک ہو گئی۔ تو ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ (الشعراء ۲۶: ۱۴۶-۱۴۹) کیا تم یہاں کی چیزوں میں امن میں چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ یعنی باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں اور کھجوروں میں جن کا گابھا ملائم ہے اور تم اتراتے ہوئے پہاڑوں میں گھر تراش لیتے ہو۔

۵۔ حسی تمدن اور مظاہر پرستی لازم و ملزوم سے ہیں۔ اگر تاریخ کے اوراق کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ حواس اور مادہ پرست اقوام عموماً بت پرست تھیں۔ مصر، شام، ایران، روم اور یونان وغیرہ تمام ممالک حسی تمدن کے مراکز تھے۔ ان تمام ممالک میں مظاہر اور اصنام پرستی کا زور تھا۔

۶۔ حسی تمدن کا بنیادی پتھر خود غرضی اور دوسروں کا استحصال، ذاتی منافع، اغراض مصالح ہوتا ہے اس وجہ سے ہر فرد جائز اور ناجائز عمل سے اپنی تجوریاں بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اجتماعی مفاد کو نظر انداز کر کے شخصی افادیت پیش نظر ہوتی ہے۔ اس طرح معاشرہ میں ہر قسم کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کاروبار میں بددیانتی اس ذہنیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس استحصالی ذہنیت کو سامنے رکھ کر قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (الشعراء ۲۶: ۱۸۱-۱۸۳) ماپ پورا دیا کرو اور کم دینے والوں میں سے نہ بنو اور ٹھیک ترازو سے تولا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

عہد قدیم میں سلطنت روم حسی تمدن کی مرکز تھی۔ اس کے عروج کے وقت روم کی جو اخلاقی اور اجتماعی حالت تھی۔ اس کا نقشہ ڈریپر نے ان الفاظ میں کھینچا ہے "جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما منتہائے ترقی پر فائز ہو گئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجہ اخیر کو پہنچ چکی تھی۔ اہل روما کی عیش پرستی و عشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی اس کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ زندگی کو ایک سلسلۂ عیش بنا دے۔ پاکبازی حظ نفس کے خوان نعمت پر بمنزلہ نمکدان ہے اور اعتدال سلسلۂ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے اس کے

دستر خوان سونے اور چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے ملازم زرق برق کی پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے ماہ رویان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے محوِ ناز رہتی تھیں، عالی شان محلوں، دلکشا تماشا گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے، جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے' اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا۔ دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے اس لئے کہ اس قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال و املاک کی ضبطی، صوبجات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولتِ روما اس زورِ قوت کا نشان یا علامت ہے۔

غرض روما کے نظامِ تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی۔ لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی۔ جو یونان عہدِ قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا"۔ لہ

ایرانی تمدن حسیت اور مادہ پرستی کا شاہکار تھا۔ شاہی طبقہ، روسا اور امراء عیش و عشرت لذت اندوزی، شراب نوشی اور حسین ماہ جبیں عورتوں کے جلو میں زندگی بسر کرتے تھے۔ پارسی مورخ شاہین مکاریوس کے قول کے مطابق کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں۔ پچاس ہزار اصطبل گھوڑے اسی قدر سامانِ تعیش محلات نقد و جواہرات تھے۔

مورخین نے فرشِ بہار کی (جس پر بیٹھ کر امراء ایران موسم خزاں میں شراب نوشی کرتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی۔ چمن تھے۔ جن میں پھولدار اور پھلدار درخت قائم تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے۔ گرد ہیرے کی جدول تھی درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی تھیں یہ موسم خزاں میں تاجدارانِ آل ساسان اس گلشن میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے۔ دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانے نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔ لہ شامی تہذیب بھی اپنے دور کی مادی تہذیب کا شاہکار تھی۔ حسان بن ثابت نے امیر شام جبلہ بن الایہم کی ایک مجلس کو دیکھ کر ان الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

لہ معرکہ مذہب و سائنس ترجمہ مولانا ظفر علی خان لہ تاریخ اسلام از مولوی عبد الحلیم شرر ج ۱ ص ۳۵۱

"مَیں نے باندیاں دیکھیں، جن میں پانچ روم کی تھیں، جو بربط پر گا رہی تھیں۔ پانچ وہ تھیں، جو اہل حیرہ کے دھن پر گا رہی تھیں، جنہیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفۃً بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ عرب کے علاقہ مکہ وغیرہ سے بھی گویّوں کی ٹولیاں جاتی تھیں۔ جبلہ جب شراب نوشی کے لئے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر ہر قسم کے پھول چمیلی اجوہی وغیرہ بچھا دیئے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مشک و عنبر لگائے جاتے۔ چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص لایا جاتا اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی اور اس کے علاوہ ہمنشینوں کے لئے گرمیوں کا لباس آتا وہ اپنے اوپر ڈال لیتے۔ جاڑوں کا سمور، قیمتیں کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کئے جاتے"۔[1]

ان تاریخی حوالہ جات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دَور کی متمدن سلطنتوں کے تمدن کی اساس ایک جیسی تھی۔

عقلی تمدّن: عقلی تمدن بھی حسّی اور مادی تمدن ہی ہے۔ چونکہ مادی تمدّن میں اختیار کردہ رسوم و رواج وغیرہ کی صحت پر عقلی توجیہات کی گئی ہیں اس وجہ سے اس کو تمدّن کی ایک الگ قسم قرار دیا گیا ہے، حالانکہ حسّی تمدن اور عقلی تمدّن کی خصوصیات میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اس تمدن کے متعلق یہ کہنا بالکل غلط اور سراپا بے بنیاد ہے کہ اس دَور کے رسوم و عادات، اصول معاشرت عقائد و نظریات کی بنیاد خالص عقل پر تھی۔ قدیم عہد عقلی تمدّن کا گہوارہ یونان سمجھا جاتا ہے۔ اس عقلی تمدّن میں عصمت فروشی، غلامی، بادشاہت، طبقاتی تقسیم، بُت پرستی، خلافِ فطرت جرائم پائے جاتے تھے۔ اور یونانی حکماء اور فلاسفہ نے معاشرہ کے لئے ان چیزوں کو ضروری قرار دیا اور ان چیزوں کے لئے صفائیاں پیش کیں۔ اسی طرح عرب میں دختر کشی اور ہندوستان میں ستی کی رسم پائی جاتی تھی۔ اس دَور کے حکماء نے ان رسوم کی صحت کے لئے کیسے کیسے نکتے نکالے۔ کیا ان باتوں کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمدن عقلی تمدّن تھا۔

ہمارے اس دَور میں یورپ کے لٹریچر میں عقل اور فطرت کے الفاظ کا عام استعمال ہے اس وجہ سے ایک عام سطح بین شخص بھی یورپ کے تمدّن کو عقلی تمدن کہہ دیتا ہے۔ لیکن جب یورپ کے اس تمدّن کا سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھُل کر سامنے آجاتی ہے کہ یورپ کے اس تمدّن کو عقلی تمدّن قرار دینا عقل کے خلاف بغاوت ہے۔ بادہ نوشی، قمار بازی، جنسی بے راہ روی وغیرہ یورپ کے نام نہاد عقلی تمدّن کا حصّہ ہیں۔ اس تمدّن میں اب خلافِ فطرت فعل کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا ہے۔

ان تمام اخلاق باختہ افعال کو جائز قرار دینے کے لئے عقلی دلائل و براہین پیش کر رہی ہے

[1] تاریخ طبری ج ۴ صفحہ ۱۷۱

تمام معاشرہ خودغرضانہ ذہنیت کا پرتو ہے۔ معاشرہ میں محبت، اخوت، مساوات، ایثار اور رواداری مفقود ہیں۔ ہر ملک وطنیت، قومیت، ہوس، ملک گیری اور مادی ترقی کا شکار ہے جس کی وجہ سے دنیا سے حقیقی امن اٹھ چکا ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یورپ کا یہ عقلی تمدن حقیقی معنی میں عقلی تمدن کہلانے کا مستحق ہے۔ دراصل دورِ حاضرہ میں یورپ کا تمدن مادی اور حسی تمدن ہے اور اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو حسی تمدن اور مادی تمدن میں پائی جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ تمدن کی طویل تاریخ میں خالص اور حقیقی عقلی تمدن کا کہیں بھی نشان نہیں ملتا۔

اشراقی تمدن: اشراقی تمدن، حسی اور مادی تمدن کی بالکل ضد ہے۔ اس تمدن کی بنیاد ترکِ دنیا اور رہبانیت پر ہے۔ اس تمدن میں مادیت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔ اس تمدن کے حامی یہ سمجھتے ہیں۔ حقیقی راحت اور قلبی سکون اس وقت تک میسر نہیں آسکتا جب تک خواہشات نفسانی کا کلیتہً استیصال نہ کیا جائے کیونکہ مادیت اور روحانیت دو اضداد ہیں جن کا اجتماع محال ہے۔ انسان اس وقت ہی امن والی زندگی حاصل کرسکتا ہے۔ جب وہ جسم کو چلّہ کشی سے بالکل مغلوب کرلیتا ہے۔ اس فلسفہ کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بدھ اور مسیحی علمائے نے اعلانیہ تجرد اور رہبانیت کی تعلیم دی۔ خود انہوں نے جسم کشی اور خلاف فطرت ریاضتوں کے لیے جنگلوں کو اپنا گھر بنا لیا۔ انسانی خوراک کی بجائے گھاس پھوس کھانا شروع کردیا۔ اس فلسفہ نے معاشرتی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ امراض، اموات اور بھوک کا عفریت اپنی بھیانک شکل میں لوگوں کو نگلنے لگا۔

الہامی تمدن: الہامی تمدن سے مراد وہ تمدن ہے۔ جس کی بنیاد رسولوں نے وحی الٰہی کے ذریعے رکھی۔ سب سے پہلے تمدنی اصول حضرت آدم علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے الہام پاکر لوگوں کو سکھائے ارشادِ الٰہی ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ ۲: ۳۱) اور آدم کو سب کے نام سکھائے۔ دنیا کی جس قوم میں بھی اصولِ تمدن میں بگاڑ پیدا ہوا اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں کی اصلاح کے لیے اس قوم کی طرف نبی بھیجا۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے تمدنی اصولوں کی تکمیل کے لئے آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ انسان کی عقل کوتاہ اور ناقص ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اصول تمدن سکھائے دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں نے برملا عقل کی کوتاہی کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے سقراط کا مشہور مقولہ ہے کہ ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے"!

انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم واضح الفاظ میں اقرار کرتا ہے کہ "انسان ذی عقل مخلوق ہے اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت واذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہوسکتی ہے"[۱]

۱۔ فہم انسانی، ص ۵

جب انسان کی عقل ناقص ہے تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انسان اپنی عقل کے ناخن تدبیر سے پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کر سکے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عقل کی رہنمائی کے لئے وحی الٰہی نازل کی تاکہ انسان ہر قسم کی لغزشوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہ کر جادۂ صواب پر گامزن رہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہ اُٹھے کہ پھر عقل انسانی کا فائدہ کیا؟ جب زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل طور پر رہنمائی نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل خدا تعالیٰ کی ایک بڑی عنایت اور نعمت ہے، جس طرح خدا کے عطا کردہ دوسرے حواس مثلاً قوتِ سامعہ، قوتِ لامسہ، قوتِ ذائقہ، قوتِ باصرہ نعمائے عظمیٰ ہیں اس طرح عقل انسانی بھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی حواس ایک حد کے اندر محدود ہیں۔ انسان کی آنکھ ایک حد تک دیکھ سکتی ہے جو چیز اس کی حد سے باہر ہوگی اس کو دیکھ نہیں سکے گی اور اگر اس حالت میں وہ کوئی فیصلہ صادر کرے گی تو غلطی کا قوی امکان ہے اسی طرح کان ایک حد تک سُن سکتے ہیں۔ اگر اس کی حد سے باہر کی آواز کو سُننے کی کوشش کریں تو وہاں بھی غلطی کا امکان ہے اور کان ٹھوکر کھا جائیں گے۔ اس طرح زندگی کے تمام امور کا احاطہ عقل نہیں کر سکتی اس لئے انسانی زندگی کو بہتر بنانے اور گزارنے کے لئے وحی الٰہی کا عقل کی دست گیری کرنا لازمی اور لابدی ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کی عادت مستمرہ ہے کہ ظاہری حواس کی استعدادوں اور قوتوں کو بڑھانے کے لئے خارج میں سامان پیدا کیا ہے۔ مثلاً آنکھ کی استعداد کو بڑھانے کے لئے سورج پیدا کیا ہے۔ قوت سامعہ کے لئے ہوا پیدا کی ہے۔ قوتِ ذائقہ کے لئے قسم قسم کے کھانے پیدا کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عادت مستمرہ کے مطابق عقل کے لئے وحی الٰہی کی روشنی نازل کی تاکہ اس روشنی کی مدد سے عقل اپنے پیچیدہ مسائل حل کر سکے۔ لغزشوں سے بچ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی کے ذریعے مادی تمدن کے ان تمام اصولوں کو رد کر دیا جو انسانی وقار کے خلاف تھے اور ان اصولوں کو قائم کیا جو انسانیت کی سماجی، سیاسی اور وطنی اصلاح اور بہبود کے لئے ضروری تھے جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

تمدن کے ارتقائی منازل

۱۔ **وحشی پن:** وحشی پن کے اس پہلے دور میں تین مراحل پائے جاتے ہیں ان میں پہلا مرحلہ سب سے کم وحشی پن کا ہے۔ جو کہ نسل انسانی کی ابتداء سے شروع ہوتا ہے۔ انسان کے اس دور میں مچھلی پکڑنے اور آگ کے استعمال کا طریقہ سیکھا ان چیزوں کے حصول سے دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ انسان نے تیر اور کمان ایجاد نہ کر لی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی انسان نے وحشی پن کے تیسرے اور اعلیٰ درجہ میں قدم رکھا۔

۲۔ **بربریت**: بربریت کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ انسان نے مٹی کے برتن وغیرہ بنانے کا فن ایجاد کیا۔ یہ بربریت کا سب سے نچلا درجہ تھا۔ اس کے بعد جب انسان نے جانوروں کو گھریلو استعمال میں لانا شروع کیا اور اس کے علاوہ اینٹ اور پتھر سے گھر بنانے کا فن سیکھ لیا تو وہ بربریت کے دوسرے دور میں داخل ہو گیا۔ جانوروں کو استعمال میں لانے سے نہ صرف انسان کی خوراک میں اضافہ ہوا بلکہ اب انسانی طاقت کو حیوانی طاقت سے تقویت بھی پہنچی جو ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

بربریت کے تیسرے دور میں انسان نے کچی دھات کو صاف کرنا سیکھا لوہے سے اوزار بنانے سیکھے اور انہیں استعمال کرنے کا علم بھی حاصل کر لیا۔

۳۔ **تہذیب**: صوتی حروف تہجی کی ایجاد سے انسان نے مہذب دور میں قدم رکھا۔ اس دور میں قبائلی رشتوں پر قائم کردہ حکومت کے بجائے علاقہ اور املاک پر مبنی حکومت کی ابتدا ہوئی۔

تہذیبی عہد کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے وہ عہد جو بادشاہت کا دور کہلاتا ہے دوسرا دور وہ ہے جس کو جمہوری اور شورائی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس دور کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں سلطنت کی بنیاد رکھی۔

تہذیب

عام بول چال میں ثقافت اور تہذیب کے الفاظ ہم معنی اور مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن علمی اصطلاح میں دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ عربی لغت میں تہذیب کے معنی ہیں۔

۱۔ کسی درخت، مضمون یا مسودہ قانون وغیرہ کی کاٹ چھانٹ کرنا۔

۲۔ نقائص سے پاک صاف کرنا۔ ٹیڑھ پن نکال دینا یا اصلاح کرنا ۳۔ تعلیم دینا، رہنمائی کرنا۔

۴۔ کلچر۔ ۵۔ تنقیح[1]

عرب بولتے ہیں۔ ھَذَّبَہٗ، اَصْلَحَہٗ اس کی تہذیب کی یعنی اس کی اصلاح کی۔ اسے درست کیا، سنوارا۔

لیکن اصطلاح میں تہذیب کا لفظ ہر چیز کی درستگی اور اصلاح پر بولا جاتا ہے۔ یعنی ارادہ اور نیت کی درستگی، خیالات و جذبات کی درستگی، عادات و اطوار کی درستگی۔ رسم و رواج کی درستگی، نظامِ معاشرت کی درستگی، سیاست مدن کی درستگی اقتصادی اور معاشی امور یعنی لین دین، تجارت، زراعت، صنعت و حرفت

---

[1] القاموس العصری

کی درستگی، فنون لطیفہ کی درستگی، زبان اور ادب کی درستگی، روحانی اور فکری قوتوں کی درستگی غرض کہ زندگی کے تمام شعبوں میں درستگی اور اصلاح کرنا "تہذیب" ہے۔

سرسید تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے پرچہ کی پہلی اشاعت (۱۸۷۰ء) میں لکھتے ہیں۔

"اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولزیشن (CIVILISATION) یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے (سویلائزڈ) مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوئے اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قومیں کہلائیں۔"

سولزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔[1]

تہذیب کی مزید تشریح کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں :-

"جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں۔ ان کی غذائیں، اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوتے ہیں۔ اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔"[2]

سرسید کے ان دونوں حوالوں سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ تہذیب کی روح اچھائی ہے۔

ثقافت، تمدن اور تہذیب میں فرق انسانی زندگی دو پہلوؤں پر مشتمل ہے، ایک مادی اور دوسرا روحانی، یہ دونوں اپنے اپنے مطالبات اور مقتضیات رکھتے ہیں۔ جب ایک انسان مادی زندگی کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے کوشاں ہوتا ہے تو تمدن وجود میں آتا ہے اور جب انسانی لطیف جذبات، احساسات، ذہن اور روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ذرائع اور وسائل عمل میں لاتا ہے تو ثقافت وجود میں آتی ہے۔ مثلاً ایک فلسفی کے افکار، شاعر کے اشعار، موسیقار کے نغمات

---

[1] منقول از دبستان تاریخ اردو مصنفہ حامد حسن قادری کراچی ۱۹۶۶ء صہ ۳۲۴

[2] مقالات سرسید جلد ۶ صفحہ ۳ لاہور ۱۹۶۲ء

سب ایک انسان کے داخلی احساسات اور کیفیات کا آئینہ دار ہیں۔ گویا تمدن خارجی امور کا مظہر ہوتا ہے اور ثقافت باطنی کیفیات کا مظہر۔

الندوۃ العالمیہ للاسلامیات کے مقالہ نگاروں میں ایم۔ زیڈ صدیقی کلچر اور تمدن کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ثقافت کی اصطلاح فکری ارتقا پر دلالت کرتی ہے جب کہ تمدن معاشرتی ترقی کے بلند درجہ کو ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا ثقافت ذہنی کیفیت کو بیان کرتی ہے اور تمدن اس کے مادی مظہر کی نمائندگی کرتا ہے۔ پہلی کا تعلق فکری عمل سے ہے اور دوسرے کا مادی اکتسابات سے۔ پہلی ایک داخلی کیفیت ہے جب کہ دوسرا خارجی دنیا میں اس کی عملیت کا نام ہے۔"[۱]

فیضی لکھتا ہے :

"کلچر باطنی روح کا نام ہے جب کہ تمدن خارجی مظہر ہے۔"[۲]

خارجی مظاہر میں درستگی اور اصلاح تہذیب کہلاتی ہے۔ جس طرح ایک بیج سے پودا نکلتا ہے۔ اس پودے کی صحیح نشوونما کے لئے مالی اس پودے کی زائد ٹہنیاں اور خشک پتے کاٹ دیتا ہے، تاکہ پودا صحیح نشوونما پا سکے اور اس کی خوبصورتی بھی قائم رہے۔ اس طرح تمدن کے پودے کی صحیح نشوونما کے لئے خارجی مظاہر کی اصلاح اور درستگی کی جاتی ہے۔ یہی اصلاح درستگی اور تہذیب ہے۔

تہذیب کے عناصر ترکیبی

تہذیب اور اس کی حقیقی روح کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے عناصر ترکیبی کا جائزہ لیا جائے یہ عناصر پانچ ہیں۔

پہلا عنصر: کسی تہذیب کا پہلا عنصر یہ ہے کہ اس کا دنیوی زندگی کے متعلق کیا تصور ہے، وہ اس دنیا میں انسان کو کیا مقام دیتی ہے کائنات اور انسان کا باہمی کیا تعلق ہے۔

دوسرا عنصر: انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے اور وہ کونسی منزل ہے جس کے لئے انسان کو کوشش کرنی چاہیئے۔

تیسرا عنصر: اس تہذیب کی بنیاد کن عقائد اور افکار پر ہے وہ افکار اور عقائد انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

۱۔ International Colloqium Pape P. 26

۲۔ Islamic Culture P. 20

چوتھا عنصر: وہ تہذیب سوسائٹی کے افراد کو کن کن اخلاق کا حامل بنانا چاہتی ہے اور کن کن اخلاق سے بچنے کی ہدایت کرتی ہے۔

پانچواں عنصر: اس تہذیب کا اجتماعی نظام کیا ہے۔ اجتماعی نظام ایک فرد کی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔

پہلا عنصر انسان کا مقام اور اس کا تعلق کائنات سے: اسلام جس تہذیب کا علمبردار ہے اس میں انسان کو ایسا ارفع مقام دیتا ہے جو کسی دوسری تہذیب نے نہیں دیا۔ عیسائیت انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دیتی ہے اور وہ اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کفارہ پر ایمان نہ لائے۔ عیسائیت کی آغوش میں جو بھی تہذیب پرورش پائے گی۔ اس میں انسان ایک گھٹیا مقام پر کھڑا ہوگا۔

ہندو مت ذات پات کا قائل ہے۔ اور شودر کو سوسائٹی میں وہ حق دینے کو تیار نہیں جو برہمن کو حاصل ہے۔ اس ذات پات کے بطن سے جو بھی تہذیب جنم لے گی۔ وہ نسلِ انسانی میں پیدائشی تفریق پیدا کر دے گی اور مساوات محبت اتحاد اور رواداری کو ختم کر دے گی۔

پھر کوئی مذہب بھی کائنات کو انسان کو خادم قرار نہیں دیتا بلکہ انسان کو کائنات کے مختلف عناصر کے سامنے سرنگوں ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام نسل انسانی کو مقام تکریم پر کھڑا کرتا ہے، اور تفریق بین الناس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے کائنات کو خادم اور انسان کو مخدوم اور مالک قرار دیتا ہے۔

قرآن میں آتا ہے، وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ[1] یعنی ہم نے نوعِ انسانی کو قابلِ تکریم بنایا ہے۔ وجہ تکریم حسب نسب کو قرار نہیں دیا بلکہ تقویٰ کو قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[2] کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک مکرم وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے رسولِ کریم صلعم فرماتے ہیں: لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی[3] عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر تقویٰ کے سبب سے اس کرۂ ارضی میں سب چیزیں انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا[4] وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً[5] کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ

---

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰، [2] الحجرات ۴۹: ۱۳، [3] مسند احمد، [4] البقرہ ۲: ۲۹، [5] لقمان ۳۱: ۲۰-

نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا۔ یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی دوسری مخلوق کے سامنے جھکنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ خدا کے سوا کسی کے آگے جھکنا انسانیت کی ذلت ہے۔

دوسرا عنصر: انسانی زندگی کا مقصد: اسلام میں انسانی زندگی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ **یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ**[1] اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ**[2] کہ میں نے جن اور انسان اس لئے پیدا کئے ہیں تاکہ وہ میری عبادت کریں دینِ اسلام میں عبادت چند الفاظ اور حرکات کا نام نہیں یہ لفظ اپنے اندر ایک وسیع مفہوم لئے ہوئے ہے اللہ تعالیٰ ہمارے چند تعریفی کلمات کا محتاج نہیں ہے نہ ہی اس کے حضور باادب کھڑے ہونے رکوع کرنے، سجدہ کرنے سے اس کی شان میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ وہ خالق ہے ہم مخلوق اس وجہ سے ہم ہر لحاظ سے اس کے محتاج ہیں اس کے فضل کے بغیر دنیا کی کوئی چیز بقیدِ حیات نہیں رہ سکتی۔ وہ ہمارے ہر عمل سے مستغنی ہے کیونکہ وہ صمد ہے اسلام میں اللہ کی عبادت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرے۔ جب انسان خدا کی تعلیم کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لے گا تو وہ حقیقی معنی میں اس کا عبد بن جائے گا۔

تیسرا عنصر: بنیادی عقائد اور افکار: اسلامی تہذیب کے بنیادی عقائد اور افکار پانچ ہیں۔

۱۔ اللہ پر ایمان

۲۔ ملائکہ پر ایمان

۳۔ آسمانی کتب پر ایمان

۴۔ اللہ کے رسولوں پر ایمان

۵۔ آخرت پر ایمان

اللہ پر ایمان: ارشادِ الٰہی ہے، **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ**[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ پر ایمان لاؤ۔ اللہ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام خوبیوں کا جامع اور تمام عیوب سے منزّہ سمجھنا اور اس کی تعلیم کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ہے۔

ملائکہ پر ایمان: ارشادِ الٰہی ہے: **وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ**[4]

---

[1] بقرہ ۲: ۲۱ [2] الذاریات ۵۱: ۵۶ [3] نساء ۴: ۱۳۶ [4] نساء ۴: ۱۳۶۔

جو اللہ اور اس کے فرشتوں کا انکار کرے۔ ملائکہ ملک کی جمع ہے جس کے معنی فرشتہ ہیں یہ لفظ ألک سے مشتق ہے جس کے معنی رسالت ہیں۔ ملائکہ وہ خارجی ہستیاں ہیں جو ہماری جسمانی اور روحانی ربوبیت کے لئے پیدا کی گئی ہیں کائنات میں سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، بادل وغیرہ تمام عناصر جو انسان کے لئے کام کرتے نظر آرہے ہیں درپردہ یہ ملائکہ کے کام ہیں۔ ملائکہ نسلِ انسانی کی روحانی ربوبیت کے لئے وحی لانے کے وسائط ہیں[۲] مومنین کی مدد کے لئے اور ان کے دشمنوں کے خلاف بھیجے جاتے ہیں[۳] مومنوں اور غیر مومنوں سب کے لئے دعائے مغفرت مانگتے ہیں[۴] مومنوں کی روح قبض کرتے ہیں[۵] غیر مومنوں کی بھی[۶] لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں[۷] قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت کریں گے[۸] اعمالِ صالح کے لئے تحریکات کرتے ہیں۔ ملائکہ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ ہر نیکی کی تحریک جو ملائکہ کی طرف سے ہوتی ہے اس پر عمل کرنے میں کبھی سستی سے کام نہ لیا جائے اور فوراً اس پر عمل کیا جائے کیونکہ ملائکہ انسان میں روحانی زندگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

کتب سماوی پر ایمان: کتب سماوی سے مراد وہ تمام آسمانی کتب ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیا علیہم السلام پر لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوتی رہی ہیں ان کتب پر ایمان لانے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے۔ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ[۹]۔ اور اس کتاب پر ایمان لائے جو اس نے اپنے رسولؐ پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ[۱۰] جو اس پر ایمان لائے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ تمام کتب سماوی پر ایمان لانا مسلمانوں کے مذہب کا اصول ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کی جسمانی ربوبیت کے لئے خوراک اور دوسری اشیا پیدا کی ہیں اس طرح روحانی و اخلاقی ترقی کے لئے روحانی خوراک سے متمتع کیا ہے۔ ہر قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام بھیجے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر وحی نبوت یعنی کتاب نازل فرمائی ہے، ارشادِ الٰہی ہے: وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (۲ / ۲۱۳) اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری، کتب سماوی پر ایمان لانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کی حامل ہوتی ہیں جن پر عمل کر کے انسان اپنی انفرادی اور دینی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے کتب سماوی کی تکمیل قرآن مجید کی شکل میں ہو گئی۔ جیسا کہ قرآن مجید کا دعویٰ ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا[۱۱] آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل

---

[۱] النساء ۴: ۱۳۶ [۲] ۲: ۹۷، ۱۴: ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵ [۳] ۴۲: ۵ [۴] ۱۶: ۳۲ [۵] ۶: ۹۳، ۴: ۹۷ [۶] ۲۸: ۱۶

[۷] ۸۲: ۱۰-۱۲ [۸] ۵۳: ۲۶ [۹] ۴: ۱۳۶ [۱۰] ۲: ۴ [۱۱] المائدہ ۵: ۳-

کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے، اور تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوا ہوں۔
دوسری جگہ آتا ہے: فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔ یعنی قرآن مجید تمام کتب سماوی کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اب بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے قرآن ہی کافی ہے۔

انبیا علیہم السلام پر ایمان: قرآن مجید میں آتا ہے: كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ (۲: ۲۸۵) وہ سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ وہ مقدس اور مطہر ہستیاں ہیں جن کے دلوں پر جبریل علیہ السلام اللہ کے احکام لے کر اترتا رہا۔ پھر یہ ہستیاں ان احکام پر خود عمل کر کے لوگوں کے لئے عملی نمونہ بنتی رہیں وہی نمونہ متبعین کی راہنمائی کا موجب ہے۔ اسلامی نظریہ کی رو سے ہر قوم کی طرف نبی آتے رہے ہیں جیساکہ ارشاد الٰہی ہے: وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ[1] اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی مشیت نے یہ چاہا کہ انبیا کی تمام متفرق اقوام کو وحدت کی لڑی میں منسلک کرے تو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ[2] اور ہم نے تجھے تمام قوموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے دوسری جگہ آتا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا[3] اور ہم نے تجھے لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے تمام مدارج ختم ہو چکے تھے اس وجہ سے آپ کے بعد کسی قسم کا نبی نہیں آسکتا ارشاد الٰہی ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا[4] محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ختم نبوت کا مقصد نسل انسانی میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔

قرآن مجید میں رسول کے آنے کی اغراض ایک آیت میں جمع کر دی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:-
ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم ایتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ[5] تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

---

[1] فاطر ۳۵ : ۲۴ [2] الانبیاء ۲۱ : ۱۰۷ [3] سبا ۳۴ : ۲۸ [4] الاحزاب ۳۳ : ۴۰
[5] البقرہ ۲ : ۱۵۱۔

قیامت پر ایمان: قرآن مجید میں آتا ہے: وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ [۱]
اور آخرت پر وہ ایمان رکھتے ہیں دوسری جگہ آتا ہے:

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ [۲] جو کوئی بھی اللہ اور پیچھے آنے والے دن پر ایمان لاتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے تو اُن کے لئے ان کا بدلہ اپنے رب کے ہاں ہے۔

بعث بعد الموت پر ایمان لانے سے انسان کے اندر نیکی کا جذبہ اُبھرتا ہے اور بدی سے نفرت پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس کو احکم الحاکمین کے سامنے موت کے بعد حاضر ہونے کا یقین ہوتا ہے یہ فطری اصول ہے کہ انسان کو جہاں خوشی اور راحت پہنچتی ہے وہاں خوشی سے جاتا ہے جہاں دُکھ اور تکلیف پہنچتی ہے وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔ جنت آرام اور خوشیوں کی جگہ ہے اور جہنم دکھ اور تکلیف کی جگہ ہے جب انسان جنت اور دوزخ کا قائل ہوگا تو وہ لازمی طور پر جنت کے حصول کی کوشش کرے گا تاکہ وہ آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

چوتھا عنصر اخلاق: اخلاق فاضلہ وہ اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقتضیات ہوں اور جو صفات الٰہیہ کی مقتضیات کے برعکس ہوں وہ اخلاق رذیلہ ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً [۳] اللہ کا رنگ اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے۔

اسلام میں اخلاق کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ رسول کریم صلعم کی بعثت کی اغراض میں سے ایک غرض اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے: يُزَكِّيْهِمْ [۴] وہ انہیں پاک کرتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ [۵] پھر فرماتے ہیں: اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا [۶] مومنوں میں سے ایمان کے لحاظ سے کامل وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔

پانچواں عنصر: اسلامی تہذیب کا پانچواں ترکیبی عنصر اس کا اجتماعی نظام ہے جو ایک فرد کی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی پر پھیلا ہوا ہے قرآن مجید میں آتا ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ [۷] بنی نوع انسان کی ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کتاب میں بیان نہ ہوئی ہو اس وجہ سے اسلام اکمل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے: ارشادِ الٰہی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [۸]
آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارا دین اسلام ہونے پر راضی ہوا ہوں۔

اسلامی تہذیب کا اجتماعی نظام معاشرت، تقسیم دولت اور ریاست پر مشتمل ہے اس کتاب کا

---

[۱] البقرہ ۲:۴ [۲] البقرہ ۲:۶۲ [۳] البقرہ ۲:۱۳۸
[۴] جمعہ ۶۲:۲ [۵] کنز العمال جلد ۵ [۶] ترمذی [۷] المائدہ ۵:۲

موضوع ہی اسلام کا اجتماعی نظام بیان کرنا ہے اس وجہ سے ان موضوعات پر بحث اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ آئے گی۔

اسلامی تہذیب کی رُوح

اسلامی تہذیب کی روح توحید ہے۔ اسلام میں توحید کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات صفات اور اعمال میں ایک ماننا اور تمام خوبیوں کا جامع اور تمام عیوب سے مبرا تسلیم کرنا ہے، توحید کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر مسئلہ توحید کو مختلف پیرایوں میں قرآن مجید میں بیشمار مقامات پر دہرایا ہے قرآن مجید کا کوئی صفحہ نہیں ہے جہاں اس تو پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ تمام علمائے اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ توحید ہی تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق قرآنی تعلیمات کا محور ہے اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ایک پوری سورت نازل ہوئی ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ [1]

کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں اس مختصر سی سورت میں توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے تمام دلائل دے دیئے ہیں۔

توحید تین امور کو ظاہر کرتی ہے۔

اوّل: اللہ تعالےٰ اور انسان کا باہمی تعلق۔

دوم: انسانوں کا باہمی تعلق۔

سوم: انسان کا دوسری مخلوقات سے تعلق۔

امرِ اوّل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اور اسی کی عبادت میں حقیقی خوشی محسوس کرے اس کے غیر کے تمام بتوں سے اپنے دل کو صاف رکھے۔ قرآن مجید نے اس تعلق کو مختلف رنگوں میں بیان کیا ہے ارشادِ الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ [2] لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ [3]

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ [4]

میں نے جن اور انس اس لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ میری عبادت کریں۔

توحید کی ضد شرک ہے قرآن مجید نے اس کو بھی براہین قاطعہ سے باطل کیا ہے اور تمام گناہوں سے

---

[1] سورۃ اخلاص [2] بقرہ ۲: ۲۱ [3] فاتحہ ۱: ۵ [4] الذاریات ۵۱: ۵۶۔

بدترین گناہ قرار دیا ہے ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ[1] شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔

شرک کو اس وجہ سے بدترین گناہ قرار دیا ہے کہ وہ مانع تہذیب ہے جب انسان ماسوا اللہ کی پرستش کرتا ہے تو وہ سب علمی تحقیقات کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

جب انسان حجر، شجر، شمس و قمر اور دیگر مخلوقات کو اپنا معبود اور مطلوب بنا لیتا ہے تو ان کو مسخر کرنے اور ان سے خدمت لینے کی تمام راہیں مسدود کر لیتا ہے یہی وجہ ہے اسلام سے قبل مادی علوم میں کوئی ترقی نہ ہوئی اس وجہ سے اسلام نے شرک کی ہر قسم کو باطل قرار دیا ہے تاکہ یہ انسان ماسوا اللہ کی زنجیروں سے آزاد ہو کر تہذیب کے میدان میں ترقی کرے قرآن مجید نے شرک کی مختلف صورتوں کو سورۃ آلِ عمران کی آیت ۶۴ میں اکٹھا کر دیا ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

پس اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان تعلق عبودیت کا ہے۔ عبودیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان احکام الٰہی کا کامل فرمانبرداری کرے۔ جب ایک انسان اللہ تعالیٰ کا ہی حقیقی بندہ بن جاتا ہے تو انسان کی مخفی استعدادیں ترقی کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ نیکیوں سے محبت اور بدیوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول کریم صلعم کی بعثت سے قبل تمام عرب شرک میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کی برائی پائی جاتی تھی۔ جونہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا نعرہ بلند کیا اور لوگوں نے ایمان لانا شروع کیا تو ان میں ایک روحانی انقلاب رونما ہو گیا وہی لوگ جو بتوں کی پوجا کرتے تھے اور ہر قسم کی برائیوں کی آلودگیوں میں ملوث تھے۔ وہی لوگ نیکی کے راستہ پر قدم مارنے لگے۔ اور برائیوں سے نفرت کرنے لگے۔

امر دوم: توحید الٰہیہ نسل انسانی کے اتحاد کی متقاضی ہے نسل انسانی کی وحدت پر جو توحید کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً[2] سب لوگ ایک ہی قوم ہیں۔ پھر فرمایا: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً[3] سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں۔

امر سوم: توحید انسان کو یہ سبق دیتی ہے کہ وہ کائنات کو اپنا خادم سمجھے، یہی وہ تصور ہے جس نے مادی ترقی کے راستے کھولے ہیں ایک وقت تھا جب دنیا نے کائنات اور اس کے عناصر کو اپنا معبود سمجھا تھا۔ اس عناصر پرستی کی وجہ سے انسان کے دل میں یہ کبھی بھی خیال نہیں آ سکتا تھا کہ کائنات

---

[1] لقمان ۳۱: ۱۳ [2] البقرہ ۲: ۲۱۳ [3] یونس ۱۰: ۱۹۔

اور اس کے عناصر اس کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ جب تک کائنات اور اس کے عناصر معبود اور مطلوب بنے رہے تو انسان نے ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیق نہیں کی۔ جب اسلام نے توحید کا پیغام سنایا عناصر کی پرستش کی زنجیروں سے نجات دلائی اور یہ سبق دیا۔ سورج، چاند، ستارے، دریا سمندر، آگ، ہوا، پانی، غرض کہ یہ دنیا کی ہر چیز تمہاری خادم ہے اور تم ان کے مخدوم تب انسان نے ان کو مسخر کرنے کی طرف توجہ کی۔ سائنٹیفک تحقیقات کے دروازے کھلے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام کے آنے سے ہی علوم جدیدہ اور سائنس کی ترقی ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً [1] کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو پورا کیا ہے۔

بس قرآنی توحید نے ہی انسان کو علمی تحقیق کی طرف توجہ دلائی ہے اگر علماء کی آراء و افکار کا جائزہ لیا جائے تو یہی تین امور جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے سامنے آتے ہیں جن کو حکماء نے اصول تہذیب ٹھہرایا ہے۔

مشہور فلاسفر کینٹ Kant نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "تہذیب انسانی اس وقت کمال کو پہنچے گی جب انسان خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرے گا[2]"

تہذیب اسلامی کی خصوصیات

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کی روح توحید ہے جو بھی تہذیب اسلامی کی خصوصیات بیان ہوں گی وہ دراصل توحید کے ہی ثمرات ہیں جو تہذیب اسلامی کے شجر کو لگتے ہیں۔

عظمت انسان: اسلامی تہذیب کا درخشندہ پہلو عظمت انسان ہے یہ وہ پہلو ہے جو دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ ہندوؤں نے ذات پات کے مسئلے سے انسانوں کو عظمت کے لحاظ سے تقسیم کر دیا ہے۔ شودر بقیہ تین ذاتوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے ہندو تہذیب میں شودر کی حیثیت ایک گری پڑی شے سے زیادہ نہیں۔ عیسائیت نے تو انسان کو پیدائشی گنہگار قرار دے کر ذلت کا طوق اس کی گردن میں پہنا دیا ہے۔

اسلام نے جو عظمت انسان کا تصور دیا ہے وہ دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں ملتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰہُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰہُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰہُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا [3]

[1] لقمان ۳۱: ۲۰ [2] تمدن اسلام حصہ اول مصنفہ خواجہ کمال الدین [3] بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰

اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے بڑی فضیلت دی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ [۱] اور اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ [۲] یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ [۳]

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے اللہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے تاکہ اس کی صفات کا کلی طور پر اظہار کرے۔ خدا کا نائب ہونے کا تصور دنیا کی کسی کتاب نے نہیں دیا۔ خدا کی نیابت میں انسان کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً [۴]

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

رسول کریم صلعم نے فرمایا: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ [۵] اللہ نے آدم کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ اسلام نے انسان کی اس عظمت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دی، یہ تعلیم دی ہے کہ ہر انسان ایک دوسرے کی عزت و تکریم کرے اور محبت سے پیش آئے۔ رسول کریم صلعم نے فرمایا: الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ [۶] ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ بھلائی کرتا ہے۔

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام کیا ہے التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی عیال اللہ [۷] اللہ کے احکام کی تعظیم کرو اور اللہ کی مخلوق سے محبت رکھو۔

مساوات: اسلامی تہذیب مساوات کا سبق دیتی ہے اور مسئلہ ذات پات کو جڑ سے کاٹتی ہے۔ پامال شدہ لوگوں کو اٹھا کر بڑوں کے دوش بدوش کھڑا کرتی ہے۔ اس تہذیب کا عملی سبق نماز اور حج کے موقع پر ملتا ہے۔ مسجد میں پانچ دفعہ نماز کے وقت لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک امام کے پیچھے امیر غریب، شاہ و گدا، چھوٹا بڑا صف باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے امتیازات مٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح حج کے موقع پر دنیا کے ہر کونے سے مسلمان مکہ میں جمع ہوتے ہیں اور ایک ہی لباس میں ملبوس ہو کر مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ گورے کالے کی تمیز مٹ

---

[۱] الاعراف ۷: ۱۴۰ [۲] التین ۹۵: ۴ [۳] البقرہ ۲: ۳۴ [۴] البقرہ ۲: ۳۰۔
[۵] مشکوٰۃ المصابیح کتاب الادب ص۳۹۶ [۶] بیہقی کتاب الایمان [۷] بیہقی کتاب الایمان۔

جاتی ہے۔غریب اور امیر کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے ہر قسم کا طبقہ بغیر کسی امتیاز کے مناسک حج ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مساوات کا اس قسم کا نظارہ دنیا کے کسی اجتماع میں نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید میں مساوات انسانی کا سبق ان الفاظ میں دیا ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ[۱]

اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اللہ جاننے والا باخبر دار ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ جس میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی[۲] لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی نفیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اسلام نے سب سے پہلے دنیا میں مساوات کا زریں سبق دیا۔ اسی سبق سے رنگ ملک و قوم کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ دنیا میں حقیقی تہذیب قائم ہونے میں یہی تفرقات روک بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ تفرقات مٹ جائیں تو حقیقی تہذیب دنیا میں قائم ہو سکتی ہے۔

اخوت اور اتحاد: اسلام ہی وہ دین ہے جس نے وحدتِ انسانی کی تعلیم دی ہے۔ اسلام سے قبل انسانیت ملکی۔ قومی۔ لونی۔ لسانی۔ نسبی تعصبات اور تفریقات میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر قوم دوسری قوم کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی اور ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھی۔ اسلام نے یہ نعرہ بلند کیا کہ کل روئے زمین کے انسان ایک ہی اصل سے ہیں اس نعرہ نے تعصبات اور تفریقات کی زنجیروں کو کاٹا۔ اتحاد اور اخوت کی لڑی میں منسلک کر دیا۔

ارشادِ الٰہی ہے: یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً[۳]

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا[۴] اور سب لوگ

---

[۱] الحجرات ۴۹ : ۱۳ [۲] مسند احمد [۳] نساء ۴: ۱ [۴] یونس ۱۰ : ۱۹۔

ایک ہی گروہ کے ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ [۱] مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں، اللّٰھم ربنا و رب کل شیئٍ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ [۲] اے اللہ ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں تری المؤمنین فی تراحمھم وتوادھم وتعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکی عضو تداعی لہ سائر جسدہ بالسھر والحمی [۳] تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور بیماری میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں۔

المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا ثم شبک بین اصابعہ [۴] مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسا کہ عمارت کا ایک جزو دوسرے جزو کو قوت دیتا ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی

رواداری

اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ مذہبی رواداری کی علمبردار ہے۔ وہ ہر ایک سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہر مذہبی کتاب اور ہر پیغمبر کو مانا جائے اور ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے ارشادِ الٰہی ہے، مَن آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ [۵] جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ [۶] کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ [۷] رسولؐ اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ

---

[۱] الحجرات ۴۹ : ۱۰ [۲] احمد ۔ ابوداؤد [۳] بخاری کتاب الادب [۴] بخاری کتاب الادب [۵] البقرہ

اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، ہم ان کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔

اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ قوت اور طاقت سے دین کی اشاعت کی جائے۔ اور لوگوں کو جبراً دین منوایا جائے۔ دین کا اختیار کرنا لوگوں کی رضا و رغبت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسلام محض مذہبی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ[1] کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔

اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (یونس ۱۰: ۹۹) کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن بن جائیں۔

اسلام تمام ادیان کی عبادت گاہوں کو قابلِ احترام سمجھتا ہے اور ان کی حفاظت اور مدافعت کی تعلیم دیتا ہے ارشادِ الٰہی ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ کَثِیْرًا[2] اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرا دی جائیں۔ اسلامی تہذیب صرف جبر نہ کرنے اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنے ہی کی تعلیم نہیں دیتی بلکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے باطل عقائد کی بناء پر سبّ و شتم کی بھی اجازت نہیں دیتی، ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ[3] اور ان لوگوں کو گالی نہ دو جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے بے علمی سے اللہ کو گالی دیں۔

اسلام محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے دوسروں سے نیکی اور صلۂ رحمی میں حائل ہونے سے منع کرتا ہے، اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ مسطح جو حضرت ابوبکرؓ کی خالہ یا ہمشیرہ کا بیٹا تھا تشہیرِ افک میں ملوّث تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اس کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ افک میں ملوّث ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے امداد کرنا چھوڑ دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا[4] اور تم میں سے بزرگی اور وسعت والے قسم نہ کھائیں کہ وہ غریبوں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے اور چاہیئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔

---

[1] البقرہ ۲: ۲۵۶ [2] الحج ۲۲: ۴۰ [3] الانعام ۶: ۱۰۸ [4] النور ۲۴: ۲۲ -

آزادی

انسان فطرتاً آزادی کا خواہشمند ہے۔ اور اگر کوئی فرد غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو تو اس کی روح آزادی کے لئے تڑپتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں اور ترقی کے راستوں کے چھوڑ دینے کی وجہ سے کسی قوم کی غلام بن جاتی ہے تو وہ قوم اپنی طبعی خواہش کی وجہ سے از سر نو آزادی کا سانس لینے کے لئے تگ و دو کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا کی اکثر جنگیں ہی حصولِ آزادی کے لئے لڑی گئی ہیں۔ انسان کے اس طبعی تقاضے کی وجہ سے اسلامی تہذیب حریت کا پیغام دیتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ [1] سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے کسی گردن کا آزاد کرنا۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان تہذیب و تمدن کی ارفع گھاٹی پر نہیں چڑھ سکتا۔ جب تک غلاموں کی آزادی کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔ حقیقی تہذیب اس وقت دنیا میں قائم ہو گی جب ہر فرد آزادی کی دولت سے متمتع ہو گا۔

رسولِ کریم صلعم فرماتے ہیں: شرار الناس الذین یشترون الناس ویبیعونھم [2] بُرے لوگ وہ ہیں جو انسان کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

ان من شرار الناس الذین یبیعون الناس [3] بہت بُرے وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

متٰی کم تعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا [4] تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا ہے۔

امنِ عالم

اسلامی تہذیب امنِ عالم کی زبردست حامی ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اسلامی تہذیب کا بنیادی پتھر توحید ہے، عقیدۂ توحید نفرت اور دشمنی کو ختم کرتا ہے، ہر قسم کے تعصبات کو مٹا دیتا ہے۔ انسانی عظمت، مساوات، اتحاد اخوت، مذہبی رواداری اور آزادی کو برقرار رکھتا ہے، جب دنیا میں دشمنی ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اخوت لے لے تو دنیا میں حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے، یہی دو اصول اسلامی تہذیب کے ہیں۔ ایک طرف دنیا سے دشمنی کو ختم کرتی ہے تو دوسری طرف انسانی عظمت اور اخوت کو فروغ دیتی ہے۔ اس طرح امنِ عالم کے لئے راستہ ہموار کرتی ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی تعریف یہ کی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان

---

[1] البلد ۹۰: ۱۱، ۱۳ [2] ترمذی، کنوز الحقائق [3] بخاری [4] احسن المحاضر جلد ۲ صفحہ ۱

اور ہاتھ سے دُوسرا مسلمان امن میں رہے۔ رسُولِ کریمؐ کی اس تعریف کے مطابق مسلمان اسلامی تہذیب کا نمونہ ہوتا ہے جس کے قول اور فعل سے نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہو سکتا۔

اعتدال اور میانہ روی

اسلامی تہذیب زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال پسندی کی تعلیم دیتی ہے اور افراط اور تفریط سے روکتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا [1] اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمّت وُسطیٰ بنایا۔ اُمتِ وسطیٰ سے مراد ایسا گروہ ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا [2] اور درمیان کی راہ اختیار کرو۔ نماز اسلام کی ایک عبادت ہے جس کو بارشادِ نبویؐ دین کا ستون کہا گیا ہے۔ اس میں بھی اعتدال سے کام لینے کی تعلیم دی گئی ہے، حضرت عثمان بن مظعونؓ نے جب راتیں نماز اور دن روزہ میں بسر کرنا شروع کیا تو رسولِ کریم صلعم نے ان کو روک دیا اور فرمایا تم پر اور بھی حقوق ہیں جن کو ادا کرنا ضروری ہے، حد سے زیادہ بڑھنے والوں کے متعلق فرمایا ہے:
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرہ ۲ : ۱۹۰) اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

صدقہ و خیرات بھی اسلامی عبادات کا اہم جز ہے، اس میں بھی اعتدال سے کام لینے کا حکم ہے ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا [3] اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے بندھا ہُوا نہ رکھ اور نہ اسے حد سے زیادہ کھول، ورنہ تو ملامت کیا ہُوا اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہے گا۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ماعال من قصد۔ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہُوا۔

دین اور دنیا کا امتزاج

اسلامی تہذیب دین اور دنیا کا حسین امتزاج ہے قرآن مجید میں آتا ہے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ [4] اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت پر بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اسلامی تہذیب ہی وہ تہذیب ہے جو دین کو ریاست سے جُدا نہیں کر سکتی اور ایک ایسا نظامِ سلطنت وضع کرتی ہے جو دین پر مرتکز ہے۔

---

[1] البقرہ ۲ : ۱۴۳ [2] بنی اسرائیل ۱۷ : ۱۱۰ [3] بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۹
[4] البقرہ ۲ : ۲۰۱۔

عدل و انصاف

اسلامی تہذیب عدل و انصاف پر بہت زور دیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ[1]

اللہ تمہیں عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی[2] اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قربی ہو۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ اور کسی قوم کی دشمنی اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو۔ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے، اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

رسول کریم صلعم نے فرمایا قیامت کے دن جب خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں سے ایک شخص امامِ عادل ہوگا[4]۔

ایک مرتبہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی، شہادتوں سے جرم ثابت ہوگیا رسول کریمؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ نے حضرت اسامہؓ کو سفارش کے لئے بھیجا۔ جب حضرت اسامہؓ نے اپنے مدعا کا اظہار کیا تو آپ غصہ میں آکر بولے تم سے پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ ان کا بڑا آدمی قصور کرتا تھا تو اس سے درگذر کرتی تھیں لیکن اگر چھوٹے آدمی سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تھا تو اُسے سخت سزا دیتی تھیں، تم فاطمہ مخزومیہ کی سفارش کر رہے ہو۔ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس جرم کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتا۔

اخلاقی اصول

اسلامی تہذیب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے پورے نظام میں اخلاقی اصولوں کو جگہ دی، برائی کا سرچشمہ دل ہے۔ دل میں بُرے خیالات جنم لیتے ہیں۔ پھر وہ جوارح کے ذریعے عملی جامہ پہنتے ہیں۔ قرآن مجید میں بُرے خیالات سے پاک رکھنے کے متعلق آتا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ[5] اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ اللہ اس کا حساب لے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ[6] اور کھلے اور چھپے

---

[1] نحل ۱۶ : ۹۰ [2] الانعام ۶ : ۱۵۲ [3] المائدہ ۵ : ۸ [4] بخاری [5] البقرہ ۲ : ۲۸۴
[6] الانعام ۶ : ۱۲۰ -

گناہ کو چھوڑ دو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ[1] بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں۔

اعضا کو برائیوں کی آگ سے بچانے کے لئے قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ[2] اے لوگو! جو ایمان لائے اپنے نفسوں کی برائی کی آگ سے حفاظت کرو۔

کسی تہذیب کا درخت برگ و بار نہیں لا سکتا۔ جب تک اس درخت کو اخلاق کا پانی نہ دیا جائے۔ جب کسی تہذیب میں بداخلاقی اور بدکرداری جگہ لے لیتی ہے تو وہ تہذیب مٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جتنی تہذیبیں گذر چکی ہیں اگر ان کے مٹنے کی وجوہ معلوم کریں تو یہ وجہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان تہذیبوں میں بداخلاقی نے جگہ لے لی تھی۔

عالمگیریت

اسلامی تہذیب عالمگیر تہذیب ہے، اس کے بنیادی اصول تمام نسل انسانی کے لئے ہیں۔ اسلام سے قبل کسی مذہب نے بھی عالمگیر تہذیب کی بنیاد نہیں ڈالی۔ ہندوؤں کا یہ ایمان ہے کہ برہما صرف ان کی قوم کا خدا ہے اور وہی اس کی چہیتی قوم ہے، ہندوستان سے باہر جتنی قومیں بستی ہیں وہ سب کی سب ناپاک ہیں ان کے چھو جانے سے ان کی ہر چیز ناپاک ہو جاتی ہے، غیر ہندو ہندوؤں کے برتن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ہندو قوم صرف غیر ملک کے رہنے والوں سے ہی نفرت نہیں کرتے بلکہ ہندوستان میں دس کروڑ اچھوت رہ رہے ہیں ان کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہودی قوم کا بھی یہ نظریہ ہے، یہوہ صرف ان کا ہی خدا ہے اور وہ اس کی محبوب ترین قوم ہیں۔ نجات صرف یہودیوں کے لئے ہے۔

قرآن مجید نے ان کے تعصبات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدہ ۵: ۱۸) یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ (آل عمران ۳: ۷۳) صرف اسی شخص پہ ایمان لاؤ جو تمہارے دین کا پیروکار ہے جو تمہارے دین کے سوا اور کوئی عقیدہ رکھتا ہو اس کی بات پر کان نہ دھرو۔ اور آسمانی کتب انہی کے لئے نازل ہوئی ہیں۔

---

[1] الانعام ۶: ۱۵۱۔

[2] مائدہ ۵: ۱۰۵۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر ہیں۔ انہوں نے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہیں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (متی ۱۵/۲۴) اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا (متی باب ۱۰ ص۵) فرمایا "نجات صرف یہودیوں کے لئے ہے" (یوحنا ۴/۲۲)

پس ہندو۔ یہودی اور عیسائی تہذیب صرف قومی تہذیب ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے ایک عالمگیر تہذیب کی بنیاد ڈالی فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، یعنی اسلام کا خدا صرف مسلمانوں کا ہی خدا نہیں بلکہ تمام دنیا کی اقوام کا پروردگار ہے: رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا (مزمل ۳، ۹) یعنی اسلام کا خدا اہلِ مشرق کی تربیت ونشوونما کرتا ہے اور اہلِ مغرب کا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی اور دوسرا خالق" اور ربوبیت کرنے والا نہیں۔ اُسی کو اپنا کارساز بنانا چاہیئے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: هُدًى لِّلنَّاسِ (بقرہ ۲: ۱۸۵) یعنی تمام روئے زمین کے لوگوں کے لئے ہدایت ہے، ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (القلم ۶۸: ۵۲) یعنی تمام جہانوں کے لئے نصیحت۔

رسول کریمؐ کے متعلق ارشاد ہے، رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی تمام جہانوں کے لئے رحمت کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

غرضیکہ اسلام ہی ایک ایسی عالمگیر تہذیب کی بنیاد ڈالتا ہے جس کے اندر شانِ عالمگیریت پائی جاتی ہے۔

معاشرتی ادارے

علمائے عمرانیات نے معاشرے کو اداروں پر منقسم کیا ہے۔ اور ان کے نزدیک ان اداروں کے عمل سے ہی معاشرتی زندگی کا تعین ہوتا ہے۔ معاشرتی استحکام اس کی ترقی اور منزل کا علم بھی انہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

مفکرین نے ادارے کی مختلف تعریفیں کی ہیں چند مشہور تعریفیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ لسٹر ایف وارڈ Lester F. Ward کے نزدیک ادارت معاشرتی قوت کے ضبط اور استفادہ کے ذریعہ ہیں۔

۲۔ ای۔اے۔ راس E. A. Ross کے ہاں ادارت نام ہے۔ اس جمعیت یا تعلق کا جسے معاشرہ نے منظور کیا ہے۔

۳۔ جائس، او، ہرٹزلر ZOYSE. O. HERTZLER نے اپنی کتاب سوشل انسٹی ٹیوشن میں ادارہ کو اس طرح بیان کیا یہ ایک خوبصورت طور پر متعین رشتہ ہے۔ اور عام حالت میں منظور شدہ تعلقات ہیں جو ایک جماعت کے افراد میں ایک دوسرے کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

۴۔ ایل، ٹی ہا بہاؤس L. T. Hab House کی زبان میں معاشرتی زندگی کا مکمل یا کچھ حصہ ان ذرائعہ کا ہے۔ جو مستحکم اور مقبول ہوتے ہیں۔

۵۔ ای۔ سی۔ ہیز E. C. Hays کی نظر میں ادارت افعال کا ایسا مجموعہ ہے جنہیں معاشرہ سوچ سمجھ کر تسلیم کردہ ضابطہ کی حیثیت سے اختیار کرتا ہے۔ تاکہ ادارہ کے منظور کردہ نتائج حاصل کئے جائیں۔

۶۔ سی۔ اے۔ ایل۔ وڈ C. A. Ell Wood نے ادارت کی یہ تعریف کی ہے، وہ معاشرتی افعال جو مرتب و منظم ہیں

۷۔ رابرٹ۔ میک ایور Rabert M. Maclver کے خیال میں ادارت سے مراد، گروہی عمل کی باضابطہ خصلت (خصوصیت)، کی منظم صورت یا حالت ہے [۱]

آغاز وارتقاء

جب انسان نے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا اور اجتماعی ضروریات بڑھتی گئیں، معاشرتی ادارے

---

[۱] مذکورہ تعریفات اسلام کا معاشرتی نظام مصنفہ پروفیسر خالد علوی سے ماخوذ ہیں۔ ص ۹۲-۹۳

وجود میں آتے چلے گئے۔ جوں جوں معاشرہ ترقی کرتا چلا گیا، اور ضروریات بڑھتی گئیں۔ اداروں میں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اداروں کا آغاز ارتقاء معاشرتی زندگی کے آغاز اور ارتقاء سے وابستہ ہے۔ ادارے معاشرہ کا لاینفک جز ہیں۔ وارڈ کہتا ہے۔ کہ ادارت معاشرتی ضروریات یا مطالبے کا نتیجہ ہیں۔ ایل، ایچ مارگن کے نزدیک "ہر ادارے کی بنیاد دائمی ضرورت پر ہے۔" وہ ضروریات جو اداروں کو جنم دیتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ بھوک

۲۔ ذاتی تسکین

۳۔ ذاتی تحفظ

۴۔ بقائے نسل

۵۔ افزائش نسل

اقسام:۔ ماہرین عمرانیات نے ادارہ کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔

بائرن آر ولسن کے نزدیک معاشرتی ادارے حسب ذیل ہیں۔

صنعتی ادارے، حکومتی شعبے، ٹریڈ یونینیں، فوجی تنظیمیں، عوامی رسل و رسائل کے ادارے سیاسی جماعتیں، ہسپتال، یونیورسٹیاں، مدرسے عبادت خانے، فرقے کلبیں اور تمام قسم کے رضا کارانہ تنظیمیں ہرٹزلر Hertizler نے اپنی کتاب سوشل انسٹی ٹیوشن میں اداروں کی حسب ذیل قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ معاشی و صنعتی

۲۔ ازدواجی و خانگی

۳۔ سیاسی

۴۔ مذہبی

۵۔ اخلاقی

۶۔ تعلیمی

۷۔ مزاحیہ، جمالیاتی اور اظہاری

۸۔ صحتی اور تفریحی

ہربرٹ سپنسر نے اپنی کتاب پرنسپل آف سوشیالوجی میں اداروں کی یہ چھ اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ خانگی

۲۔ رسمی
۳۔ سیاسی
۴۔ کلیسائی
۵۔ پیشہ وارانہ
۶۔ صنعتی

فوائد: ۱۔ ادارے معاشرتی زندگی کی بنیاد ہیں۔
۲:۔ ان کی وجہ سے معاشرے کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔
۳۔ انہی کے سبب معاشرتی حالات کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔
۴۔ انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔
۵۔ نسل انسانی کے شاندار ماضی کا تحفظ ہوتا ہے۔

فرائض

معاشرتی اداروں کے فرائض انفرادی بھی ہیں۔ اور اجتماعی بھی انفرادی فرائض ہر ادارہ اپنے دائرہ کار میں سرانجام دیتا ہے۔ مگر مثلاً مدرسہ تعلیم و تربیت دیتا ہے، مسجد اخلاقی اقدار کو ابھارتی ریاست جانی، مالی تحفظ دیتی ہے ہر ادارہ کا انفرادی فریضہ دوسرے ادارے سے مختلف ہوتا ہے معاشرتی اداروں کے اجتماعی فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ معاشرتی ہم آہنگی :۔ یہ اہم فریضہ ہے معاشرے کا ہر ادارہ ایک دوسرے سے ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور اس طرح ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اتحاد کی لڑی میں تمام منسلک ہیں۔ اگر معاشرتی اداروں میں ہم آہنگی نہ ہوں تو معاشرے میں بگاڑ اور فساد برپا ہو جاتا ہے۔

۲۔ نظم و ضبط :۔ ادارہ نام ہے نظم و ضبط کا، اگر کسی ادارہ میں نظم ضبط مفقود ہے تو ادارہ، ادارہ نہیں کہلا سکتا، اس لئے معاشرتی ادارہ کا اہم فریضہ ہے۔ وہ افراد میں نظم و ضبط پیدا کرے افراد میں تنظیم کے ساتھ ہی ادارہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے۔

۳۔ اجتماعی احساس کی بیداری :۔ جب کبھی کسی ادارہ کے افراد میں خودغرضی اور انفرادیت غالب آجاتی ہے۔ تو معاشرتی ادارہ کا یہ اہم فرض ہو جاتا ہے۔ کہ وہ افراد میں اجتماعی احساس کو بیدار کرے۔ تاکہ انفرادی مفاد اجتماعی مفاد پر غالب نہ آسکے جس معاشرہ میں انفرادی احساس اجتماعی احساس اور مفاد پر غالب آجاتا ہے۔ تو وہاں باہمی محبت، اتفاق ہمدردی مفقود ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ میں ہر قسم کا ظلم عود کر آتا ہے۔

مقاصد کی تکمیل جیسا کہ پہلے یہ ذکر گزر چکا ہے، معاشرتی اداروں کا وجود میں آنے کی وجہ ہی مختلف انسانی ضروریات ہیں کیوں کہ انسان اپنی تمام ضروریات زندگی اکیلا پوری نہیں کرسکتا، اسے مجبوراً دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ یہ ادارے انسانی ضروریات واحتیاجات کو احسن طریقہ سے پورا کرتے ہیں۔

خاندان

خاندان: قدرتی اداروں میں وہ ادارہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے موجود ہے اور اب تک موجود رہے گا۔ ارسطو کہتا ہے کہ "خاندان ایک قدرتی ادارہ ہے جس کی ابتدا انسانی ضروریات کی وجہ سے ہوئی انسان کو اپنی مختلف ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ساتھیوں کی ضرورت رہی۔ ابتدا ہی میں عورت زندگی کی بہترین ساتھی ثابت ہوئی اور مرد عورت دونوں کی رفاقت کی وجہ سے خاندان ظہور پذیر ہوا"۔

معاشرتی زندگی میں خاندان کی اہمیت

۱۔ خاندان بچے کے لیے ابتدائی درسگاہ ہے۔ قدیم زمانہ میں تعلیم کا بڑا مرکز خاندان ہی سمجھا جاتا تھا۔ جب بچہ اس دنیا میں سانس لیتا ہے تو اس کو ماں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اس کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذہنی پرورش بھی کرتی ہے۔ مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے زبان سکھاتی ہے۔ جب سِن شعور کو پہنچتا ہے تو والدین بچے کی اخلاقی اور روحانی پرورش کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس کام سے روکتے ہیں جو مخرب الاخلاق ہوتی ہے (ای۔ ایم۔ واٹ) لکھتا ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے۔ وہ معاشرہ میں یا معاشرہ کے ذریعہ کرتا ہے۔ خاندان وہ پہلی درسگاہ ہے جو اسے معاشرہ کا مفہوم اور معاشرتی عادات کی اہمیت سکھاتی ہے۔

۲۔ خاندان شہریت کی پہلی درسگاہ ہے جہاں سے بچہ مفادِ عامہ نظم و ضبط کی پابندی سماجی بہبود اور حقوق و فرائض کی ادائیگی کا سبق سیکھتا ہے یہی امور سماجی زندگی کو بہتر بناتے ہیں۔

۳۔ خاندان افراد میں سیاسی شعور پیدا کرتا ہے۔ ویسے بھی خاندان کو ایک چھوٹی سی ریاست سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اسی وجہ سے ارسطو نے کہا کہ جو ایک خاندان کا نظام اچھی طرح سنبھال سکتا ہے۔ وہ ایک حکومت کا بھی اچھی طرح نظام چلا سکتا ہے۔

۴۔ خاندان معاشرہ میں معاشی ادارہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ باپ اپنے بچوں کی پرورش کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ اگر والد اپنی محنت سے افرادِ خاندان کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تو اس کی بیوی بھی کسب کے میدان میں قدم رکھ لیتی ہے تو متحدہ کوششوں سے

گھر کی تمام ضروریات اور احتیاجات پورا کر لیتے ہیں۔ جب بچے جوان ہوتے ہیں تو وہ کنبہ کی معاشی ضروریات کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں۔

عائلی زندگی

ازدواجی زندگی انسانی تہذیب اور معاشرہ کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کے متعلق شرح و بسیط کے ساتھ تعلیم دی ہے ازدواج کے لیے عربی لفظ نکاح ہے۔ تناکحت الاشجار اذا تمایلت وانضم بعضھا الی بعض [1]

عبدالرحمٰن الجزیری نے نکاح کے معنی پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ نکاح کے معنی عقد اور زوجیت کے ہیں۔ قرآن مجید نے نکاح کو میثاقاً غلیظاً (النساء ۴: ۲۱) بختہ عہد قرار دیا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے میاں بیوی دونوں اپنے کندھوں پر بعض اہم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا اقرار کرتے ہیں۔

نکاح کی اہمیت ازروئے قرآن مجید: اسلام نے ازدواجی زندگی کو اختیار کرنا لازمی قرار دیا ہے ارشادِ الٰہی ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ [2]

تم میں سے جو مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

یہ آیت واضح طور پر رشتۂ ازدواج کے قیام کی تاکید کرتی ہے۔ تمام مرد اور عورتوں کو شادی کا حکم دیتی ہے سوائے اس کے کہ کوئی خاص وجوہ مانع نہ ہوں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً [3]

اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے اور انہیں بیویاں اور اولاد بھی دی۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے ازدواجی زندگی اختیار کرنا تمام رسولوں کی سنت تھی۔

ازروئے حدیث: رسول کریم صلعم نے نکاح کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ اتزوج فمن رغب عن سنتی فلیس منی [4] میں شادی کرتا ہوں پس جو میری سُنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

---

[1] عبدالرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب اربعہ کتاب النکاح جلد ۴ صفحہ نمبر ۱ [2] نور ۲۴: ۳۲
[3] الرعد ۱۳: ۳۸ [4] بخاری باب الترغیب فی النکاح

اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الدین [۱] جب بندہ نے شادی کر لی تو اُس نے نصف دین پورا کر لیا۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج [۲] اے جوانوں کے گروہ جو تم میں سے نفقہ و مہر دینے کی طاقت رکھتا ہے اسے نکاح کرنا چاہیئے۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں ایک دن رسول کریم صلعم کی خدمت میں عکاف بن بشیر تمیمی آئے اور رسول کریم صلعم نے عکاف سے پوچھا اے عکاف! تمہاری بیوی ہے؟ حضرت عکاف نے جواب دیا نہیں۔ رسول کریمؐ نے پوچھا لونڈی؟ حضرت عکاف نے کہا نہیں۔ یہ جواب سُن کر آپ نے فرمایا تم صلاحیت بھی رکھتے ہو اور خوشحال بھی ہو پھر نے شادی سے گریز کیا ہے: اذا انت من اخوان الشیاطین [۳]۔ تب تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو۔

عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدنیا کلہا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ [۴] حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساری دُنیا متاع ہے اور دُنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

فقہا کی نظر میں اہمیت: فقہاء اکرام نے لکھا کہ جب جذبہ شہوت حد برداشت سے باہر ہو جائے اور شرعی حدود کے توڑنے کا اندیشہ ہو تو اس وقت نکاح کرنا واجب ہے اگر جنسی میلان حد سے نہ گزر رہا ہو اس پر قابو پانا آسان ہو تو تب نکاح سُنت مؤکدہ ہے

ترکِ لذت روشن خیال مفکرین کی نظر میں:

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ

"مادہ تولید کی پیداوار میں جب زیادتی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا بُخار دماغ کی طرف چڑھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خوبصورت عورتوں کو دیکھنا آدمی کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے اور ان کی محبت دلوں میں جگہ بنانے لگتی ہے اور اس بُخار کا ایک حصہ شرم گاہ کی طرف بھی آتا ہے

---

[۱] مشکوۃ کتاب النکاح [۲] بخاری کتاب النکاح جلد ۳ صفحہ ۱۷۰
[۳] مجمع الفوائد کتاب النکاح عن احمد [۴] مشکوۃ المصابیح کتاب النکاح صفحہ ۲۶۸۔

جس کی وجہ سے تقاضے میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ مقاربت کی قوت اُبھرتی ہے اور یہ عموماً نوجوانی کے دَور میں ہوتا ہے اور شادی نہ ہونے کی صورت میں بالآخر یہ چیز زنا کے لیے اُبھارتی ہے اس کے اخلاق گندے ہونے شروع ہوتے ہیں اور ایک دن شہوت اسے بڑے خطروں میں ڈال دیتی ہے" [۱]

علامہ ابن القیم لکھتے ہیں کہ مقاربت سے بالکل کنارہ کش نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح اس کنوئیں کا پانی خراب ہو جاتا ہے جس کا پانی نکالا نہیں جاتا۔ یہی حشر کلی پرہیز کا بھی ہوگا۔[۲]

مفکرین کی نظر میں:

مفکرین اور فلاسفہ کی یہی رائے ہے کہ نکاح عائلی زندگی کے لیے نہایت ہی ضروری ہے چنانچہ مسٹر راج گوپال اچاریہ کہتے ہیں۔

"عورتوں کے لیے شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹری انجینئرنگ اور سیاست دانی بلاشبہ عزت دیتے ہیں۔ مگر گھربار کی نگرانی اور بچوں کی پرورش بھی کچھ کم عزت نہیں ہے۔ فوجی کارخانوں میں کام کرنا اور دفتروں میں حاضری دینا خواہ کتنا ہی اہم ہو لیکن گھریلو زندگی کے نوک و پلک درست کرنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے میں نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں جو تجربہ حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کے اخلاق کی تکمیل ماں بن کر ہو سکتی ہے[۳]"

فاضل فرنگن لکھتی ہے:

"عورت کا اولین فریضہ شادی مادریت اور خانہ داری ہے۔ معاشرہ کا فرض ہے کہ ہر عورت کے لیے اس کا موقع بہم پہنچائے اور جو عورت اس کی تلاش میں ہو اسے وہ آسانی سے مل جائے۔ جیسے مرد کو ذریعہ معاش[۴]"

ایک مغربی مفکر اینتھونی ایم لوڈووسی اپنی کتاب "عورتوں کا تحفظ" میں رقمطراز ہے۔"

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۲۲ [۲] زاد المعاد ج ۳ ص ۱۲۶

[۳] زمزم لاہور ۷ راگست ۵۴ ۱۹ء [۴] صدق جدید لکھنو ۱۸ر جنوری ۱۹۵۲ء

"اس امر پہ زور دینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر عورت کے لیے ایک خاص عمر تک ازدواجی زندگی کو مقصودِ زندگی قرار دیا جانا چاہیئے اور والدین کے ذہن نشین یہ امر کرنا چاہیئے کہ ازدواج ہی وہ اصل غرض ہے جس کے لیے لڑکیوں کی تربیت کی جانی چاہیئے۔ انسانیت کے بہترین پہلوؤں کی تکمیل ماں بننے سے ہی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ جو چیز بھی ایک عورت حاصل کرے وہ اس سے کم تر درجہ رکھتی ہے اور وہ لوگ جو اسے عالمِ شباب میں یہ فریب دیتے ہیں کہ اس کے لیے ماں بننے سے بڑھ کر یا اس کے برابر اور مشاغل بھی ہیں۔ نہ صرف صنفِ نازک کے بلکہ نوعِ انسانی کے دشمن ہیں[1]"

اجتماعی حیثیت سے اہمیت: نظامِ حیات کا تمام دارومدار نکاح پر ہے۔ اس وجہ سے شادی کرنا اجتماعی لحاظ سے بہت ضروری ہے۔ نکاح دو خاندانوں کو باہمی محبت اور مودّت کے رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ سوسائٹی کے پراگندہ اور منتشر اجزا کو مربوط کر دیتا ہے۔ شادی سے ہی تمام رشتے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان رشتوں کے باہمی تعلق سے ایک سوسائٹی معرضِ وجود میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا[2] اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

تمدن اور اجتماعی زندگی کا منبع ہی متاہل زندگی ہے۔ اگر سوسائٹی کے پراگندہ اجزاء کو نکاح کے ذریعہ اکٹھا نہ کیا جائے تو کوئی تہذیب و تمدن اور اجتماعی زندگی معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔

ترکِ لذّت سے ممانعت: اسلام ایک متحرک مذہب ہے دین اور دنیا کا جامع

---

[1] ندائے حرم کراچی جمادی الاولیٰ ۷۹ھ

[2] سورۃ النساء آیت ۱

اس وجہ سے اسلام نے ان تمام امور سے سختی سے روکا ہے جو ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ [1]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ عرب میں بعض زاہد متقشف اپنی قوت رجولیت ہی ختم کرا دیتے تھے۔ رسول کریم صلعم نے اس رسم کو سختی سے ختم کیا اور صحابہ کرام کو ترکِ نکاح سے منع فرمایا حضرت سعد بن ابی وقاص رض روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے حضرت عثمان رض بن مظعون کی ترک نکاح کی درخواست رد فرما دی ورنہ ہم لوگ قوت رجولیت ہی ختم کرا دیتے۔

رسولِ کریم صلعم فرماتے ہیں دُنیا کو آخرت کے لیے ترک کرنے والا اچھا نہیں نہ آخرت کو دُنیا کے لیے ترک کرنے والا بلکہ وہ شخص بہتر ہے جو آخرت کو بھی اختیار کرتا اور دُنیا کو بھی۔

نکاح کا اساس:

اسلام کی روح تقویٰ ہے اور اس روح کو ازدواجی زندگی میں بھی برقرار رکھا ہے رسول کریم صلعم نے مسلمانوں کو نکاح کے بارہ میں یہ نصیحت فرمائی ہے۔

لاتزوجوھن لحسنھن فعسی حسنھن ان یردیھن ولا تزوجوھن لاموالھن فعسی اموالھن ان تطغیھن ولکن تزوجوھن علی الدین و ولامۃ خرماء سوداء ذات دین افضل [2] عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو ممکن ہے کہ ان کا حسن انہیں خراب کر دے اور نہ ان کے مال و دولت کی وجہ سے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ مال انہیں متکبر کر دے بلکہ ان سے دین کی بنیاد پر نکاح کرو کیونکہ سیاہ فام کان چھدی متدینہ لونڈی زیادہ بہتر ہے۔

ناجائز طریقوں سے تکمیل شہوت اسلام کی نظر میں: اسلام نے تکمیل شہوت کے لیے

---

[1] مائدہ ۵ : ۸۷

[2] ابن ماجہ شامی باب تزویج ذات الدین جلد ۱ صفحہ ۵۹

تمام نا جائز طریقوں سے منع کیا ہے۔ پہلا طریقہ زنا ہے۔ قرآن مجید نے زنا کو بدترین جرم اور فاحش قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا[1] اور زنا کے قریب مت جاؤ کیوں کہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بُری راہ ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: لا یزنی الزانی حین یزنی و هو مومن..... ابا کما قال[2] زنا کار جب زنا کرتا ہے جس وقت زنا کرتا ہے اُس وقت مومن نہیں ہوتا۔ اس جرم عظیم سے بچو بچو ما من ذنب بعد الشرك اعظم عند الله من نطفة وضعها رجل فی رحم لا یحل له[3] شرک کے بعد کوئی گناہ اس نطفہ سے بڑھ کر گناہ نہیں جس کو کوئی شخص کسی ایسے رحم میں رکھے جو اس کے لیے شرعاً حلال نہ تھا۔

لَا تشرکوا باللہ شیئًا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقذفوا المحصنة[4]

زنا کے نقصان: (۱) زنا اخلاق کو برباد کردیتا ہے۔ قوموں کی ترقی کا راز اخلاق حمیدہ میں ہی مضمر ہے جو قوم اخلاق کے زیور سے عاری ہو جاتی ہے وہ تنزل کے اتھاہ گڑھے میں گر جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ما ظهر الربا والزنا فی قریة الا اذن الله باهلاکها۔ (الجواب الکافی صفحہ ۲۲۰)

جب کسی بستی میں سود اور زنا پھیل جاتا ہے تو اللہ اس بستی کی ہلاکت کی اجازت دیتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بیعت عامہ ہو جانے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی "دیکھو جس قوم نے بھی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا چھوڑ دیا اللہ نے اسے ذلیل کر دیا ہے۔ اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے خدا اُس میں مصیبت کو پھیلا دیتا ہے (تاریخ ملت جلد ۲ صفحہ ۴۰)

(۲) نسوانی عفت کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ عفت اور عصمت ہی عورت کا حقیقی لباس ہے۔ جب کوئی عورت اس لباس سے ننگی ہو جاتی ہے تو وہ معاشرہ کے لیے تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

---

[1] بنی اسرائیل ۳۲ — [2] مشکوٰۃ باب الکبائر

[3] ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۳۸ — [4] مشکوٰۃ باب الکبائر

۳- زنا اس بچہ پر ظلم ہے جو ناجائز طور پر کسی عورت کے رحم میں ٹھہر جاتا ہے اور اس کو ضائع کر دیا جائے تو بے قصور قتل کیا جائے گا اگر ضائع نہ کیا جائے تو وہ معاشرہ میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ بعض اوقات اس قسم کے بچے سوسائٹی کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔ مودودی صاحب انگلستان میں اسقاطِ حمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انگلستان میں کم از کم اندازہ کے مطابق ہر سال نوّے ہزار حمل اسقاط کیے جاتے ہیں۔[۱]

۴- بیماریاں: زنا بیماریوں کا سرچشمہ ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امریکہ میں زنا کی وبا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تیس چالیس ہزار کے درمیان بچوں کی اموات صرف موروثی آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ . . . . سوزاک میں نوجوان کم از کم ساٹھ فیصدی مبتلا ہیں۔ اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں ہیں . . . شادی شدہ عورتوں کے اعضائے جنسی پر جتنے اپریشن کیے جاتے ہیں ان میں پچھتر فیصدی ایسی نکلتی ہیں جن میں سوزاک کا اثر پایا جاتا ہے۔"[۲]

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲۳ صفحہ ۴۵ کے حوالہ سے مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

"امریکہ کے دواخانوں میں اوسطاً ہر سال آتشک کے دو لاکھ اور سوزاک کے ایک لاکھ ساٹھ ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے چھ سو پچاس دواخانے صرف انہی امراض کے لیے مخصوص ہیں۔ مگر سرکاری دواخانوں سے زیادہ مرجوعہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کا ہے۔ جن کے پاس اکسٹھ فیصدی اور سوزاک کے نواسی فیصدی مریض جاتے ہیں۔[۳]

ایک فرانسیسی ڈاکٹر کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال آتشک اور اس کے پیدا کردہ امراض کی وجہ سے تیس ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں۔[۴]

---

[۱] پردہ صفحہ ۵۴ — [۲] پردہ صفحہ ۶۹

[۳] پردہ صفحہ ۶۸ — [۴] پردہ صفحہ ۵۷

لواطت: دو مردوں کا تکمیل شہوت کے لئے ایک دوسرے کے قریب جانا لواطت کہلاتا ہے۔ قرآن مجید نے اس غیر فطری فعل سے منع کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا[1]

اور جو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان کو جانے دو اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ[2] تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے آتے ہو۔ بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من وجد تموہ یعمل عمل قوم لوط فاقتلوا الفاعل والمفعول (ترمذی ج ۱ صفحہ ۱۸۶) تم جس کو قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو: لاینظر اللہ عز وجل الی رجل اتی رجلا او مراۃ فی دبرھا۔ (ترمذی ج ۱ صفحہ ۱۴۸) اللہ تعالیٰ اس شخص کو رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا جو کسی مرد یا عورت سے لواطت کرتا ہے۔

اس فحش اور غیر طبعی فعل سے انسان بے شمار اخلاقی تمدنی اور معاشرتی برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔

اوّل ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کر کے اس کی دلیری اور بہادری کے جوہر کو ضائع کر دیتا ہے۔

ثانیاً نکاح کرنے کے ساتھ جو انسان پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

ثالثاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت کے خلاف کلام کرتا ہے۔

رابعاً ایک متعمد حکیم اس حرکت کے بدنتائج کے متعلق لکھتا ہے

ایک اور قبیح و شنیع حرکت بھی ہوتی ہے ...... وہ اغلام ہے اس کے نتائج بھی قریب قریب جلق ہی جیسے ہوتے ہیں اور اس علّت کا گرفتار بھی ایسی ہی پریشانی اٹھاتا ہے جیسی مجلوق ان دونوں صورتوں میں عضو

---

[1] النساء ۴: ۱۶ [2] الاعراف ۷: ۸۱

مخصوص کے پٹھے بالکل کمزور ہو کر ماند پڑ جاتے ہیں اور رطوبات فاسدہ جمع ہو کر اس فعل طبعی سے روک دیتی ہے اور اس وجہ سے ضعف انتشار اس کا اولین نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بات مانی جا چکی ہے کہ ہاتھ میں ایک قسم کی سمیت ہوتی ہے[1]۔

استمنا بالید: یہ ایک ایسا قبیح فعل ہے جس سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اثر قلب و دماغ، جگر معدہ گردوں اور آلات تولید پر پڑتا ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت کے بارے میں آتا ہے۔ الناکح بالید ملعون یعنی ہاتھ سے مادہ تولید ضائع کرنے والا ملعون ہے۔

نکاح کے مقاصد

اسلام نے نکاح کو جذبہ شہوت کی تسکین کا ذریعہ نہیں ٹھہرایا بلکہ نکاح کے اغراض و مقاصد کو شہوت رانی سے بہت بلند قرار دیا ہے۔

افزائش نسل: نکاح کا ایک مقصد نسل انسانی کی افزونی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:۔ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ[2] آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑا پیدا کیا اور چارپایوں کے بھی جوڑے پیدا کیے وہ اس طرح سے تمہیں پھیلاتا رہتا ہے۔

افزائش نسل کا دارومدار مرد اور عورت کے مستقل عہد پر ہے۔ نوع انسانی کی بقا نہ تو آزاد محبت سے قائم رہ سکتی ہے نہ عارضی نکاح سے جیسا کہ آج کل مغربی ممالک نکاح کی بجائے آزاد محبت کی طرف جھکتے چلے جا رہے ہیں۔ آزاد محبت میں بچوں کی فلاح اور تربیت کا خیال نہیں رکھا جاتا اور حتی الامکان بچوں کے پیدا کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب فریقین میں سے کسی ایک فریق کی طبیعت

---

[1] حاذق ۲۲۶ [2] الشوریٰ ۴۲: ۱۱

پر ہو جاتی ہے تو بچوں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور فریق کی تلاش میں گھومنا شروع ہو جاتا ہے اسلام نے اس عارضی نکاح کو اس وجہ سے منع فرمایا ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں استحکام اور پائیداری نہیں ہوتی۔ بچوں کو پیدا کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جاتا ہے اگر اولاد پیدا بھی ہو جائے تو باپ بھی ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا وہ بھی ماں کی طرح کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ کوئی ایسا قانون نہیں ہوتا جو باپ کو مجبور کرے کہ وہ بچوں کی غور و پرداخت کرے۔ قرآن مجید نے ذمہ داریوں کے بندھن کو توڑ کر جذبہ شہوت کو تسکین دینے کا نام سفاح رکھا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے[1] إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ (المائدہ: ۵) جب تم ان کو ان کے مہر دے دو نکاح میں لانے والے نہ عارضی نکاح کرنے والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے یہ لفظ سفح سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پانی کو باہر انڈیلنا یا خون گرانا[1] حضرت ابن عمر رض کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے عارضی نکاح (متعہ) کو سفاح قرار دیا ہے[2]۔ رسول کریم صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حضرت امام بخاری نے متعہ کے باب کا یہ عنوان باندھا ہے۔ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ عن النکاح المتعہ اخرا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکاح متعہ سے بالآخر منع فرمانا۔ اس عنوان کے تحت حضرت علی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رض سے کہا کہ رسول کریم صلعم نے مہم خیبر کے موقعہ پر متعہ اور گھریلو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا[3]۔

عفت اور عصمت: انسان کا سب سے قیمتی جوہر اس کی عفت اور پاک دامنی ہے۔ اس جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار قواعد اور ضوابط مقرر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک نکاح ہے۔ قرآن مجید نے نکاح کو احصان سے تعبیر کیا ہے۔ احصان حَصَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی ناممکن الحصول تھا یا ناممکن الحصول ہو گیا یا یہ کہ اس کو قلعہ کے اندر لے لیا گیا یا حملہ کے مقابل پر محفوظ کر دیا گیا گویا نکاح مرد اور

---

[1] لینز عربیک انگلش لیکسی کان [2] عون المعبود علی سنن ابو داؤد نمبر ۲ صفحہ ۱۸۶
[3] بخاری کتاب النکاح باب ۳۲ بعنوان مندرجہ متن۔

عورت کے لیے ایک ایسا قلعہ ہے جہاں سے شیطان اس پر حملہ کرنے سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؂۱ اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ اس طرح کہ تم اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لا کر نہ شہوت رانی کرتے ہوئے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؂۲ وہ تمہارے لیے لباس اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ جس طرح لباس انسانی جسم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اس طرح مرد اور عورت جب عقد نکاح میں آجاتے ہیں وہ ایک دوسرے کے جوہر عفت کی حفاظت کرتے ہیں۔ رسول کریم صلعم نے فرمایا: یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ؂۳ اے نوجوانوں کے گروہ تم میں سے جو اسباب معیشت رکھتا ہو اُس کو نکاح کرنا چاہیئے کیونکہ یہ نگاہ کو محفوظ رکھتا ہے اور جائے شہوت کو بچاتا ہے:۔

من اراد ان یلقی اللہ طاھرًا مطھرًا فلیتزوج الحرائر ؂۴ جو شخص اللہ تعالیٰ سے پاک وصاف ملنا چاہتا ہے تو وہ شریف عورتوں سے شادی کرے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے: ویتزوج لکسر الشھوۃ واعفاف النفس وتکثیر النسل ؂۵ شادی شہوت توڑنے نفس کو پاک رکھنے اور نسل کی کثرت کے لیے کی جاتی ہے۔

اسلام میں عفت اور پاکدامنی کی اہمیت: اسلام نے عفت اور پاکدامنی کی مختلف پرایوں میں تعلیم دی ہے کیونکہ اس کی حفاظت پر ہی فرد اور قوم کی ترقی کا انحصار ہے اور تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ ؂۶ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ

؂۱ النساء ۴: ۲۴ ؂۲ البقرہ ۲: ۱۸۷
؂۳ بخاری کتاب النکاح ؂۴ مشکوٰۃ کتاب النکاح
؂۵ فتح الباری پ۲۱ ص ۲۷ ؂۶ الاحزاب ۳۳: ۳۵

اَوْ مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ [1] اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیوی سے یا ان سے جن کے ان کے داہنے ہاتھ مالک ہوئے تو وہ ملامت کیے گئے نہیں؛ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ [2] زنا نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے کوئی بہتان باندھ لائیں ۔ ایک دفعہ رسول کریم صلعم نے عفت کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا

یا شباب قریش احفظوا فروجکم ولا تزنوا الا من حفظ فرجہ فلہ الجنۃ [3] رواہ الحاکم والبیہقی وقال صحیح علی شرطھما اے قریش کے جوانو! اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو ۔ زنا نہ کرو ۔ سنو جو اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے گا اُس کے لیے جنت ہے ۔

من توکل لی ما بین رجلیہ وما بین لحییہ توکلت لہ بالجنۃ [4] جو میرے لیے شرم گاہ اور زبان کی حفاظت کی ذمہ داری لے میں اس کے لیے جنت کی ذمہ داری لوں گا ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں میں عفت طلب کرتے رہتے تھے ۔

اللّٰھم انی اسئلک الھدی والتقی والعفاف والغنی [5] اے اللہ تجھ سے ہدایت تقویٰ پاک دامنی اور غنیٰ طلب کرتا ہوں ۔

اللّٰھم انی اسئلک الصحۃ والعفۃ والحسن والرضا بالقدر [6] اللہ تجھ سے صحت عفت ۔ اچھائی اور تقدیر پر رضا کی درخواست کرتا ہوں ۔

مودت ورحمت ، ازدواجی زندگی مودت اور تسکین کا سرچشمہ ہے اور محبت اور مودت کی اساس پر ہی تہذیب وتمدن ترقی کرتا ہے ارشادِ الٰہی ہے ؛ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا [7] وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اُس کا جوڑا پیدا

---

[1] المومنون ۲۳ : ۵-۶ [2] الممتحنہ ۶۰ : ۱۲ [3] مفتاح الخطابۃ باب الزنا
[4] بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش مشکوۃ باب جامع الدعا صفحہ ۲۱۸
[5] مشکوۃ باب جامع الدعا صفحہ ۲۲۰ [6] [7] الاعراف ۷ : ۱۸۹

کیا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [1] اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

صحت: ڈاکٹر اور اطبا اس امر پر متفق ہیں کہ جماع انسانی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر مادہ تولید ایک عرصہ تک رکا رہے تو قسما قسم کی بیماریاں جنم لے لیتی ہیں۔

جالینوس کا قول ہے کہ مادہ تولید پر آگ اور ہوا غالب ہے اور اس کی طبیعت گرم و تر ہے۔ اس کا فاضل حصہ جب بھی روک لیا جاتا ہے اور اسی طرح ایک عرصہ تک رہتا ہے تو اس سے خراب قسم کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ کبھی وسواس کی بیماری ہوتی ہے۔ کبھی جنون کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ اور کبھی مرگی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز مادہ تولید کا اخراج معتدل صحت پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ بہت سی بیماریوں سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔ ورنہ رکاوٹ سے ایک زہریلا مادہ تمام جسم میں دوڑ جاتا ہے جو صحت کے لیے مضر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زیادتی کے وقت انسانی طبیعت اس کے باہر نکالنے پر مجبور ہوتی ہے [2]

نفیسی طب کی مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے:

"اور اس وقت مقاربت اور مادہ تولید کا خارج کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر اسے ترک کر دیا جائے گا اور وہ ظرف میں زیادہ ہو جائے گا تو حرارت غریزی کا گلا گھونٹ دے گا اور اسے بجھا دے گا اور لازم ہو گا کہ وہ خود ٹھنڈا پڑ جائے اور بدن کو بھی ٹھنڈا کر دے۔"

مادہ تولید زہر آلود طبیعت میں بدل جائے گا اور زہر آلود مادہ دل اور دماغ کی طرف زہر آلود ردی بخارہ کو روانہ کرے گا۔ جو غشی، مرگی اور اس طرح کی دوسری بیماریوں کا موجب ہو گا [3]

---

[1] الروم ۳۰: ۲۱ [2] زاد المعاد ج ۳ صفحہ ۱۴۶
[3] نفیسی ص ۴۱۳

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں :

"مرد پر جنسی میلان کا تقاضا بسا اوقات مستولی ہو جاتا ہے اگر اس تقاضے کی تکمیل میں تاخیر سے کام لیا جائے گا تو نقصان بدن کو بھی پہنچتا ہے اور دل کو بھی" (نووی شرح مسلم ج صفحہ ۴۵۰)

جالینوس نے اپنی کتاب حفظ الصحت میں لکھا ہے کہ :

"بیوی سے اختلاط مخصوص اعتدال کے ساتھ تندرستی کے مختلف ذرائع میں سے ایک بڑا ذریعہ ہے اور بہت سے امراض کو شفا ہے (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۳۲) ان تمام اقوال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شادی صحت کے لیے ضروری ہے۔

احساس ذمہ داری پیدا کرنا : متاہل زندگی کا مقصد احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے جو بغیر شادی کرنے کے پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ بغیر شادی شدہ کی توجہ کا مرکز صرف اُس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ لیکن شادی کے بعد ایک تو باہر سے ایک عورت آجاتی ہے جس کی دیکھ بھال۔ آرام و آسائش کی ذمہ داری مرد کے کندھوں پر آپڑتی ہے۔ اس کے بعد اولاد پیدا ہو جاتی ہے جس سے مزید ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اپنی تمام استعدادوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس وجہ سے حافظ ابن کثیر نے عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ التمسوا الغنی فی النکاح [1] یعنی نکاح میں تونگری تلاش کرو۔

قرآن مجید میں آتا ہے :

اِنْ تَكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ [2] اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

---

[1] ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۸۶

[2] النور ۲۴ : ۳۲

رسول کریم صلعم کا ایک قول ہے۔ التمسوا الرزق بالنکاح[1] یعنی نکاح کے ذریعہ رزق تلاش کرو۔ ان فرمودات سے مراد یہ ہے کہ احساس ذمہ داری سے انسان جدوجہد کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور عمل اور کوشش سے ان وسائل کو تلاش کرتا ہے جو رزق کی فراخی کا موجب ہوتے ہیں۔

جنسی میلان کا علاج: جنسی میلان ایک طبعی جذبہ ہے۔ جب یہ میلان حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو اس کا بخار دماغ پر اتنا مستولی ہوتا ہے کہ انسان شہوت کے بخار کی حدت کو بجھانے کے لیے زنا کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جنسی میلان میں اعتدال اور توازن قائم رکھنے کے لیے نکاح ضروری ہے۔ نکاح ہی ایک ذریعہ ہے جس سے قوت بہیمہ دب جاتی ہے۔

روحانی ترقی: نکاح انسان کی روحانی ترقی اور تزکیہ نفس کا ذریعہ ہے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رح اپنے ایک عقیدت مند کو لکھتے ہیں۔

> "تمہارا یہ کہنا کہ شادی کرنے کے بعد باطن کی اصلاح ناممکن ہے میں اسے تسلیم نہیں کرتا کیوں کہ مفارقت دل کو جلا بخشتی ہے اور روحانی آلائشوں کو صاف کرتی ہے قاضی عیاض کی کتاب کے شارح نے کہا ہے کہ "ہر شہوت قلب کو سیاہ کرتی ہے۔ مگر ایک مقاربت کا فعل کہ اس سے دل کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔"[2]

حرام عورتیں: اسلام نے بعض رشتوں کے احترام خاندانی تعلقات کی پاکیزگی معاشرہ کی اصلاح اور بقا کے لیے بعض رشتوں میں باہم نکاح حرام قرار دیا ہے۔ اس حرمت کی تین وجوہ ہیں۔ نسب۔ رضاعت اور مصاہرت۔

حرمت نسب: حقیقی ماں باپ کے تعلق سے جو رشتے قائم ہوتے ہیں۔ یہ سات ہیں۔ ماں۔ بیٹی۔ بہن۔ پھوپھی۔ خالہ۔ بھتیجی۔ بھانجی۔

حرمت رضاعت: رضاعی رشتہ کی بنا پر مثلاً رضاعی بہن رضاعت کی وجہ سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جو حقیقی ماں باپ کے تعلق سے

---

[1] مدارک [2] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۲۱

حرام ہوتے ہیں رسول کریم صلعم نے فرمایا: یحرم من الرضاع مایحرم من النسب یعنی رضاعت سے تمام وہ رشتے حرام ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔

حرمت مصاہرت: نکاح کے تعلق سے کچھ رشتے حرام ہو جاتے ہیں ۔مثلاً ساس ۔سالی ۔بیٹے کی بیوی۔

محرمات سے نکاح نہایت ہی برا فعل اور گناہ ہے۔ ابن ماجہ نے ابن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جو شخص محرمات میں سے کسی سے ملوث ہو اُس کو قتل کر دو۔

ماں: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ ۔تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئی ہیں۔ماں کے حکم میں دادی، نانی پھر دادی اور نانی کی ماں اور ماں کی ماں اُوپر تک داخل ہیں۔

بیٹی: وَبَنَاتُكُمْ ۔اور تمہاری بیٹیاں۔ بیٹی کے حکم میں اولاد کی بیٹی یا اولاد کی اولاد کی بیٹی بھی شامل ہیں۔

بہن: وَأَخَوَاتُكُمْ اور تمہاری بہنیں۔بہنوں میں سگی بہنوں کے علاوہ ماں شریک بہن اور باپ شریک بہنیں شامل ہیں۔

پھوپھی: وَعَمَّاتُكُمْ اور تمہاری پھوپھیاں پھوپھی کے حکم میں دادا کی بہن اور اُوپر تک کی پشتوں کی بہن سب شامل ہیں۔

خالہ: وَخَالَاتُكُمْ اور تمہاری خالائیں۔ ماں کی بہن کے علاوہ نانی، پرنانی کی بہنیں بھی اس حکم میں شامل ہیں۔

بھتیجی: وَبَنَاتُ الْأَخِ ۔ اور تمہاری بھتیجیاں ۔بھائی خواہ سگا ہو یا سوتیلا اس کی بیٹی حرام عورتوں کے حکم میں شامل ہے۔

ساس: وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ: اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔

سوتیلی بیٹی: وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں ہوں ان عورتوں کے بطن سے جن پر تم داخل ہو چکے ہو۔

فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔

اور اگر تم ان پر داخل نہ ہوئے ہو تو تم پر گناہ نہیں۔

بہو: وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ ۔اور تمہارے ان

بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں۔

بیٹے کی بیوی کے حکم میں پوتے اور نواسے کی بیوی بھی شامل ہیں۔

بیک وقت دو بہنیں: وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ [۱] اور دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

بہن کی طرح اس کی خالہ پھوپھی۔ بھانجی اور بھتیجی کو بھی اکٹھا کرنا حرام ہے۔ ہدایہ میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ دو ایسی عورتوں کو بیک وقت زوجیت میں لینا منع ہے جن میں سے اگر ایک مرد ہوتی تو ان کی شادی حرام ہوتی۔

دوسرے کی منکوحہ: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ [۲] ان عورتوں سے بھی شادی کرنا حرام ہے جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔

سوتیلی ماں: وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ [۳] اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔

مشرکہ عورت سے: قرآن مجید نے مشرکہ عورت سے بھی شادی کرنا ناجائز قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ [۴] اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے گو وہ تمہیں اچھی لگتی ہو اس آیت میں مشرکہ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کے پاس آسمانی کتاب نہیں۔ سورۃ مائدہ آیت ۵ میں واضح حکم ملتا ہے کہ ان عورتوں سے شادی کی اجازت ہے جو کسی آسمانی کتاب کو مانتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یعنی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں۔ حرام عورتوں کا ذکر کرنے کے بعد اس بات کا بتانا بھی ضروری ہے کہ آیا ایک مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم سے کیا جا سکتا ہے۔ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان عورت کا غیر مسلم مرد سے نکاح جائز نہیں۔

---

[۱] النساء ۴: ۲۳
[۲] النساء ۴: ۲۴
[۳] النساء ۴: ۲۲
[۴] سورۃ بقرہ ۲: ۲۲۱

نکاح کے احکام: اسلام نکاح کو پختہ عہد قرار دیتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نکاح میں انتخاب کی آزادی دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ[1] ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرنے کی تجویز کرے تو اُسے دیکھ لینا چاہیئے حضرت امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان باندھا ہے۔ المنظر الی المرأۃ قبل التزویج۔ یعنی نکاح سے قبل عورت کو دیکھنا۔ رسول کریم صلعم سے ایک حدیث مروی ہے مغیرہ بن شعبہ نے ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو رسول کریم صلعم نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم نے اس عورت کو دیکھ لیا ہے۔ مغیرہ نے جواب دیا یا رسول اللہ نہیں جس پر حضور نے فرمایا کہ اسے پہلے دیکھ لو۔ کیونکہ اس سے زیادہ محبت اور یگانگت پیدا ہونے کی توقع ہے[2]

عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رضا دینے سے پہلے مرد کو دیکھ لے نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ[3] تم انہیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔

> "عورت کو دیکھنے کا وقت منگنی سے قبل ہونا چاہیئے۔ . . . عورت کے لیے سفارش کی گئی ہے کہ وہ مرد کو اگر اس سے نکاح کرنا چاہتی ہے ایک نظر دیکھ لے کیوں کہ مرد کی جو چیز عورت کو خوش کرے گی وہ مرد کو بھی عورت کے معاملہ میں خوش کرے گی۔ اور ان میں سے ہر ایک جب چاہے ایک دوسرے کو از سر نو دیکھ سکتا ہے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کے خدوخال کا علم حاصل کر سکیں اور ان کو نکاح کے بعد پچھتانا نہ پڑے۔"

نکاح علانیہ کیا جائے: تمام فقہاء نے نکاح کو بر سر عام اور علانیہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے یہ کہا ہے کہ نکاح کا اعلان دف کے ساتھ کرنا مستحن

---

[1] النساء ۴: ۳
[2] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب النظر الی المخطوبہ الفصل الثانی
[3] البقرہ ۲: ۲۳۲

ہے تاکہ دوسروں کو یہ خبر ہو جائے اور پیچھے کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو۔ کئی دفعہ نکاحوں کے متعلق مقدمات تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ پھر وراثت پر بھی اثر پڑتا ہے اس وجہ سے اعلان کرنا ضروری ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: اعلنوا ھذا النکاح واجعلوا فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔ (ترمذی باب ما جاء فی اعلان النکاح) اس نکاح کا اعلان کرو اور نکاح مسجد میں کرو اور دف بجاؤ۔

مہر: نکاح میں حق مہر ضروری ہے۔ قرآن مجید کی رو سے مہر ایک عطیہ ہے۔ جو نکاح کے موقع پر خاوند بغیر کسی معاوضہ کے بیوی کو دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ قرآن مجید نے مہر کے لیے اجر۔ صدقہ اور فریضہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اجر کے معنی ہیں صلہ یا عطیہ جو ذہن کو دیا جائے لیے حضرت امام راغب لکھتے ہیں۔ اجر وہ ہے جس میں فائدہ ہی فائدہ ہو۔ نقصان نہ ہو۔ قران مجید میں آتا ہے: فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَةً [۲] ان کے مقرر شدہ مہر دے دو۔

صدقہ: صدق سے مشتق ہے جس کے معنی سچائی ہیں، یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ مہر خلوص نیت، صدق دل اور طیب خاطر سے دیا جائے۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِھِنَّ نِحْلَةً [۳] اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو فریضہ کے معنی ہیں۔ وہ چیز جو فرض کی گئی ہو ارشاد الٰہی ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْھُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَھُنَّ فَرِیْضَةً [۴] تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جب کہ تم نے ابھی ان کو چھوا نہ ہو۔ یا مہر مقرر نہ کیا ہو۔

حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن شرطوں کو تم پورا کرتے ہو ان میں سب سے ضروری اس شرط کو پورا کرنا ہے جس کی وجہ سے تم نے عورتوں کی ناموس اپنے لیے حلال کی ہے [۵]

نکاح کی عمر: قرآن مجید نکاح کی عمر بلوغت قرار دیتا ہے ارشاد ہے: وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَاْکُلُوْھَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّکْبَرُوْا۔ [۶]

---

[۱] لینز عربک انگلش لکسی کان ۔۔ [۲] النساء آیت ۲۴ [۳] النساء ۴:۱ [۴] البقرہ آیت ۲۳۶ [۵] بخاری مسلم ۔۔ [۶] سورۃ النساء ۴ : ۶

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو۔ یہاں تک کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ فضول خرچی سے اور جلدی کر کے ان کو کھا نہ جاؤ۔ چونکہ اسلام میں نکاح کی اصل روح فریقین کی رضامندی ہے اس وجہ سے نکاح کے لیے مرد اور عورت کا بالغ ہونا ضروری ہے۔ فتاویٰ عالمگیری[1] کی رُو سے نکاح کے لیے مرد اور عورت میں عقل اور تمیز بلوغت اور حریت کا ہونا ضروری ہے۔

نکاح میں ولی: مرد کے بارہ میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں کہ وہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی منظوری دے سکتا ہے لیکن عورت کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کی منظوری دے سکتی ہے یا کہ نہیں۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں لکھا ہے:

"ایک آزاد عورت جو بالغہ اور عاقلہ ہو اس کی اپنی منظوری سے معاہدہ نکاح مکمل ہو جاتا ہے خواہ وہ کنواری ہو یا پہلے بیاہی جا چکی ہو اور اگرچہ اس کے ولی نے اس کے نکاح کی توثیق نہ بھی کی ہو[2]"

شیعوں کا بھی یہی نقطہ نگاہ ہے۔ چنانچہ امیر علی محمڈن لاء میں لکھتا ہے:۔

"ایک راشدہ عورت کے نکاح کے لیے کسی ولی کی ضرورت نہیں"

لیکن امام مالک اور امام شافعی دونوں کا یہ مسلک ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا۔

نکاح میں اکفا: اسلام نسلی، قومی لونی، ہر قسم کے امتیازات مٹانے اور تمام نوع انسانی کو اخوت اور مساوات کی لڑی میں منسلک کرنے آیا ہے۔ اس وجہ سے وہ تمام شرائط جو اخوت اور مساوات کی تعلیم کے خلاف ہوں گے وہ ناجائز ہوں گی۔ اس وجہ سے نکاح کے لیے کفو کی شرط ناجائز ہے۔ ابن حجر کے قول کے مطابق کفو نسبی کے معتبر ہونے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس کتب میں ایسے آثار اور روایات کا ذخیرہ پایا جاتا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نسبی کفو کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔

حضرت امام بخاریؒ نے باب الاکفاء فی الدین کے عنوان کے تحت دو

---

[1] فتاویٰ عالمگیری جلد ۲ صفحہ ۱ [2] ہدایہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۳

واقعات بیان ہیں جن سے واضح ہوجاتا ہے کہ نکاح میں نسبی کفو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ پہلا واقعہ حضرت ابو حذیفہ کا ہے انہوں نے اپنی بھتیجی ہند بنت ولیدؓ کی شادی حضرت سالم سے جو ایک انصاری عورت کے آزاد کردہ غلام تھے کردی۔ دوسرا واقعہ ضباعہ بنت زبیر کا بیان کیا ہے ان کی شادی حضرت مقداد سے ہوئی تھی ضباعہ اپنے نسب کے لحاظ سے بہت اونچی تھی۔ حافظ ابن قیم نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں کفو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے اور اسلامی روح کے منافی ہے۔ اسلام نے صرف تقویٰ کو ہی وجہ تکریم بیان کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۴۹: ۱۳) یقیناً اللہ کے نزدیک مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (حجرات ۴۹: ۱۰) اسلام نے نکاح کے اعلان کی ایک اور صورت بھی اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی کے تعلقات کرنے کے بعد ولیمہ کیا جائے۔ رسول کریم صلعم صحابہؓ کو دعوت ولیمہ کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف کا بیان ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا: اولم ولو بشاۃ (بخاری باب الولیمۃ حق) دعوت ولیمہ کرو خواہ ایک ہی بکری سے ہو۔

عدت میں نکاح: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَہٗ (البقرہ ۲: ۲۳۵) اور نکاح کی گرہ کو پختہ نہ کرو یہاں تک کہ عدت پوری نہ ہوجائے۔ تہذیب و تمدن اور معاشرہ کی اساس خاندان ہے اس وجہ سے اسلام نے خاندان کے ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لیے یہ حکم دیا ہے۔ نہ زانیہ عورتوں سے نکاح کیا جائے نہ بدکاروں سے مومن اور پاک عورتوں کو بیاہا جائے۔ صرف پاک مرد اور پاک عورت کے ساتھ نکاح ہونا چاہیئے۔

زانیہ کے متعلق: وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (النور ۲۴: ۳) اور زنا کرنے والی عورت کے ساتھ سوائے زانی یا مشرک کے کوئی نکاح نہیں کرسکتا اور یہ مومنوں پر حرام ہے۔

بدکاروں سے نکاح نہ کیا جائے: اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً" (نور ۲۴: ۳) زانی مرد کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔

پاکیزہ مردوں کے لیے پاکیزہ عورتیں اور پاکیزہ عورتوں کے لیے پاکیزہ مرد :
وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور ۲۴ : ۲۶) پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔

تعداد ازدواج : اسلام سے پہلے دنیا کی دوسری قوموں میں تعدد ازدواج کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مذہبی کتاب نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو۔ ہر مذہب کے مقدس بزرگوں نے ایک سے زائد بیویاں کیں۔ سری کرشن جی کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔ راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی نو اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔[1]

عرب میں تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ قبائل کے رؤسا ایک سے زائد بیویاں کرتے تھے۔ مردوں کا صرف ایک شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

فرانس کا مشہور سائنس دان مانٹسکو یہ کہتا ہے کہ

میروونجین کے بادشاہاں جنہوں نے پانچویں صدی سے لے کر ۷۵۲ء تک فرانس پر حکومت کی ایک سے زیادہ بیویاں کرتے تھے۔ اور اس کو اپنی شان وشوکت کا باعث خیال کرتے تھے۔ ایک سیاح عورت لکھتی ہے۔

"امریکہ میں میکسک بادشاہوں کے خلفاء اور مقربین کا یہ اعتقاد تھا کہ عورتوں اور لونڈیوں ہی کی کثرت سے وہ بلند مرتب اور عالی مقامات حاصل کر سکتے ہیں۔"

برٹن کہتا ہے :-

"افریقہ کے بعض قبائل میں زیادہ عورتیں رکھنے والے کو قابل فخر ومباہات گردانا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بارہ سے تین سو عورتوں تک اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔"

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقوام عالم میں تعدد ازدواج کا رواج تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔

---

[1] سلاطین ۱۱ : ۳

۱- زیادہ بیویاں رکھنے کو وجہ تکریم و فخر گردانا جاتا تھا۔ ان کی تعداد سے ہی مرد کی شجاعت، قوت اور ثروت کا اندازہ لگایا جاتا تھا جیسا کہ بریٹن اور مانٹسکو کے بیان سے ظاہر ہے۔

۲- افریقہ میں مرد عورتوں سے امور خانہ داری کے علاوہ باغوں، کھیتوں اور دوسرے کاروبار میں کام لیتے تھے۔ عورتوں کا دائرہ عمل صرف گھر ہی نہ تھا بلکہ باہر بھی تھا اس وجہ سے امراء کی یہ عادت تھی کہ کئی کئی بیویاں کرتے تھے۔ تاکہ ان کو اقتصادی امور سونپے جا سکیں۔ لیبان تمدن عرب میں لکھتا ہے اس کے علاوہ مشرق میں جن گھرانوں کا دار و مدار زراعت اور مویشی پر ہے ان میں لبسا اوقات جب پہلی بیوی تنہا گھر اور کھیتی کا انتظام نہیں سنبھال سکتی تو وہ خود شوہر کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کرتی۔

۳- تعدد ازدواج کا ایک سبب دینی مصلحت بھی تھا۔ چنانچہ شیوی کے قبائل کا یہ عقیدہ تھا کہ زیادہ بیویاں کرنے والا ان کے معبود روح اکبر کے نزدیک محبوب ہوتا ہے۔

۴- تعدد ازدواج کا سبب آب و ہوا کے اثرات بھی ہے۔ جن ممالک کی آب و ہوا گرم ہوگی وہاں تعدد ازدواج کا رواج عام ہوگا۔ یہی وجہ ہے افریقہ اور اہل مشرق میں زیادہ رواج ہے۔

۵- بعض اوقات عورتوں کی بیماری سبب بن جاتی ہے کہ دوسری بیوی کی جائے۔

۶- دنیا میں لڑائیوں کا سلسلہ غیر متناہی ہے۔ مرد مر جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے بیوہ اور یتیم پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے دوسری شادی کرنے کی اجازت ضروری ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک میں لڑائیوں کا لمبا سلسلہ ہو جانے کی وجہ سے مرد کم رہ جاتے ہیں اور عورتیں زیادہ۔ تو معاشرہ کو برائیوں اور بے حیائیوں سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کی جائیں۔

اسلام میں تعدد ازدواج:

اسلام اصولی طور صرف ایک ہی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں ایک سے زائد عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت بھی دے

دی ہے۔ ارشاد ہے :

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً [1] اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند ہوں۔ دو دو اور تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی۔ یہی وہ قرآن مجید کی آیت ہے جس میں تعدد ازدواج کا ذکر ہے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اس آیت کریمہ میں حکم نہیں بلکہ ضروریات اور شرائط کے ساتھ اجازت دی گئی ہے جب تک وہ ضرورت اور اسباب پیدا نہ ہوں۔ اُس وقت تک دوسری شادہ کرنا مستحب نہیں۔

قرآن مجید نے تعدد ازدواج کی افرادی اور ملکی ضرورتوں تصریح نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ انسانی ضروریات زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے تعدد ازدواج کو وقتی ضروریات کے ساتھ مقید کر دیا ہے کہ جب بھی تعدد ازدواج کی ضرورت پڑے تو اس تعلیم پر عمل کر لیا جائے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو حسب ذیل اسباب اور ضروریات کے تحت دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔

۱۔ دنیا میں اکثر خون ریز جنگیں ہوتی رہتی ہیں جن میں لاکھوں مرد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت اگر ایک سے زائد بیویاں نہ کی جائیں تو عورتوں کی ایک خاصی تعداد باقی رہ جائے گی۔ جن کو عائلی زندگی میسر نہ ہو گی اور وہ بے حیائیوں میں مبتلا ہو جائیں گی۔ ہربرٹ اسپنسر اپنی کتاب علم الاجتماع میں لکھتا ہے۔

"تعدد زوجات قوموں کے لیے بے حد مفید ہے۔"

آگے لکھتا ہے

"جب کسی قوم پر کوئی ایسی حالت طاری ہو مثلاً جنگوں اور خون ریزیوں کی وجہ سے اس قوم کے اکثر مرد وں کی جانیں تباہ ہو جائیں اور ان عورتوں

---

[1] النساء ۴ : ۳

کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے جن کے شوہر مر چکے ہیں یا مردم شماری میں اناث کی زیادتی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نسل میں انحطاط واقع ہو جائے گا۔"

مسز برڈسل کال کنز صدر ینگ ومن کرسچین ایسوسی ایشن نے واشنگٹن میں بیان دیتے ہوئے کہا ہے:

"امریکہ میں چودہ سال سے اُوپر کی جوان لڑکیوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے جو سب کی سب کنواری ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کنواروں کی تعداد نوّے لاکھ ہے۔ اس حساب سے تیس لاکھ کنواری لڑکیوں کے لیے شوہروں کا ملنا محال ہے۔ کیونکہ جنگ نے مردوں اور عورتوں کا عددی توازن بہت بڑی حد تک خراب کر دیا ہے۔"[1]

جس زمانے میں تعدد ازدواج کی اجازت نازل ہوئی تھی وہ لڑائیوں کا زمانہ تھا۔ مسلمان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی سرپرستی میں آئیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ حکم نازل ہوا۔

۲ - عورت ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس سے اولاد کے پیدا ہونے کی امید نہ رہے۔ ایسی صورت میں مرد اولاد کے لیے دوسری شادی کر سکتا ہے۔

۳ - بعض اوقات سوسائٹی میں زنا کاری اور بے حیائی کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس بیماریوں کا واحد علاج تعدد ازدواج ہے۔ چنانچہ مشہور فلسفی سر ٹامس ہور قسم کی بیماریوں کا علاج تجویز کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مرد کے لیے ایک سے زیادہ عورتوں کو مباح کر دیا جائے۔ یہی ایک دوا ہے جو تمام مہلک امراض کے حق میں تریاق ہے اور یہی وہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ جو سوسائٹی کے زہریلے جراثیم کو تباہ کر دیتا ہے۔ یورپ میں سب سے بڑی بیماری اور متعدی بلا یہ ہے کہ یہاں مردوں نے محض ایک عورت پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہی وہ تحدید ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنے

---

[1] زمزم لاہور ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء

اور بر سر بازار زنا فحش کاری کرنے غرض دنیا بھر کی بُرائیوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بننے کے لیے آمادہ کر دیا ہے۔ اگر یہی حال رہا اور تعدد ازدواج کو مباح قرار دینے کے لیے کوئی قانون نافذ نہ ہُوا تو اس طوفان بدتمیزی کے اور بڑھ جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ افسوس اگر اس مسئلہ کو پہلے ہی مباح قرار دیا جاتا تو آج اس قدر لاوارث اولاد جو حرام کاری کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ابنائے قوم و وطن کے باعث ننگ و عار اور انسانیت کے دامن پر بدنما داغ ثابت نہ ہوتی ؟"

تعدد ازدواج کی اصلاح : اسلام نے انفرادی اور ملکی ضرورتوں کی وجہ سے تعدد ازدواج کی رسم کو باقی رکھا لیکن اس رسم میں جو خرابیاں تھیں ان کی اصلاح کر دی۔ اسلام سے قبل تعدد ازدواج میں یہ خرابی تھی کہ مرد بلا تعیین عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے اسلام نے چار کی حد بندی کر دی جیسا کہ ارشاد ہے: فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ [۱] پس ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں۔ دو دو اور تین تین اور چار چار چنانچہ جی ڈبلیو لائنز اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب Esseys on Muhammadanism میں لکھتا ہے۔

"اس غیر محدود تعدد ازدواج کو جو صورت حالات کا ذمہ دار تھا پیغمبر اسلام نے روک دیا انہوں نے اذن دیا مرد دو یا تین یا چار عورتوں سے عقد کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان سب کے ساتھ ویسے ہی انصاف کی زندگی بسر کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کو صرف ایک بیوی کی اجازت تھی۔ اب چونکہ کوئی شخص بطور قاعدہ دو یا زیادہ بیویوں کے ساتھ اسی انصاف سے نہیں رہ سکتا لہٰذا پیغمبر اسلام کے قانون کی روح صاف طور پر اسی طرح مائل نظر آتی تھی کہ ایک بیوی کے ساتھ شادی کی جائے۔"

دوسری اصلاح : اسلام سے قبل فخر و مباہات، شان و شوکت قوت و شجاعت

---

[۱] النساء ۴ : ۳

کے اظہار کے لیے بلا تعین تعدد ازدواج کا رواج تھا۔ خاوند نہ تو بیویوں میں عدل وانصاف قائم کر سکتے تھے اور نہ کرتے تھے۔ اس برائی کو ختم کرنے کے لیے اسلام نے یہ حکم دیا کہ اگر بیویوں میں عدل ومساوات قائم نہیں کر سکتے تو صرف ایک ہی نکاح کیا جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً [1] اگر تمہیں خوف ہو کہ بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو بس ایک ہی بیوی کرو۔ دوسری جگہ آتا ہے: فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ [2] بس بالکل ہی نہ جھک جاؤ کہ ادھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں:

اذا کانت عند الرجل امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيمة وشقه ساقط۔ رواہ الترمذی وغیرہ (مشکوٰۃ باب القسم) جب کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے تو قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا پہلو ساقط ہوگا۔

تعدد ازدواج غیروں کی نظر میں: تجربہ کے بعد اب حقیقت پسند دوسرے مذاہب کے علماء نے بھی اسلام کے قانون "تعدد ازدواج" کو درست تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ معاشرہ کی بعض خرابیوں کا علاج اسی قانون کو تجویز کیا ہے۔ چنانچہ لندن کے ایک سکول کی اُستانی میری اسمتھ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

> "یک زوجی کا جو قاعدہ قانون برطانیہ میں چلا ہوا ہے وہ تمام تر غلط ہے۔ مردوں کو دوسری شادی کی اجازت ملنا چاہیے۔"

ایک اور جگہ لکھتی ہے

> "چونکہ اس ملک برطانیہ میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے اس لیے ہر عورت شوہر کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

اِس کے بعد اس نے کہا ہے،

> "ایک بیوی کا رواج ناکام ہو چکا ہے اور یہ رواج کوئی سائنٹیفک نہیں ہے۔" [3]

---

[1] النساء ۴: ۳ [2] النساء ۴: ۱۲۹

[3] ندائے حرم کراچی ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ

انگلستان میں جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے سترھویں صدی سے کثرت ازدواج کا چرچا شروع ہوگیا۔ چنانچہ ۱۶۵۸ میں ایک شخص نے زناکاری اور نومولود حرامی بچوں کی اموات کو روکنے کے لیے کثرتِ ازدواج کی حمایت میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان کے ایک قابل اعتماد اور صاحب کردار پادری نے اس مسئلہ کی تائید میں ایک کتاب لکھی مشہور ماہر جنسیات جیمیس ہلٹن نے فحاشی اور زناکاری کو روکنے کے لیے کثرت ازدواج کے طریقہ کو اختیار کرنے کی رائے دی[۵۱]

"لوگ سمجھتے ہیں تعدد ازدواج اور وحدت ازدواج کے مقابلہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اصل مقابلہ ہے محدود تعدد ازدواجی کا لامحدود حرام کاری سے اسلام بعض سخت شرائط کے تحت محدود تعدد ازدواجی کی اجازت اس لیے دیتا ہے کہ لامحدود حرام کاری کا سدِ باب ہو لیکن جو وحدت ازدواجی کے قائل ہیں ان کے پاس لامحدود حرام کاری کے انسداد کا کوئی علاج نہیں اسی لیے تو وہ تعدد ازدواجی کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں۔ مگر یہ آواز بلند نہیں کرتے کہ ایک عورت والے مرد کو دوسری جگہ شہوانی جذبات کی سیری کے لیے منہ کالا کرنا چاہیے۔[۵۲]"

"مدارس ہندو مہا سبھا نے ہندو کمیٹی کے نام جو یادداشت ارسال کی ہے۔ اس میں پہلی بار ہندو سوسائٹی کے لیے بعض ایسے حالات میں تعدد ازدواج کی ضرورت کا اعتراف کیا گیا ہے یعنی ہندوؤں کو بعض ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں جن میں ایک مرد کو کئی عورتوں سے شادی کی اجازت ہونی چاہیے[۵۳]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد زوجات کے اسباب: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت کے تعدد زوجات کے دو سبب تھے ایک سبب دینی تھا اور دوسرا ملکی قرآن مجید نے دینی غرض ان الفاظ میں بیان کی ہے: وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا[۵۴] (اے نبی کی بیویو!) اسے یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں

---

۵۱ اسلام اور جنسیات صفحہ ۲۸۶ ۵۲ زمزم لاہور ۷ اگست ۱۹۴۵ء
۵۳ زمزم لاہور ۲۳/ فروری ۱۹۴۵ء ۵۴ الاحزاب ۳۴

اللہ کی آیتوں اور حکمت سے پڑھا جاتا ہے۔ اللہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے۔

اس آیت میں ازدواج مطہرات کے رسول کریم صلعم کے عقد نکاح میں آنے کی یہ غرض بیان کی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اسلام میں عورتوں کے بعض ایسے مسائل ہیں جن کو مرد شرم وحیا کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہ رض کی ایک حدیث ہے کہ اسماء بنت یزید انصاریہ نے رسول کریم صلعم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ میں غسل حیض کس طرح کروں۔ آپ نے فرمایا ایک روئی کا ٹکڑا رکھ لے اور وضو کر لے۔ اس کے بعد آپ نے شرم وحیا کی وجہ سے اپنا روئے مبارک پھیر لیا۔ حضرت عائشہ رض پاس ہی کھڑی تھیں۔ اسماء کا دامن کھینچا اور رسول کریم صلعم کی مراد کو سمجھایا۔

عورتوں کے اس قسم کے مسائل اور احکام کی تعلیم واشاعت کے لیے متعدد نکاحوں کی ضرورت تھی۔ رسول کریم صلعم کا یہ قول بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے: خذوا دینکم من هذه الحميرا یعنی تم اپنا دین حضرت عائشہ سے حاصل کرو۔

ملکی ضرورت: رسول کریم صلعم نے متعدد شادیاں بچپن اور ساٹھ سال کی عمر کے درمیان کی تھیں اور یہی زمانہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کا ہے۔ جب کفار مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا ارادہ کر چکے تھے اور ان کا ہر حملہ پہلے حملے سے زیادہ زبردست ہوتا تھا۔ مسلمان دن رات مسلح رہتے تھے۔ کبھی تنگ آ کر یہ کہتے تھے اے اللہ کے رسول ہم دن رات زرہ لگائے اور ہتھیار پہنے تھک گئے ہیں تو آپ جواب دیتے تھے کہ یہ زمانہ ختم ہو جائے گا۔

آپ ہر وقت اس فکر میں غلطاں رہتے کہ کس طرح مٹھی بھر مسلمانوں کی حفاظت کی جائے۔ آپ کو صرف بیرونی دشمنوں سے ہی واسطہ نہیں تھا بلکہ مدینہ کے اندر یہود اور منافق بھی مار آستین بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہر وقت مسلمانوں کو گزند پہنچانے کے لیے منصوبے گھڑتے رہتے تھے۔ ان حالات میں بھلا کسی کو رنگ رلیاں اور عیاشی سوجھ سکتی ہے اور رات کو عیش و طرب کی محفل جمائی جا سکتی ہے۔ ان تاریک حالات میں طاقتور دشمن پر غلبہ حاصل کرنا اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ معترضین کا اعتراض بالکل باطل ہے کہ آپ نے شادیاں عیش و عشرت کے لیے کی تھیں۔

عیش و عشرت کا زمانہ تو شباب کا ہوتا ہے۔ جب رگوں میں تازہ اور گرم خون دوڑ رہا ہوتا ہے۔ یا فارغ البالی اور اقتدار کا زمانہ۔ رسول کریم صلعم عین شباب کی بہاروں میں صرف ایک چالیس سالہ عورت سے شادی کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں ایک وقت وہ بھی آیا جب کفار نے عرب کی حسین ترین عورت سے شادی کرانے کی پیش کش کی۔ لیکن آپ نے ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

جب رسولِ کریم صلعم نے تمام دشمنوں کو زیر کر لیا۔ اور آپ کے اقتدار کا پرچم تمام عرب پر لہرانے لگا۔ اس زمانہ میں بھی کوئی شادی نہیں کی۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی راتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ رات کا اکثر حصہ بارگاہ الٰہی میں قیام کے ساتھ گزارتے تھے اور قیام بھی اتنا لمبا کہ پاؤں متورم ہو جاتے تھے۔

پس بڑھاپے میں آپ کا متعدد نکاح کرنا اور صرف جنگ کے زمانہ تک کرنا صاف بتاتا ہے کہ تعدد ازدواج کا تعلق جنگ سے ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگوں میں مرد مارے جاتے ہیں عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ عورتوں کی خبر گیری اور ان کو بے حیائیوں سے بچانے کے لیے ایک مرد متعدد شادیاں کرے۔ پس رسول کریم صلعم نے بیواؤں کی خبر گیری کے لیے متعدد نکاح کیے۔ باسورتھ اسمتھ ایک عیسائی مصنف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

"یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت محمد (صلعم) کے بہت سے نکاحوں کی جہاں دیگر وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہ نکاح ان بیبیوں پر رحم کھا کر کیے جو بے کس بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ یہ عورتیں قریباً سب کی سب بیوہ ہی تھیں اور ان کے حسن و دولت کا کوئی شہرہ نہ تھا بلکہ بات اس کے برعکس تھی۔

طلاق: اگر مرد و عورت کے تعلق ازدواج اتنے خراب ہو جائیں کہ باہمی محبت اور اتحاد کی زندگی گزارنا محال ہو جائے تو ایسے موقع پر مرد عورت کو علیحدہ کر سکتا ہے۔

طلاق کا قانون تورات میں: یہودیت میں طلاق کا کلی اختیار خاوند کو حاصل ہے۔ جب چاہے ادنیٰ وجوہ کی بنا پر طلاق دے سکتا ہے۔ کیونکہ یہودیت میں عورت کی حیثیت محض ایک مملوکہ شے کی ہے اور مرد مالک اور مختار۔ شریعت کے تمام احکام اسی مرکزی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ چنانچہ تورات میں لکھا ہے۔

"اگر کوئی مرد کوئی عورت لے لے۔ اُس سے شادی کرے اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو اس سبب سے کہ اس نے اس میں کچھ پلید بات پائی ہو تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ دے اور اُسے اپنے گھر سے باہر کر دے[1]۔"

طلاق کے متعلق یہود کا شدید اختلاف ہے فرقہ شمائی کہتا ہے کہ عورت جب تک زنا کا ارتکاب نہ کرے اس وقت تک مرد اُسے طلاق نہیں دے سکتا ہے۔ مگر ہل جو شمع کا شاگرد تھا۔ اور اس کا ایک فرقہ تھا وہ کہتا ہے کہ خاوند ادنیٰ قصور پر بھی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اچھا کھانا تیار نہ کر سکے کوئی اور عورت پسند آجائے۔ استثناء ۲۱ : ۱۴ میں ہے کہ:

"جب کسی کو اسیران جنگ میں سے کوئی عورت پسند آ جائے تو وہ اُسے اپنی بیوی بنا لے۔ اس کے بعد اگر وہ اسے اچھی نہ لگے تو اُسے گھر سے نکال دے۔"

عزیر نبی نے بنی اسرائیل سے عذاب الٰہی دُور کرنے کے لیے تمام اجنبی عورتوں کو طلاق دلوا دی۔ اسی طرح نحمیاہ ۱۳ : ۲۰ میں غیر اقوام کی عورتوں کو طلاق دینے کا حکم موجود ہے غرض کہ یہودی شریعت میں طلاق کا کلی اختیار مرد کے ہاتھ میں ہے جب چاہے بیوی کو طلاق دے کر گھر سے باہر نکال سکتا ہے۔

قانون طلاق عیسائیوں میں: پہلے عیسائیت میں طلاق سرے سے جائز نہ تھی میاں بیوی کا رشتہ ازدواج دوامی سمجھا جاتا تھا۔ فریسیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کیا ہو کیا جائز ہے کہ مرد ہر ایک سبب سے اپنی بیوی کو طلاق دے دے[2]۔ آپ نے فرمایا جسے خدا نے ملایا ہے اُسے انسان جُدا نہ کرے[3]۔

ایک لمبے عرصہ تک مسیحی دُنیا اس قانون پر عامل رہی۔ جب عملی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان تفریق نہ ہونے کی وجہ سے دشواریاں پیدا ہوئیں اور یہ قانون وبال جان بنا تو مشرقی کلیسا نے بعض حالتوں میں طلاق جائز قرار دیا۔ مگر مغربی کلیسا نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

آہستہ آہستہ اس قانون کی اصلاح کے لیے آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں۔ مختلف زمانوں میں مختلف اصلاحیں ہوتی رہیں ۱۹۱۰ء میں انگلستان میں طلاق اور نکاح کے مسائل

---

[1] استثناء ۲۴ : ۱ [2] متی ۱۹ : ۳ [3] متی ۱۹ : ۶

پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا اس نے سفارش کی کہ اسباب طلاق کے اعتبار سے مرد و عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے۔ یعنی جن وجوہ کی بنیاد پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہے۔ ۱۹۲۳ء کے قانون میں یہ شامل کر لیا گیا کہ مرد اگر ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے تو عورت مرد سے طلاق لے سکتی ہے۔

یہودی شریعت میں افراط سے کام لیا گیا اور عیسائیت میں تفریط سے۔ جونہی طلاق کی اجازت دی گئی تو طلاق کثرت سے ہونے لگیں۔ چنانچہ آر نفر گار فیلڈ ہیس ایم اے ایل ایل بی ایک مقالہ میں لکھتا ہے۔

"بیس سال قبل ہر سات شادیوں میں طلاق ہوتی تھی اب اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ولایات متحدہ میں ہر تین شادیوں میں ایک طلاق ہونے لگی۔ یہ شرح کچھ عرصہ سے برابر بڑھتی جا رہی ہے[1]"

"انگلستان کی ایک عدالت جب تعطیل کے بعد کھلی تو پہلے ہی روز چار ہزار ایک سو نو طلاقوں کی درخواستیں پیش ہوئیں[2]"

قانون طلاق اور ہندو مت: سنسکرت میں بیوی کو پتنی اور خاوند کو پتی کہا جاتا ہے پتی کے معنی مالک کے ہیں اور پتنی کے معنی مملوک۔ بیوی اپنے اختیار سے خاوند سے الگ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ خاوند کی مملوکہ ہے۔ بودھائی سمرتی صرف مرد کو طلاق کا اختیار دیتی ہے۔ مرد اس عورت کو طلاق دے کر الگ کر سکتا ہے جو دس برس تک بچہ پیدا نہیں کرتی۔ جو صرف لڑکیاں ہی پیدا کرتی جائے اسے بارہویں سال، جس کے بچے مرتے چلے جائیں اسے پندرھویں سال اور جو جھگڑالو ہو تو اسے فوراً الگ کیا جا سکتا ہے۔ مگر منو سمرتی میں لکھا ہے کہ خاوند سے دشمنی کرنے والی عورت کو ایک سال تک دیکھا جائے۔ ایک سال کے بعد اس سے زیور کپڑا چھین کر اسے طلاق دے دی جائے۔ جو عورت نشہ یا بیماری کی وجہ سے خاوند کی ہتک کرے اس کے کپڑے زیور چھین کر تین ماہ کے بعد اسے گھر سے نکال دے۔ عورت کے اولاد نہ ہوتی ہو تو آٹھویں برس، ہو کر مر جاتی ہو تو دسویں برس، اگر لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہوں تو گیارہویں برس دوسرا بیاہ کرے اور اگر بیوی سخت کلام ہو تو فوراً

---

[1] صدق جدید لکھنؤ ۱۸ جنوری ۱۹۵۲ء [2] زمزم لاہور ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء

دوسرا بیاہ کرے۔[1]

ہندو مذہب میں طلاق کا قانون غیر انسانی اقتدار پر مبنی ہے۔ صرف عورت کو طلاق لینے کے حق سے محروم ہی نہیں کیا گیا بلکہ عورت کو مرد کے ہاتھ میں قیدی بنا دیا گیا ہے۔

اسلام کا قانون طلاق: اسلام نے جو طلاق کا قانون پیش کیا ہے وہ افراط و تفریط سے پاک اور اعتدال پر مبنی ہے۔ اس قانون میں مرد اور عورت دونوں کو پورا پورا حق دیا ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں لیکن یہ حق مخصوص حالات کے تابع ہے۔ اگر میاں بیوی دیکھیں کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض ادا نہیں کر سکتے۔ ان کے اکٹھا رہنے سے اولاد اور دوسرے رشتہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ نکاح کی روح مجروح ہوتی ہے تو اس وقت میاں بیوی ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید اور رسول کریم صلعم کی یہ واضح تعلیم ہے کہ علیحدہ ہونے سے پہلے ہر ممکن کوشش کر لینی چاہیئے کہ وہ حالات سدھر جائیں جن کی بناء پر علیحدگی اختیار کی جا رہی ہے۔ اسلام نے طلاق کے بارہ میں عجلت سے روکا ہے۔ شریعت اسلام میں گو طلاق جائز ہے مگر رسول کریم صلعم نے اُسے حلال چیزوں میں سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ بتایا ہے رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق[2] حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اللہ تعالیٰ کو طلاق ہے۔ ولا خلق اللہ شیئا علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق[3] اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر طلاق سے بڑھ کر کوئی چیز مبغوض پیدا نہیں کی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا[4] اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔

یہ آیت طلاق سے باز رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔

طلاق دینے سے پہلے مصالحت کی کوشش: اسلامی سوسائٹی کی بنیاد محبت

---

[1] تفصیل کے لیے منو ۹: ۷۷-۷۸: ۸۱ ستیارتھ پرکاش باب ۴ ملاحظہ کریں۔

[2] مشکوۃ المصابیح کتاب الطلاق صفحہ ۲۸۳ [3] مشکوۃ المصابیح کتاب الطلاق صفحہ ۲۸۴

[4] النساء ۴: ۲۰

اور اخوت پر ہے۔ سوسائٹی کے تمام افراد جسم کے اعضا کی مانند ہیں جس طرح جسم کے کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو تمام جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کے کسی ایک فرد کو تکلیف پہنچے تو تمام سوسائٹی اس تکلیف سے متاثر ہوتی ہے۔ اسی اصول کے تحت گو طلاق کو حلال قرار دیا ہے لیکن اس فعل کو ناپسندیدہ اور مبغوض سمجھا ہے اس وجہ سے اس حلال فعل کو روکنے کے لیے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان کشیدگی اور اختلاف پیدا ہو جائے تو جہاں تک ممکن ہو دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ارشادِ الٰہی ہے : وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا [۱] اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہمی دشمنی کا ڈر ہو۔ تو ایک فیصلہ کرنے والا اس مرد کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنے والا اس عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو۔ اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان میں موافقت کر دیگا۔ بے شک اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ [۲] اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح اچھی چیز ہے۔

ان آیات میں منصفین کا یہ کام بیان کیا ہے۔ کہ وہ میاں بیوی کی کشیدگی کی وجوہ معلوم کر کے ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں۔ صلح کی کوشش کے ناکام ہونے کی صورت میں آخری انقطاع ہو گا۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاوند اپنی مرضی سے نکاح فسخ نہیں کر سکتا۔ فیصلہ منصفوں کے ہاتھ ہو گا۔ اور فریقین کو منصفوں کے فیصلے کی پابندی لازمی ہو گی۔

طلاق پر پابندیاں: طلاق دینے کی پہلی شرط یہ ہے کہ حالت طہر میں دی جائے حالت حیض میں میاں بیوی زن و شوئی تعلقات سے الگ ہوتے ہیں۔ ناراضی اور

---

[۱] النساء ۴ : ۳۵ [۲] النساء ۴ : ۱۲۸

کشیدگی کو دور کرنے کے موقعے نہیں ملتے۔ مگر حالت طہر میں خاوند بیوی میں تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اختلاف دُور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے ایام حیض میں طلاق دینا ممنوع قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ[1] اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ حالت طہر سے حیض میں داخل ہونے کا نام ہے۔ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حالت حیض میں طلاق دے دی تو رسول کریم صلعم سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا[2] یہ شرط طلاق پر ایک روک ہے۔ دوسری حد بندی عدت ہے جو آخری انقطاع کے راستے میں ایک روک ہے۔ اختلاف اور کشیدگی پیدا ہونے کے بعد بھی اسلام نے فریقین کو یہ موقع دیا کہ ہر طلاق کے بعد عدت مقرر کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ[3] اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کے شروع میں طلاق دو۔

عدت تین طہر ہے: يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ سے ظاہر ہے عام حالتوں میں یہ تقریباً چار مہینے کا عرصہ ہوتا ہے جن عورتوں کے حیض بند ہو گئے ہو گئے ہیں ان کی عدت تین ماہ کی ہے[4] اور حاملہ عورتوں کا زمانہ انتظار وضع حمل تک ہے ارشاد الٰہی ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ[5] اور حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ بچہ جنیں۔

تیسری حد بندی: عدت گزرنے کے بعد بھی دوبارہ نکاح کی اجازت ہے۔ ارشاد ہے: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ[6] اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی مراد کو پہنچ جائیں تو اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوندان سے نکاح کر لیں جب آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ معقل بن یسار کی

---

[1] البقرہ ۲: ۲۲۸ [2] بخاری کتاب الطلاق باب قول اللہ تعالیٰ یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء [3] الطلاق ۶۵: ۱ [4] الطلاق ۶۵: ۴
[5] الطلاق ۶۵: ۴ [6] البقرہ ۲: ۲۳۲

کی ہمشیرہ کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی۔ جب عدت گزر گئی تو خاوند نے دوبارہ اس سے نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ معقل نے انکار کر دیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تو معقل نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح پہلے خاوند سے کرایا۔ بیوی بھی رضامند تھی۔

چوتھی حد بندی: جس طرح زمانہ انتظار میں رجوع کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح عدت گزر جانے کے بعد بھی نکاح جائز ہے۔ قابل منسوخ طلاق جس کو فقہا نے طلاق رجعی کا نام دیا ہے دو دفعہ دی جا سکتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ [1] طلاق دو دفعہ ہے۔ پھر نیک طور پر رکھنا یا حسن سلوک سے رخصت کرنا ہے۔

پانچویں حد بندی: قرآن مجید کی تعلیم کی رو سے عورت کو مہر کی ادائیگی ضروری ہے۔ یہ ادائیگی خاوند کو بلا وجہ طلاق دینے میں مانع ہے ارشاد الٰہی ہے: وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ [2] اور تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم اس مال سے جو کچھ لو جو تم نے انہیں دیا سوائے اس کے کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے پس اگر تم میں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس کے بارہ میں کچھ گناہ نہیں۔ جو عورت فدیہ دے دے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً [3] اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو۔

چھٹی حد بندی: طلاق مغلظ۔ طلاق کی آزادی پر ایک زبردست روک ہے خاوند تیسری طلاق بڑے غور و خوض کے بعد دے گا۔ کیونکہ اس کو علم ہے اس طلاق کے بعد شادی نہیں کر سکتا ہے جب تک وہ کسی اور خاوند کے عقد نکاح میں نہ جائے اور وہ اپنی مرضی سے اس کو طلاق دے دے۔

طلاق کی اقسام: فقہا نے طلاق کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

---

[1] البقرہ ۲: ۲۲۹ [2] البقرہ ۲: ۲۲۹
[3] النساء ۴: ۴

الف: تین طلاقیں دی جائیں تو وہ طلاق مغلظہ کہلاتی ہے۔ طلاق مغلظہ کے بعد میاں بیوی رجوع نہیں کر سکتے جب تک مطلقہ کوئی دوسرا نکاح نہ کرے پھر دوسرے خاوند سے طلاق یا موت کی وجہ سے جدائی ہو کر عدت پوری نہ کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ [1] پھر اگر وہ اسے تیسری بار طلاق دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے خاوند سے نکاح کرے پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں اگر وہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں بشرطیکہ ان کو یقین ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔

ب: تین سے کم طلاقیں دی جائیں اور عدت گزر جائے تو وہ طلاق بائنہ کہلاتی ہے میاں بیوی کے درمیان جدائی ہو جائے گی لیکن میاں بیوی دوبارہ زوجین بننا چاہیں تو تجدید نکاح سے زوجین بن سکتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ [2] طلاق دو دفعہ ہے پھر پسندیدہ طور سے رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے۔

ج: تین سے کم طلاقوں میں عدت ختم نہ ہوئی ہو تو قول یا عمل سے رجوع ہو سکتا ہے تجدید نکاح کی کوئی ضرورت نہیں۔

طلاق دینے کی تین صورتیں: طلاق دینے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک ہی وقت تین طلاقیں دے دی جائیں اور ان کو تین طلاقیں خیال کر لی جائیں۔ یہ طلاق بدعی ہے۔ اس طلاق کو نبی کریم صلعم نے سخت ناپسند کیا ہے نسائی کی روایت ہے کہ رسول کریم صلعم کو ایک شخص کے متعلق خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو تین مرتبہ اکٹھی طلاق دی ہے:۔

فقام غضبان ثم قال ایلعب بکتاب اللہ عزوجل وانا بین اظہرکم [3] آپ غصہ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ کیا اللہ کی کتاب سے ہنسی کی جاتی ہے اور میں تمہارے درمیان میں ہوں۔

---

[1] سورۃ البقرہ ۲: ۲۳۰ [2] البقرہ ۲: ۲۲۹

[3] مشکوۃ المصابیح باب الخلع والطلاق صفحہ ۲۸۴

اکٹھی تین طلاقیں دینے کا رواج زمانہ جاہلیت میں تھا۔ رسول کریم صلعم نے اس رواج کو ختم کیا اور یک وقت تین طلاقیں دینے کو تسلیم نہ کیا۔ ابو داؤد و ترمذی کی حدیث ہے رکانہ بن یزید نے رسول کریم صلعم کے پاس آیا اور عرض کی کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تیرا ارادہ کیا تھا تو کہا کہ میرا ارادہ ایک ہی طلاق کا تھا۔ آنحضرت نے رجوع کی اجازت دے دی[1]

صاحب فتح القدیر کہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر ایک ایسی نص ہے کہ جس میں کوئی تاویل نہیں ہو سکی۔ مولانا عبدالحیی فرنگی محل کے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ ایسی طلاق اگر موجب ہو تو بہت سی دشواریوں کا تو کسی شافعی عالم سے فتویٰ لے کر رجوع کر لیا جائے۔ انتہیٰ مخلصاً[2] ابن قیم اعلام الموقعین میں کہتے ہیں۔

"حضرت عبداللہ بن عباس رض حضرت علی رض اور حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے دونوں طرح کی روائتیں ہیں۔ یعنی ایک مجلس میں تین طلاقیں ایک ہی رجعی ہوں گی اور یہ کہ وہ مغلظہ ہوں گی۔ زبیر رض بن العوام۔ عبدالرحمٰن بن عوف عکرمہ طاؤس رح محمد بن اسحٰق خلاس رض۔ بن عمر و حارث عکلی۔ داؤد بن علی اور ان کے پیرو بعض مالکیہ خود بعض حنفی علماء اور حنبلی علماء اس کے قائل ہیں کہ ایسی طلاقیں ایک ہی طلاق ہو گی"[3]

طلاق کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو پہلی طلاق طہر میں دیتا ہے۔ پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دیتا ہے۔ اس طریقہ کو فقہاء نے طلاق حسن کہا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے ایک طہر میں صرف ایک دفعہ طلاق دی جائے اور اس کے بعد زمانہ انتظار گزر جائے۔ یہ طریقہ طلاق ہے جس کا علم قرآن اور احادیث سے ہوتا ہے۔

شرائط طلاق

طلاق کے لیے حسب ذیل شرائط ہیں:۔

---

[1] مشکوۃ المصابیح باب الخلع والطلاق صفحہ ۲۸۴ [2] فتاویٰ مولانا عبدالحیی صفحہ ۳۴۴
[3] اعلام الموقعین جلد اول صفحہ ۴۲

عقل: رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: کل طلاق جائز الا طلاق المعتوہ والمغلوب علی عقلہ[1] ہر طلاق جائز ہے سوائے مدہوش کے اور جس کی عقل پر غلبہ ہے۔

اختیار: رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق قیل معنی الاغلاق الاکراہ[2] اغلاق کی حالت میں طلاق اور عتاق نہیں ہے۔ اغلاق کے معنی اکراہ اور جبر کے ہیں۔

بلوغت: شریعت اسلامی میں نابالغ مکلف نہیں ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یبلغ عن المعتوہ حتی یعقل۔[3] تین آدمیوں سے باز پرس نہیں ہوتی سونے والے سے حتیٰ کہ وہ بیدار ہو جائے۔ بچے سے جب کہ وہ بالغ ہو۔ مغلوب العقل سے حتیٰ کہ ہوش میں آ جائے۔

گواہ: دو گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق درست نہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ[4] یعنی طلاق دیتے وقت دو معتبر گواہ بنا لو۔

حالت طہر: طلاق حالت طہر میں بغیر مواصلت کے دی جائے گی۔ ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ[5] اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی جب رسول کریم صلعم کو علم ہوا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور رجوع کا حکم دیا۔

حق حضانت: عورت کو حق حضانت دیا جائے گا۔ تمام اخراجات خاوند کے ذمہ ہوں گے۔ ابو داؤد میں ایک روایت ہے رسول کریم صلعم کے پاس ایک عورت نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ یہ میرا بچہ ہے جس کے لیے میرا شکم اس کا ظرف میرا سینہ کا مشکیزہ اور میری گود اس کا مسکن بنا رہا ہے۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اس بچے کو مجھ سے

---

[1] ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی طلاق المعتوہ مع شرح ابن عربی ج ۵ صفحہ ۱۶۷

[2] مشکوٰۃ المصابیح باب الخلع والطلاق صفحہ ۲۸۴ [3] ابن ماجہ سنن کتاب الطلاق باب الطلاق المعتوہ صفحہ ۱۶۸ جلد ۱ [4] الطلاق ۶۵: ۲

[5] الطلاق ۶۵: ۱

چھیننا چاہتا ہے آپ نے فرمایا کہ جب تک تیرا عقد ثانی نہ ہو اس بچے کی حقدار تو ہی ہے۔

عدت: طلاق کے بعد عدت ضروری ہے ارشاد ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ[1] اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔

نفقہ و سکنیٰ: عدت کے دوران نفقہ و سکنیٰ مرد پر لازم ہیں اگر بیوی حاملہ ہے تو وضع حمل تک کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے طریقہ طلاق کی اصلاح: زمانہ جاہلیت میں مرد عورتوں کو قسما قسم کے طریقوں سے ستانے اور تکلیف پہنچاتے اسلام نے صرف ستانے اور تکلیف دینے سے ہی نہیں روکا بلکہ علیحدگی کی صورت میں احسان اور شریفانہ طریقہ سے رخصت کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ[2] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے جائز نہیں کہ عورتوں کو زبردستی ورثہ میں لو اور نہ ان کو روک رکھو اس لیے کہ اس کا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انہیں دیا ہے سوائے اس کے وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔

عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب ایک شخص اپنی بیوی کو ناپسند کرتا تو بجائے اس کے کہ اسے طلاق دے اسے روکے رکھتا اور اس کو طرح طرح کی تکالیف دیتا یہاں تک کہ بیوی تنگ آکر یہ شرط قبول کر لیتی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ اس کو دے دے گی۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ[3] اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انہیں اس بات سے نہ روکو کہ وہ خاوندوں سے نکاح کر لیں جب وہ آپس میں پسندیدہ طور پر راضی ہوں۔

اس آیت میں یہ تعلیم دی ہے کہ مدت گزر جانے کے بعد عورت کو شادی کرنے سے روکنا نہیں چاہیئے۔ اسلام صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ مطلقہ عورتوں کو ستانا نہیں چاہیئے بلکہ یہ تعلیم دیتا ہے۔ مطلقہ عورت کو شریفانہ رویہ کے ساتھ رخصت کرو۔ ارشاد ہے: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ[4] یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دو۔

---

[1] البقرہ ۲: ۲۲۸ [2] النساء ۴: ۱۹ [3] ۲: ۲۳۲ [4] البقرہ ۲: ۲۳۱

خلع : خلع کے لغوی معنی ازالہ کے ہیں۔ لسان العرب میں ہے : خلع الرجل ثوبہ خلعاً ازالہ عن بدنہ ونزعہ عنہ [۱] یعنی آدمی نے کپڑے اُتارے اپنے بدن سے ہٹائے اور اُتارے۔ اسلام کی اصطلاح میں خلع اس ترکِ تعلق کو کہتے ہیں جو بیوی خاوند کو ناپسند کرنے کی وجہ سے مطالبہ کرتی ہے علیحدگی کے معاملہ میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ جس طرح مرد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خاوند سے علیحدگی کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے :
فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ [۲] پس اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو پھر اس بارے میں کچھ گناہ نہیں جو عورت فدیہ دے دے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر عورت طلاق لینا چاہے تو وہ بذریعہ قاضی طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ حدیث اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ واضح کرتی ہے۔ بخاری میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلعم نے ایک عورت سے جس کا نام امیمہ بنت الجون تھا نکاح کیا۔ جب آنحضرت اس کے قریب گئے تو اس نے کہا میں آپ سے پناہ مانگتی ہوں یعنی طلاق چاہتی ہوں۔ اس پر رسول کریم صلعم نے اس کو طلاق دیدی اور کچھ تحفے تحائف دے کر رخصت کیا [۳]

عن ابن عباس ان امرأة ثابت بن قیس اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللہ ما اعتب علیہ فی خلق ولا دین ولکن اکرہ الکفر فی الاسلام فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتردین علیہ حدیقتہ قالت نعم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقبل الحدیقة طلقها تطلیقة۔ [۴]

ابن عباس سے روایت ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا یا رسول اللہ میں اس کے خلق اور دین پر کوئی عیب نہیں لگاتی لیکن میں اسلام میں کفر کو پسند نہیں کرتی۔ اس پر رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ تو اس کا باغیچہ واپس کر دیگی

---

[۱] لسان العرب ج ۸ صفحہ ۲۸ [۲] البقرہ ۲ : ۲۲۹
[۳] بخاری کتاب ۶۸ الطلاق باب ۳
[۴] مشکوٰۃ المصابیح باب الخلع والطلاق صفحہ ۲۸۳

کہا ہاں آنحضرت نے فرمایا باغیچہ لے لو اور اسے طلاق دے دو۔

عن نافع عن مولاۃ لصفیۃ بنت ابی عبید انہا اختلعت من زوجھا بکل شئی لھا فلم ینکر ذلک عبد اللہ بن عمر[1].

یعنی نافع نے صفیہ بنت ابی عبید کی باندی سے روایت کیا ہے اس نے اپنے خاوند سے اس تمام مال کا بدلہ میں جو اس کے پاس تھا خلع لیا اور عبد اللہ بن عمر نے اسے ناپسند نہ کیا جس طرح رسول کریم صلعم نے مرد کا عورت کو طلاق دینے کو ناپسند کیا ہے۔ اسی طرح عورت کو خاوند سے خلع لینے کو ناپسند کیا۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: المختلعات من المنافقات[2] علیحدگی چاہنے والی اور خلع حاصل کرنے والی عورتیں منافق ہیں۔

ایما امرأۃ سالت زوجھا فی غیر ما بأس فحرام علیہ رائحۃ الجنۃ[3]

جو عورت اپنے شوہر سے کسی برائی کے بغیر ہی طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ خلع طلاق بائنہ ہوتی ہے۔ دوبارہ میاں بیوی بننے کے لیے تجدید نکاح ضروری ہے۔ علیؓ فرماتے ہیں: لاتکون طلقۃ بائنۃ الا فی فدیۃ او ایلاء۔ یعنی خلع اور ایلا کے سوا کوئی طلاق بائنہ نہیں ہوتی۔

خلع کی شرائط: (۱) حق مہر وغیرہ واپس خاوند کو لوٹانا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابن عباس کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلعم نے ثابت بن قیس کی بیوی کو باغیچہ واپس لوٹانے کو کہا۔

۲ - عورت محض ناموافقت طبع کی وجہ سے بھی خلع لے سکتی ہے۔ جیسا کہ جمیلہ کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں: ما اعتب علیہ فی خلق ولا دین یعنی میں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں اور نہ دین پر۔

۳ - میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کرنے سے قبل بعث حکمین کا حکم پورا کیا جائے۔

۴ - دو گواہ ٹھہرائے جائیں۔

۵ - تکمیل عدت تک نفقہ سکنی مرد کے ذمہ ہوگا۔

۶ - دودھ پلانے کی اجرت شوہر کے ذمہ ہوگی۔

---

[1] الموطا صفحہ ۴۲۸ [2] ترمذی

[3] مشکوۃ المصابیح باب الخلع والطلاق صفحہ ۲۸۳

۷۔ حق حضانت قائم رہے گا۔

مفقود الخبر: اگر شوہر مفقود الخبر ہو جائے تو بیوی کو طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔ کتنے عرصہ تک خاوند مفقود الخبر ہو اس کے بارے میں فقہاء کا شدید اختلاف ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں ملتا کہ اس صورت میں بیوی کب تک خاوند کا انتظار کرے۔

امام ابوحنیفہ کی رائے کے مطابق ۹۰ سال اور امام ابویوسف کی رائے کے مطابق ۱۰۰ سال تک انتظار کرے[۱]۔ شافعی فقہ نے سات سال اور امام مالک کے نزدیک یہ میعاد چار سال کی ہے[۲]۔ موطا امام مالک میں حضرت عمرؓ کا یہ اثر منقول ہے: ایما امراۃ فقدت زوجھا فلم تدر این ھو فانھا تنتظر اربع سنین ثم تعتد اربعۃ وعشرا ثم تحل۔ یعنی جس عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو جائے اور اسے یہ پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں ہے تو وہ چار سال انتظار کر کے چار ماہ دس دن کی عدت گذارے اور آزاد ہو جائے۔ ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق نے بھی اپنی مصنفات میں حضرت عثمانؓ کا ایسا ہی قول درج کیا ہے۔

ابن مسیب کا یہ مذہب ہے اگر کوئی شخص جنگ کے دوران گم ہو جائے تو اس کی بیوی کو ایک سال تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ابن مسعودؓ کے متعلق ایک نقل کی ہے جس نے اپنی ایک خادمہ کے شوہر کو ایک سال تک تلاش کیا۔ پھر اس کو مفقود خیال کیا۔ زمانہ حاضرہ میں رسل و رسائل کی سہولت کی وجہ سے مفقود الخبر کے لیے ایک سال کی میعاد کافی ہے۔

عُنّہ (نامردی) مجبوب (مقطوع الذکر) اگر خاوند نامرد ہو تو قاضی علاج کے لیے ایک مدت مقرر کر دے گا۔ اگر وہ جماع پر قادر نہ ہو سکے گا تو علیحدگی کرا دے گا۔ ہدایہ میں لکھا ہے: واذا کان الزوج عنینا اجلہ الحاکم سنۃ فان وصل الیھا والا فرق بینھما۔ (ہدایہ جلد ۲ صفحہ ۴۰۰) اگر خاوند نامرد ہے تو قاضی اسے علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دے گا پھر اگر وہ تعلق ازدواجی کے قابل ہو گیا تو بہتر ورنہ ان دونوں میں تفریق کرا دے گا۔ حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں:۔ من تزوج امراۃ فلم یستطع ان یمسھا فانہ یضرب اجل سنۃ

---

[۱] ہدایہ نمبر ۱ صفحہ ۵۹۸، ۵۹۹ [۲] ہدایہ نمبر ۱ صفحہ ۵۹۷

فان تسها والا فرق بینهما۔ (موطا امام مالک ج ۲ ص ۳۲) جو کسی عورت سے نکاح کرے اور اس عورت سے تعلق مناکحت قائم کرنے کی طاقت نہ ہو تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی اگر اس کے بعد وہ ہم بستری کے قابل ہو جائے تب خیر۔ ورنہ دونوں میں علیحدگی کر دی جائے گی۔ اگر مرد مقطوع الذکر ہو تو قاضی خود تفریق کر دے (قدوری مصری کتاب النکاح صفحہ ۷۱)

ایلاء

ایلاء کے معنی ہیں کوتاہی ایلاء وہ قسم ہے جس کی غرض کسی حق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہو۔ شریعت اسلامی ایلاء یہ ہے کہ مرد قسم کھائے کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اسے چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ ورنہ چار ماہ کے بعد طلاق بائن ہو جائے گی۔ یہ علیحدگی امام شافعی کے نزدیک از خود نہیں ہوگی۔ بلکہ تبین بتفریق القاضی لانہ مانع حقہا فی الجماع ینوب القاضی منابہ فی التسریح کما فی الجب والعنۃ[1] وہ قاضی کی تفریق کے بعد بائنہ ہوگی کیونکہ وہ عورت کے حق میں مانع ہے لہذا قاضی اس حالت میں خاوند کا قائم مقام ہو جائے گا۔ جس طرح مقطوع الذکر اور نامردی کی صورت میں ہوتا ہے۔

مالکیہ کا یہ مذہب ہے: اگر قاضی ایلاء کرنے والے شوہر کو رجوع کا حکم دے۔ اور وہ رجوع نہ کرے تو وہ اسے طلاق دینے کا حکم دے گا۔ لیکن اگر وہ طلاق نہ بھی دے تو قاضی خود اسے ایک رجعی دے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ قاضی خود طلاق نہ دے گا۔ بلکہ بیوی کو حکم دے گا کہ وہ خود اپنے آپ کو طلاق دے دے پھر قاضی طلاق کا حکم صادر کر دے گا۔ اگر کسی جگہ قاضی موجود نہ ہو تو مسلمانوں کی ایک جماعت اسے طلاق دے دے گی[2]

حنابلہ کہتے ہیں: اگر ایلاء کرنے والا خاوند چار ماہ سے پہلے قاضی کے حکم کے مطابق اپنی بیوی سے تعلق مناکحت پیدا کرنے سے انکار کر دے تو قاضی اسے طلاق دینے کا حکم دے گا۔ اگر وہ طلاق بھی نہ دے گا تو اس کی طرف سے خود قاضی ایک یا دو یا تین طلاقیں دیدے گا۔ کیونکہ اس صورت میں قاضی خاوند کا قائم مقام ہے اور وہ تینوں طلاقوں کا

---

[1] ہدایہ جلد ۲ صفحہ ۳۸۱ [2] الفقہ علی المذاہب اربعہ جلد ۴ صفحہ ۴۸۰، ۴۸۱۔

مالک ہے اگر قاضی یہ کہہ دے کہ میں نے تم دونوں کا نکاح فسخ کر دیا تو یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن یہ فسخ ہوگا طلاق نہیں ہوگی اور یہی صورت فسخ ہوگی اگر قاضی کہے گا کہ میں نے تم دونوں کے درمیان علیحدگی کر دی ہے۔ اور قاضی خاوند کو طلاق کا حکم اس وقت دے گا جب اس سے عورت اس کا مطالبہ کرے۔[۱]

کفارہ: اگر خاوند چار ماہ کے اندر اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور صحبت کرے۔ تو قسم توڑنے کا کفارہ دس فقیروں کا کھانا کھلانا یا ان کو کپڑے پہنانا۔ یا ایک غلام آزاد کرنا۔ اگر یہ نہ کر سکے گی تو تین دن کے روزے رکھے۔ مسلم میں ہے: عن ابن عباسؓ اذا حرم الرجل امراته فھو یمین یکفرھا[۲] حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جو شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تو میرے لیے حرام ہے تو یہ قسم کھانے کی طرح ہے اس میں قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔

ظہار: زمانہ جاہلیت میں اہل عرب غصہ کی حالت میں کبھی یہ کہہ دیتے تھے: انت علی کظھر امی۔ تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں ہے ان الفاظ سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے۔ اسلام نے اس کی اصلاح کی اور کہا کہ اپنی بیوی کو ماں کہہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی بلکہ ماں تو وہی ہے جس کے بطن سے آدمی پیدا ہو۔ محض زبان سے ماں کہہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰیِٔیْ تُظٰہِرُوْنَ مِنْھُنَّ اُمَّھٰتِکُمْ۔[۳] اور نہ تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں بنایا ہے۔

قرآن مجید نے اس رسم کو نامعقول قرار دیا ہے ارشاد ہے: وَاِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا[۴] اور وہ بیہودہ بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔

ظہار سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ یُظٰہِرُوْنَ مِنْکُمْ مِّنْ نِّسَآئِھِمْ مَّا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ اِنْ اُمَّھٰتُھُمْ اِلَّا الّٰیِٔیْ

---

[۱] الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۴ صفحہ ۴۸۷، ۴۸۸

[۲] کتاب النکاح باب الطلاق [۳] الاحزاب ۳۳: ۴

[۴] المجادلہ ۵۸: ۲

وَلَدْنَهُمْ [1] تم میں سے جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں، ان کی مائیں صرف وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا۔

کفارہ: وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا۔ [2]

اور جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں پھر اس کی طرف واپس لوٹتے ہیں جو کہا تھا تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہے اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں اس کے ساتھ تمہیں وعظ کیا جاتا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ پھر جو کوئی نہ پائے تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں پھر جسے یہ بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

لعان: لعان کا لفظ لعنت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا۔ مگر اسلامی اصطلاح میں شوہر اور بیوی میں علیحدگی کی اس صورت کا نام ہے کہ جب خاوند اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور اس کی تائید میں گواہ پیش نہ کر سکے قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ [3]

اور جو لوگ اپنی عورتوں پر تہمت لگائیں اور سوائے اپنے ان کا کوئی گواہ نہ ہو تو ان تہمت لگانے والوں میں سے ایک کی گواہی یہ ہے کہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ

---

[1] المجادلہ ۵۸: ۲ — [2] المجادلہ ۵۸: ۳، ۴

[3] النور ۲۴: ۶-۹

وہ سچوں میں سے ہے اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کی لعنت اس پر ہو اگر وہ جھوٹوں سے ہے اور عورت سے یہ بات سزا کو ٹال سکتی ہے کہ وہ اللہ کی قسم کے ساتھ چار بار گواہی دے کہ وہ مرد جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں بار یہ کہ اللہ کا غضب اس پر ہو اگر وہ سچوں میں سے ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے رسول کریم صلعم سے دریافت کیا یا رسول اللہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو فاحشہ کام میں مبتلا دیکھ لے تو کیا کرے۔ اگر وہ دوسروں سے بیان کرتا ہے یہ بہت برا کام ہے اگر وہ خاموش رہتا ہے تو یہ بھی ایک مشکل کام ہے۔ آنحضرت نے جواب نہ دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا۔ یا رسول اللہ جس امر کے متعلق میں نے آپؐ سے پوچھا تھا اُس میں مُبتلا ہو گیا ہوں۔ اس وقت سورہ نور کی آیتیں نازل ہوئیں۔ آپؐ نے ان کو تلاوت فرما کر وعظ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دُنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہی ہلکا ہے۔ اس شخص نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ اُس کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے میں اس عورت کے بارے میں جھوٹ نہیں بولا۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلایا اُس کو بھی اس طرح پند و نصیحت فرمائی۔ اس نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ اُس کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے یہ جھوٹا ہے۔ تب حضرت نے مرد سے قسم کی ابتدا فرمائی چنانچہ اس نے چار مرتبہ قسمیں کھائیں اس کے بعد آپ نے عورت سے بھی قسمیں کھلوائیں اور دونوں کے درمیان تفریق کرا دی[۱]۔

اس تفریق کے لیے میاں بیوی کی رضامندی ضروری نہیں۔

لعان زوجین میں ہمیشہ کے لیے تفریق کر دیتا ہے۔

اسلام میں عورتوں کا درجہ اور حیثیت

عورت انسانی سوسائٹی کا ایک نہایت ہی اہم حصہ ہے جس کے بغیر سوسائٹی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ تخلیق اور افزائش نسل انسانی کے لیے دونوں کا وجود لازم ہے

---

[۱] عمدۃ الرعایا حاشیہ وقایہ جلد ۲ صہ ۱۳۸ حاشیہ ۹

ملزوم ہے۔ سوسائٹی کا اتنا اہم اور ضروری جزو ہونے کے باوجود اسلام سے قبل دوسری اقوام عالم اور مذاہب میں عورت کا درجہ بہت ہی پست تھا۔ وہ مردوں کی محکوم اور دستِ نگر خیال کی جاتی ہے۔ پرانی ترقی یافتہ اور مہذب اقوام میں عورت کو ایک منقولہ جائیداد تصور کی جاتی تھی۔ اس کا مفصل ذکر گذر چکا ہے۔

اسلام نے عورت کا درجہ دو حیثیتوں سے متعین کیا ہے۔ ایک عمومی حیثیت سے اور دوسرا خصوصی حیثیت سے عمومی حیثیت سے عورت کو انسانیت کا وہی درجہ دیا ہے جو مرد کو حاصل ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً[1] اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک اصل سے پیدا کیا ہے اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ اس آیت کریمہ میں مرد اور عورت کو ایک ہی اصل سے قرار دے کر دونوں کو انسانیت میں مساوی درجہ دیا ہے۔ روحانی اور اخلاقی میدان میں مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے جس طرح مرد جدوجہد سے اطاعت گذاری سے اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہے اسی طرح عورت بھی اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا[2]۔ جو نیک کام کریگا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور یہ ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائیگا تعلیم کے حاصل کرنے میں عورت مرد کے برابر ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

مادی لحاظ سے بھی عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیا ہے۔ جس طرح مرد روپیہ کما سکتا ہے اسی طرح عورت کو اجازت دی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے: لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ[3] مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

---

[1] النساء ۴:۱ [2] النساء ۴:۱۲۴

[3] النساء ۴:۳۲

عورت کو اپنی ملکیت کے تصرف پر پورا اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۱؎
پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لیے خود دے دیں تو اسے مزے اور خوشگواری سے کھاؤ۔

اسلام نے عورت کو مردوں کی طرح میراث میں شریک قرار دیا ہے قرآن مجید کہتا ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۲؎ مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو اُن کے ماں باپ اور قریبی چھوڑیں۔

عورت کا خصوصی حیثیت سے مقام

عورت کی مختلف خصوصی حیثیتیں ہیں۔ وہ بیوی بھی ہے، ماں بھی ہے اور بیٹی بھی ہے ہر حیثیت سے اسلام نے ذلت کے گڑھے سے نکال کر عزت و تکریم کے مقام پر کھڑا کیا ہے۔

بیوی کی حیثیت سے

بیوی سکونِ قلب کا ذریعہ ہے۔ ارشاد ہے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۳؎ اس خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں۔ تاکہ ان کے پاس سکونِ قلب پاؤ۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۴؎ عورتوں سے نیکی اور بھلائی کے ساتھ پیش آؤ۔

ماں کی حیثیت سے

اسلام نے ماں کو عظمت و احترام کے بلند مقام پر کھڑا کیا ہے اس عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ توحید الٰہی کے بعد دوسرا درجہ والدین کی اطاعت کا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى

۱؎ النساء ۴:۴ ۲؎ النساء ۴:۷
۳؎ الروم ۳۰:۲۱ ۴؎ النساء ۴:۱۹

وَالْیَتَامٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ [1] اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور لوگوں کو اچھی بات کہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم منہ موڑنے والے ہو۔

ایک دوسری آیت ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ رَبُّکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا [2] کہ آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے تم پر واجب ہے کہ تم اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔

حدیث میں آتا ہے: عن ابی ھریرۃ قال قال رجل یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احق بحسن صحابتی قال امک قال ثم من؟ قال امک قال ثم من؟ قال امک قال ثم من قال ابوک متفق علیہ [3]

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہا کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے۔ آپ نے فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون! فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔

عن المغیرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ حرم علیکم عقوق الامھات ووأد البنات ومنع وھات وکرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال [4] (متفق علیہ)

حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے یقیناً تم پر حرام کیا ہے ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا اور بخل اور گدائی کو تمہارے لیے ناپسند کیا ہے۔ فضول باتیں اور کثرت سے سوال اور مال ضائع کرنا۔

بیٹی کی حیثیت سے | اسلام نے بیٹی کے ساتھ حسن سلوک، محبت اور شفقت سے

---

[1] البقرہ ۲: ۸۳ [2] انعام ۶: ۱۵۱

[3] محمد بن عبد اللہ خطیب التبریزی مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلہ صفحہ ۹: ۴۱۸

[4] مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلہ صفحہ ۴۱۹

پیش آنے کی تعلیم دی ہے اور اس کی اچھی تعلیم وتربیت کو دوزخ کی آگ سے نجات کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے رسول کریم صلعم نے فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میں اور اس کا ساتھ (دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا) اس طرح ہوگا۔[1] مسلم کی روایت ہے کہ جو شخص لڑکیوں کی پیدائش میں مبتلا ہو گیا اور اس نے ان کی پوری پرورش اور دیکھ بھال کی تو وہ لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے نجات کا باعث بن جائیں گی۔[2]

گھریلو زندگی میں درجہ

اسلام ایک عملی مذہب ہے۔ اس وجہ سے اس کی تعلیم زندگی کے ہر شعبہ میں حسن اور استواری بخشتی ہے۔ اس تعلیم کے علاوہ جو قانون بھی نافذ کیا جائے گا۔ خواہ بظاہر کتنا ہی دلکش اور حسین ہو وہ بگاڑ اور فساد کا موجب ہوگا۔ گھریلو معاشرہ کی پہلی اکائی خاندان ہے۔ اسی پر تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اصولی طور پر خاندان کے متعلق احکام بیان کر دیے ہیں۔ وہ ایسے فطری اصول ہیں کہ انہی پر خاندان کا نظام احسن طریق پر چل سکتا ہے۔ اسلام نے مرد اور عورت کے جداگانہ طبعی میلانات جسمانی ساخت۔ عضویاتی اختلافات کے پیش نظر دونوں کے وظائف مقرر کر دیے ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرہ عمل میں آزاد ہے لیکن مجموعی طور پر مرد کو گھریلو زندگی میں نگران اعلیٰ مقرر کیا ہے جس کے یہ معنی نہیں کہ مرد حاکم ہیں اور عورتیں محکوم۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ[3] مرد عورتوں کے گذارہ کے ذمہ دار ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انہوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو جسمانی اور بدنی قوت میں عورت پر فضیلت دی ہے۔ اس وجہ سے اس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ مشقت اور محنت سے روزی کمائے اور

---

[1] مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب فضل الاحسان الی البنات

[2] مسلم باب فضل الاحسان الی البنات۔

[3] النساء ۴: ۳۴

اور اہل و عیال کی پرورش کرے اور عورت مرد سے محبت اور شفقت میں سبقت لے جاتی ہے اس وجہ کے پیش نظر عورت کے سپرد بال بچوں کی پرورش کر دی۔ کیونکہ پرورش محبت اور شفقت کے جذبہ سے ہی صحیح ہوتی ہے۔ نسل انسانی کی ترقی کے لیے یہی تقسیم ضروری ہے کہ روٹی کمانے کا کام مرد کے سپرد ہونا چاہیے اور بچے پالنے کا کام عورت کو تفویض ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نظام منزلی میں دنیا کے بڑے بڑے مفکر اور دانشور مرد کی صدارت کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ ضروری ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کا قوام بنایا جائے اور فطرت کا تقاضا ہے کہ عورت پر مرد کو غلبہ حاصل ہو اس لیے کہ مرد عقل میں کامل سیاست میں ماہر حمایت میں مضبوط اور ننگ و عار کو دور کرنے کی صلاحیت کا مالک ہے اور اس حیثیت سے بھی مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے کہ مرد عورت کا کپڑا روٹی اور گھر مہیا کرتا ہے[۵]۔ مرد اور عورت کے عضویاتی اختلافات کی وجہ سے اسلام کی تعلیم کی طرف آرہے ہیں اور برملا اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ عورتوں کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے، اور ان کے مردوں کے مشاغل میں شریک ہونا سوسائٹی کے لیے زہر قاتل۔ چنانچہ فلسفہ حسی کا موسس اگسٹے کونٹ اپنی مشہور تصنیف میں رقمطراز ہے۔

"جس طرح ہمارے زمانہ میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں اسی طرح کے تغیر نظام تمدن اور آداب معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مگر وہ لا آف نیچر" جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مخصوص رکھتا اس میں کبھی کوئی اہم تغیر واقع نہیں ہوا۔ یہ قانون الٰہی اس درجہ صحیح اور محفوظ ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سینکڑوں باطل خیالات قائم ہوتے رہے۔ مگر یہ بغیر کسی نقصان یا تغیر کے سب پر غالب آتا رہا۔ مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) پر جنس محب (عورت) کے جو مادی فرائض ہیں ان کی حد بندی اور تعین کر دی جائے۔ مرد پر واجب ہے کہ عورت بچے کی تغذیہ

---

۵ حجۃ اللہ البالغہ حقوق زوجیہ ج ۲ صفحہ ۱۳۶

کا انتظام کرے یہی وہ قانون طبعی اور ناموس الٰہی ہے جو جنس محبب کی اصلی زندگی کو منزلی دائرہ میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیئت اجتماعی کے خوفناک اور مہیب اشکال کو احسن اور اکمل کر دیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنے طبعی جذبات سے ترقی نوع انسانی جیسے شریف فرض کی بجاآوری پر آمادہ کرتا ہے[1]۔"

علوم مادیہ کا ایک اور ماہر ژدن سیماں اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔ "عورت کو چاہیئے عورت رہے ہاں بے شک عورت کو چاہیئے عورت رہے۔ اسی میں اس کے لیے فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے اور قدرت کی یہ ہدایت ہے۔ اس لیے جس قدر عورت اس کے قریب ہوگی اس کی حقیقی قدر و منزلت بڑھے گی اور جس قدر دور ہوگی اس کے مصائب ترقی کرینگے بعض فلاسفر انسانی زندگی کو پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دلفریب پاک اور بے حد پاکیزہ ہے۔ بشرطیکہ ہر مرد اور ہر عورت اپنے مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے اس کے لیے قرار دیئے ہیں اور اپنے فرائض ادا کرے جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیئے ہیں[2]۔"

یہی ژدل سیماں ایک موقع پر لکھتا ہے:

"جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے اس میں شک نہیں۔ کہ وہ ایک عامل بسیط کے فرائض انجام دیتی ہے۔ مگر افسوس کہ عورت نہیں رہتی[3]۔"

اگسٹ کونٹ لکھتا ہے:

شوہر یا کسی قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے تاکہ معاش کی

---

[1] مسلمان عورت صفحہ ۴، ۵، ۶، ۲ بحوالہ مسلمان عورت صفحہ ۵۸، ۵۹
[2][3] ایضاً۔

ضرورت سے مجبور ہو کر اسے گھر کے باہر کی زندگی میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کرنا پڑے کیوں کہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہیئے اور ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اسے جس دائرہ میں محدود کر دیا ہے۔ اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو[1]۔"

یورپ میں عورتوں کی آزادی کا نعرہ اور اس کے نتائج

عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ یورپ میں اٹھارویں صدی تک مسیحی فلسفہ زندگی کے زیر اثر عورت ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم تھی۔ اسی مظلومی اور محکومی کے بطن سے آزادی نسواں کی تحریک اٹھی اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک بے اعتدالی اور افراط کا راستہ اختیار کر گئی۔ اب یورپ میں یہ تحریک تین عنوانوں کے تحت آتی ہے۔

۱۔ عورتوں اور مردوں میں مساوات۔

۲۔ عورتوں کا معاشی استقلال۔

۳۔ مرد اور عورت میں آزادانہ اختلاط۔

اس آزادی کا نقشہ مولانا محمد ظفیر الدین کا اپنی تصنیف اسلام کا نظام عفت و عصمت میں ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

کون نہیں جانتا کہ عورتوں کی آزادی ملک کو تباہ کر دیتی ہے۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی کو توڑ ڈالتی ہے اور خود عورتوں کو تو جنت سے جہنم میں پہنچا دیتی ہے۔ عورت اس بیسویں صدی میں خوش ہے کہ اسے حقوق مل رہے ہیں۔ وہ ہر محکمہ میں ملازمت حاصل کر رہی ہے۔ مگر اسے پتہ نہیں، کہ مردوں نے اسے گائے کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسے ذرہ برابر چین نہیں۔ اپنے قدرتی فرائض سے دن بدن دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مردوں کی تفریح کے لیے عورتوں کو سینما کے پردوں

---

[1] مسلمان عورت ص ۹۷

پر آنا پڑا مردوں کی دلبستگی کا سامان مہیا کرنے کے لیے تھیٹر کی ناپاک زندگی قبول کرنی پڑی۔ مردوں کی ہوس پوری کرنے کے لیے ان کو کلب اور ناچ گھروں میں ناچنا پڑا اور حد یہ ہے کہ محض مردوں کی شہوت پرستی کے سلسلہ میں عورت کو عریاں کلب بنانا پڑا اگر اب تک عورت یہ سمجھ رہی ہے کہ مردوں کی غلامی سے ہمیں نجات مل گئی ہے"

اس آزادی کے نتیجہ میں بدکاری اور بے حیائی کے چشمے یورپ میں اُبلنے لگے ہیں، زنا عام ہو گیا۔ مالی منفعت کے لیے ایک منظم حرفہ بن گیا۔ چنانچہ پول بیورو لکھتا ہے۔

"یہ ایک زبردست نظام ہے جو پورے منظم طریقے سے تنخواہ یاب عہدیداروں اور کارکنوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ناشرین اور اہل قلم (خطباء و مقررین اطباء اور دایات) اور تجارتی سیاح اس میں باقاعدہ ملازم ہیں اور اشتہار اور مظاہرہ کے جدید طریقے اس کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں[1] فرنچ سینٹ کے ایک رکن موسیو فردنان دریفو نے بیان کیا کہ:

"قحبہ گری کا پیشہ اب محض انفرادی کام نہیں رہا بلکہ اس کی ایجنسی سے جو عظیم مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کی وجہ سے اب یہ ایک تجارت Business اور ایک منظم حرفہ Organised Industry بن گیا ہے اس کے خام پیداوار" مہیا کرنے والے ایجنٹ الگ ہیں۔ سفری ایجنٹ الگ ہیں۔ اس کی باقاعدہ منڈیاں موجود ہیں جو ان لڑکیوں اور کم سن بچیاں وہ تجارتی مال ہیں جس کی درآمد و برآمد ہوتی ہے اور دس سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ ہے"[2]

ڈاکٹر ایڈتھ ہوکر Edith Hooker اپنی کتاب Laws of Sex میں لکھتا ہے کہ:

نہایت مہذب اور دولت مند طبقوں میں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ آٹھ برس کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے عشق و محبت کے

---

[1] صفحہ ۳۴۲ [2] پردہ از مودودی صاحب صفحہ ۸۵

تعلقات رکھتی ہیں جن کے ساتھ لبا اوقات مباشرت بھی ہو جاتی ہے۔"

اس کا بیان ہے: "ایک سات سال کی چھوٹی سی لڑکی جو ایک نہایت شریف خاندان کی چشم و چراغ تھی خود اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں سے ملوث ہوئی اور ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پانچ بچوں کا ایک گروہ جو دو لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل تھا اور جن کے گھر پاس پاس واقع ہوئے تھے باہم شہوانی تعلقات میں وابستہ پائے گئے۔ اور انہوں نے دوسرے کم سن بچوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ ان میں سب سے بڑے بچے کی عمر دس سال کی تھی۔ ایک اور واقعہ ایک ۹ سال کی بچی کا ہے جو بظاہر بڑی حفاظت سے رکھی جاتی تھی۔ اس بچی کو "متعدد عشاق" کی منظور نظر ہونے کا فخر حاصل تھا۔[1]"

امریکہ میں جن عورتوں نے زنا کاری کو مستقل پیشہ بنالیا ہے۔ ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔[2]

انگلستان کا ایک مصنف جارج رائلی اسکاٹ اپنی کتاب تاریخ الفحشاء History of Prastitution میں اپنے ملک کی نسل کی بے راہ روی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جن عورتوں کی بسر اوقات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اپنے جسم کو کرایہ پہ چلا کر روزی کمائیں ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ان عورتوں کی بھی ہے اور وہ روز بروز زیادہ ہو رہی ہے جو اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لیے دوسرے ذرائع رکھتی ہیں اور ضمنی طور پر اس کے ساتھ فاحشہ گری بھی کرتی ہیں تاکہ آمدنی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے یہ پیشہ ور فاحشات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں مگر اس نام کا اطلاق ان پر کیا نہیں جاتا۔ ہم ان کو غیر پیشہ ور فاحشات کہہ سکتے ہیں۔"[3]

---

[1] پردہ صفحہ ۸۵

[2] Laws of Sex صفحہ ۳۲۸ بحوالہ پردہ ۱۰۷، ۱۰۸

[3] بحوالہ پردہ صفحہ ۱۱۲

"ان شوقین یا پیشہ ور فاحشات کی کثرت آج کل جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی سوسائٹی کے نیچے سے لے کر اوپر تک ہر طبقہ میں یہ پائی جاتی ہیں اگر ان معزز خواتین کو کہیں اشارے کنائے میں بھی "فاحشہ" کہہ دیا جائے۔ تو یہ آگ بگولا ہو جائیں گی مگر ان کی ناراضی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت بہر حال یہی ہے۔ اب جوان لڑکی کے لیے بد چلنی اور بے باکی بلکہ سوقیانہ اطوار تک فیشن میں داخل ہو گئے ہیں اور سگریٹ پینا، تلخ شرابیں استعمال کرنا فحش لٹریچر پر گفتگو کرنا یہ سب چیزیں بھی ان کے لیے فیشن بنی ہوئی ہیں۔ ایسی لڑکیوں عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو شادی سے پہلے صنفی تعلقات بلا تکلف قائم کر لیتی ہیں اور وہ لڑکیاں اب شاذ کے حکم میں ہیں جو کلیسا کی قربان گاہ کے سامنے نکاح کا پیمان وفا باندھتے وقت صحیح معنوں میں دوشیزہ ہوتی ہوں[1]"

یہ مصنف ان بے حیائیوں کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"عورتوں کی آزادی کا بھی ان حالات کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں لڑکیوں پر سے والدین کی حفاظت و نگرانی اس حد تک کم ہو گئی ہے کہ تیس چالیس سال قبل لڑکوں کو کبھی اتنی آزادی حاصل نہ تھی جتنی اب لڑکیوں کو ہے۔"

"ایک اور اہم سبب جو سوسائٹی میں وسیع پیمانہ پر صنفی آوارگی پھیلنے کا موجب ہوا یہ ہے کہ عورتیں روز افزوں تعداد میں تجارتی کاروبار دفتری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں داخل ہو رہی ہیں جہاں شب و روز ان کو مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس چیز نے عورتوں اور مردوں کے اخلاقی معیار کو بہت گرا دیا ہے۔ مردانہ اقدامات کے مقابلہ میں عورتوں کی قوت مزاحمت کو بہت کم کر دیا ہے اور دونوں صنفوں کے شہوانی تعلق کو تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد کر کے رکھ دیا ہے۔ اب جوان لڑکیوں کے ذہن میں شادی اور باعصمت

---

[1] بحوالہ پردہ صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲

زندگی کا خیال آتا ہی نہیں۔ آزادانہ خوش وقتی جسے پہلے کبھی آوارہ قسم کے مرد ڈھونڈتے پھرتے تھے آج ہر لڑکی اس کی جستجو کرتی پھرتی ہے دوشیزگی اور بکارت کو ایک دقیانوسی چیز سمجھا جاتا ہے اور دورِ جدید کی لڑکی اس کو ایک مصیبت خیال کرتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا لطف یہ ہے کہ عہدِ شباب میں لذاتِ نفس کا جام خوب جی بھر کر پیا جائے اسی چیز کی تلاش میں وہ رقص خانوں، نائٹ کلبوں اور ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے چکر لگاتی ہے اور ان کی جستجو میں وہ بالکل اجنبی مردوں کے ساتھ موٹر کی سیر کے لیے بھی جانے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ جان بوجھ کر خود اپنی خواہش سے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں اور ایسے حالات میں پہنچا دیتی ہے اور پہنچاتی رہتی ہے۔ جو صنفی جذبات کو مشتعل کرنے والے ہیں اور پھر اس کے جو قدرتی نتائج ہیں ان سے وہ گھبراتی نہیں ہے بلکہ ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔"[1]

جنسی آوارگی اس آزادی اور مساوات کا نتیجہ ہے جو یورپ نے عورت کو دے رکھی ہے اور یورپ کے مفکرین ان فواحش کو دیکھ کر نوحہ کر رہے ہیں تاریخی حقائق اور اور شواہد سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جنسی مساوات اور آزادی کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے وہی عین فطرت کے مطابق ہے اور وہی معاشرہ کی پاکیزگی کا موجب ہوسکتا ہے۔ اس کی تصدیق مغربی حکماء اور ماہرین نفسیات نے بھی کی۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مصنف الگزس کیرل اپنی کتاب **Man The Unknown** میں لکھتا ہے۔

"مردوں اور عورتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بنیادی نوعیت کے ہیں یہ اختلافات ان کے جسم کی رگوں اور ریشوں کی ساخت کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں عورتوں کے بیضہ دان سے جو کیمیاوی مادے خارج ہوتے ہیں۔ ان کا اثر صنفِ نازک کے ہر حصّہ پر پڑتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کا سبب یہی ہے۔ ان بنیادی حقائق کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے نسوانی آزادی کے

[1] بحوالہ پردہ صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵

علمبرداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں اور حقوق بالکل یکساں اور مساوی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ فی الحقیقت مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عورت کے جسم کے ہر خلیہ پر اس کی نسوانیت کے نقوش مرقسم ہوتے ہیں یہی بات اس کے نظام عصبی کے متعلق عورتوں کو اپنی فطرت کے مطابق اپنے رجحانات کی تشکیل کرنی چاہیئے بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی تقلید کریں۔ تہذیب کے ارتقاء میں عورتوں کا بہ نسبت مردوں کے حصہ ہے اس لیے انہیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنی چاہیئے[1]"

ڈاکٹر ٹیمبروس گنا اپنی کتاب "روحِ نسوانیت" میں رقمطراز ہے کہ: عورتیں اور مرد صرف طول و قامت، ہڈیوں کی ساخت اور عضلاتی بناوٹ کے اعتبار سے ہی مختلف نہیں بلکہ اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کہ وہ ہوا اور غذا کی ایک ہی مقدار جذب نہیں کرتے ان کے امراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ان کے ذہنی اور اخلاقی رجحانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتی ہے ترقی اور ارتقاء صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض کا تعین کرنے میں ان کے فروق و اختلافات کو مدِ نظر رکھا جائے[2]"

انسائیکلوپیڈیا کا مصنف پروفیسر دوفارینی لکھتا ہے:

"جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے وحشی ترین اقوام میں پایا جاتا ہے[3]"

ان تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مرد اور عورت کے درمیان طبعی اختلافات کو مدِ نظر رکھ کر عورت کو جو درجہ دیا ہے۔ وہی ٹھیک ہے اور اسی سے معاشرہ میں اعتدال قائم رہ سکتا ہے۔ قرآن مجید کا عطا کردہ درجہ افراط اور تفریط سے پاک ہے اور عورتوں کے طبعی رجحانات، جسمانی ساخت کے مطابق ہے۔

۱ھ اسلام میں حیثیت نسواں مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صفحہ ۲۸۔

۲ھ اسلام میں حیثیت نسواں مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صفحہ ۳۱

۳ھ مسلمان عورت ص ۴۵

زوجین کے حقوق و فرائض

حقوق حق کی جمع ہے۔ علماء لغت نے حق کے کئی معنی کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو حق کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ چیزوں کو اقتضائے حکمت کے مطابق ایجاد کرتا ہے۔ ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ [1] پھر وہ اپنے سچے مالک کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

خدا کی پیدا کی ہوئی اشیا کو حق کہا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اقتضائے حکمت کے کے مطابق پیدا کی گئی ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ [2] وہی ذات ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو نور بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور کاموں کا حساب معلوم کرو۔ یہ سب کچھ اللہ نے حق کے ساتھ پیدا کیا۔

ہر اس فعل اور قول کو حق کہا جاتا ہے جو اس کے مطابق ہو جو واجب ہے اور اس اندازہ سے ہو جو واجب ہے اور اس وقت پہ ہو جو واجب ہے۔

حق کے معنی صدق۔ مطابقت، موافقت، لازم اور واجب کے بھی ہوتے ہیں۔

اصطلاحی معنوں میں حقوق کی یہ تعریف ہے حقوق انسانی وہ اختیارات ہیں جنہیں معاشرہ مفادِ عامہ کے لیے ضروری قرار دے۔ پروفیسر ہالینڈ نے کہا ہے حق انسان کی وہ صلاحیت ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے افعال پر ذاتی قوت سے نہیں بلکہ سماج کی قوت یا رائے عامہ سے اثر ڈال سکتا ہے۔ آسٹن حق کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ حق انسان کی وہ قوت یا صلاحیت ہے جس کے ذریعہ وہ دوسروں کو صبر و تحمل یا دوسرے کاموں کی تلقین کرتا ہے حقوق کی کئی اقسام ہیں۔

۱۔ قدرتی حقوق۔

۲۔ قانونی حقوق۔

۳۔ اخلاقی حقوق ہ۔ معاشی حقوق ۵۔ تمدنی حقوق۔

---

[1] الانعام ۶ : ۶۲ [2] یونس آیت ۵

قدرتی حقوق سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جو ہر ذی روح اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور ان حقوق کے لیے انسان کو کسی قسم کی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ مثلاً انسان پیدا ہوتے ہی۔ ہوا۔ روشنی۔ پانی وغیرہ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

قانونی حقوق سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جن کو حکومت تسلیم کرتی ہے اور ان کی خلاف ورزی پر عدالتوں کے ذریعہ سزا دی جاتی ہے۔

اخلاقی قانون سے مراد وہ حقوق ہوتے ہیں جن کو عوام نے از خود اپنے اُوپر لازم کر لیا ہوتا ہے۔ قانون کی رُو سے ان کی پابندی لازم نہیں ہے اور ان کا توڑنا جرم ہے۔

معاشی حقوق سے مُراد وہ حقوق ہوتے ہیں جن کا تعلق روپیہ پیسے سے ہوتا ہے

تمدنی حقوق سے مُراد وہ حقوق ہیں جو بنی نوع انسانی کے معاشرتی تعلق سے پیدا ہوتے ہیں۔

فرائض

فرائض فرض کی جمع ہے۔ حقوق اور فرائض لازم ملزوم ہیں۔ جب انسان کو حقوق حاصل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو فرائض کہا جاتا ہے۔

فرائض کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ قانونی فرائض

۲۔ اخلاقی فرائض

قانونی فرائض وہ ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا ہر انسان پر قانونی طور پر واجب ہوتا ہے۔ جن کی ادائیگی نہ کرنے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے سزا ہے۔

اخلاقی فرائض وہ ہیں جن کی ادائیگی معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اگر ان فرائض کو ادا نہ کیا جائے تو قانون گرفت نہیں کرتا۔

حقوق و فرائض کا باہمی تعلق

حقوق و فرائض لازم و ملزوم ہیں ایک کے بغیر دوسرے کا کوئی وجود نہیں۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہر حق کے ساتھ فرض ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حقوق کی ادائیگی پر زور دیا جائے۔ لیکن فرائض کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ہر حق کے ساتھ ایک فرض ہے۔ حقوق اور فرائض کے گہرے تعلق کا سبب انسان کا مدنی الطبع ہونا ہے۔ ہر انسان

کو دوسرے انسان کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر فعل دوسرے پر اثر انداز ہوگا۔ معاشرتی تعلقات کو درست اور مضبوط رکھنے کے حقوق و فرائض ضروری ہیں۔

بیوی کے حقوق

قدرتی حقوق

ہم بستری اسلام نے عبادت اور ریاضت کو قرب الٰہی کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ یہی وہ وہ راستہ ہے جس پر ایک سالک چل کر سلوک کی منزلیں طے کرتا ہے دن رات میں پانچ دفعہ بارگاہ ایزدی میں حاضری دینا ہر مسلم پر فرض ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہی عبادت قرار دی ہے ارشاد ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[1]۔ یعنی میں نے جن و انس کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے عبادت کی اتنی اہمیت کے باوجود اسلام نے یہ اجازت نہیں دی کہ کوئی مسلمان عورت کے اس حق پر دست درازی کر کے دن رات عبادت میں مشغول رہے۔ چند صحابی ایسے تھے کہ جن کی نگاہ میں زن و شوہر کے باہمی تعلقات کی کوئی وقعت نہ تھی تو آپ نے ان کو بلا کر فرمایا۔ ان لزوجك علیك حقا۔ (بخاری باب لزوجك علیك الحق) یعنی تم پر تمہاری بیوی کا حق ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ[2] تمہارے لیے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے سو اس نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تم کو معاف کیا۔ پس اب ان سے میل جول رکھو اور جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے چاہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: وحصنوا فروج هذه النساء

---

[1] الذاریات ۵۱: ۵۶ [2] البقرہ ۲: ۱۸۷

(مسند احمد) ان عورتوں کی شرم گاہوں کو محفوظ رکھو۔ امام ابن تیمیہ کا قول ہے۔ مرد پر واجب ہے کہ معروف طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرے یہ بیوی نہایت ہی موکد حق ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۱ صفحہ ۵۶) حافظ ابن قیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں۔ بیوی کا خاوند پر حق ہے کہ وہ اس کے ساتھ فطری طریقہ پر ہم بستری کرے۔

معاشی حقوق

نفقہ نفقہ سے مراد کھانا کپڑا اور مکان ہے۔ دُرِ مختار باب النفقہ میں لکھا ہے هی لغۃ ماینفقہ الانسان علی عیالہ و شرعاً هی الطعام والکسوۃ والسکنی۔ یعنی لغت میں نفقہ سے مراد یہ ہے جو آدمی اپنے بال بچوں پر خرچ کرتا ہے اور شریعت میں نفقہ کھانا، کپڑا اور مکان کا نام ہے۔ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے نان و نفقہ کے لیے روزی کمانے۔ اور اپنی بساط کے مطابق گزارہ کا انتظام کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۔[۱]

چاہیئے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر اُس کی روزی تنگ ہے تو چاہیئے کہ وہ اس سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر اسی کے مطابق جو اسے دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت حکیم بن معاویہ قشیری کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے ہر ایک کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے۔ آپ نے فرمایا جس وقت تو کھلائے اسے بھی کھلائے اور جب تو پہنے اسے بھی پہنائے اور نہ تو اس کے منہ پر مارے اور نہ یہ کہے کہ تیری شکل بھی نہیں اور باہم لڑائی ہو تو صرف گھر ہی میں اس کی خواب گاہ علیحدہ کر دے[۲]۔

ان تحسنوا الیھن فی کسوتھن وطعامھن[۳] یعنی تم ان (بیویوں) کے ساتھ کپڑا اور کھانا دینے میں اچھا سلوک کرو۔ خاوند کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کی رہائش کا انتظام کرے۔

---

[۱] سورۃ الطلاق ۶۵:۷ [۲] ابو داؤد، ابن ماجہ

[۳] ترمذی باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجھا

ارشادِ الٰہی ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ[1] عورتوں کو اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم خود رہو۔

مہر: قرآن مجید میں آتا ہے: فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً[2] پس ان کے مقرر شدہ مہر دے دو۔

دوسری جگہ ہے: وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً[3] اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو۔

حدیث میں آتا ہے: عن عقبۃ ابن عامر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احق ما اوفیتم بہ من المشروط ان استحللتم بہ الفروج[4] حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہا کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جن شرطوں کو تم پورا کرنا ہے جس کی وجہ سے تم عورتوں کی ناموس اپنے لیے حلال کی ہے۔

وراثت لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ[5] یعنی مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورت کے لیے ان سے ایک حصہ جو ان کے ماں باپ اور قریبی چھوڑیں۔

ملکیت اور اس پر تصرّف کی اجازت اگر عورت ضرورت محسوس کرے تو اس کو کوئی پیشہ اختیار کرنے کی اجازت ہے اور وہ مرد کی طرح روپیہ پیسہ کما سکتی ہے۔ پھر اسے اپنی ملکیت پر پورا پورا اختیار ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ[6] اور عورتوں کا حصّہ ہے جو وہ کمائیں۔

تمدّنی حقوق

حسن سلوک قرآن مجید نے عورتوں سے حسنِ سلوک کی بہت تاکید کی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[7] عورتوں سے حسنِ معاشرت کرو۔

---

[1] سورۃ طلاق آیت ۶ [2] النساء ۴: ۲۴ [3] النساء ۴: ۴ [4] بخاری مسلم
[5] النساء ۴: ۷ [6] النساء ۴: ۳۲ [7] النساء ۴: ۱۹

رسول کریم صلعم عورتوں سے حسن سلوک اور بھلائی کی وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: استوصوا بالنساء خیراً فانھن خلقن من ضلع وانہ اعوج شئی فی الضلع اعلاہ فان ذھبت تقیمہ کسرتہ وان ترکتہ لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء[1] تم کو عورتوں سے بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے۔ لہٰذا تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ کے لیے ٹیڑھی رہ جائے گی۔ اس لیے عورتوں کے متعلق نصیحت قبول کرو۔

اکمل المومنین ایماناً احسنھم خلقاً وخیارکم خیارکم لنسآءکم[2]

یعنی ایمان میں سب سے کامل ترین وہ ہے جو اپنے اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور تم میں بہترین وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے اچھا ہو۔

خیرکم خیرکم لاھلہ[3] تم میں بہترین وہ شخص ہے جو اپنی بیویوں سے نیک سلوک کرے۔

ظلم و تعدی سے ممانعت

عورت کی طبیعت حساس ہونے کی وجہ سے ضدی، درشت خو اور ذرا ذرا سی بات پر وہ چراغ پا ہو جاتی ہے۔ اگر اس کمزوری کو نظر انداز نہ کیا جائے تو گھر دوزخ بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلعم نے عورت کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دی ہے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے ٹیڑھے پن کو درست کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر کوشش کی گئی تو ٹوٹ جائے گی۔ قرآن مجید نے بار بار عفو و کرم سے کام لینے اور ظلم و تعدی سے باز رہنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[4] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔ سو ان سے بچتے رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگذر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

---

[1] بخاری باب الوصاۃ بالنساء [2] ترمذی باب ماجاء فی حق المراۃ علی زوجھا۔ [3] مشکوۃ المصابیح کتاب النکاح باب فی عشرۃ النکاح الفصل الثانی [4] التغابن ۶۴: ۱۴

قرآن مجید نے یہاں تک تحمل اور بردباری سے کام لینے کی تعلیم دی ہے کہ اگران کی بعض حرکات ناپسند بھی ہوں تب بھی تحمل سے کام لینا چاہیئے ارشاد ہے:
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا [۱] اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو، اور اللہ اسی میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔ قرآن مجید نے جہاں عورتوں کو طلاق دینے کا ذکر کیا وہاں مردوں کو ہدایت کی ہے کہ عورتوں پر ظلم و تعدی نہ کی جائے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا [۲] اور ان کو دکھ دینے کے لیے نہ روک رکھو۔ تاکہ تم زیادتی کرو اور جو ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور اللہ کی باتوں سے ہنسی نہ کرو۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ لا یجلد احدکم امراتہ جلد العبد ثم یجامعھا فی الیوم الاخر [۳] تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو اسی طرح نہ پیٹنا شروع کر دے جس طرح غلام کو پیٹا جاتا ہے اور پھر دوسرے دن جنسی میلان کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس پہنچے۔ لا تضرب ظعینتک ضربک امتک [۴] اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح ہرگز نہ پیٹو لا تضرب الوجہ ولا تقبح ولا تھجر الا فی البیت [۵] نہ اس کے چہرے پر مارو اور نہ برا بھلا کہو اور نہ علیحدگی اختیار کرو۔ اگر اس کا موقع بھی آئے تو یہ گھر ہی میں ہو۔

سرزنش کی اجازت چونکہ اسلام ایک عملی دین ہے اس وجہ سے خاص حالات میں جسمانی اذیت دینے کی اجازت دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:
وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا [۶] اور جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو۔ تو ان کو وعظ و نصیحت کرو اور ان کے بستروں سے

---

[۱] النساء ۴: ۱۹ [۲] البقرہ ۲: ۲۳۱
[۳] بخاری باب مایکرہ من ضرب النسا [۴] مشکوۃ ص ۲۸۲
[۵] مشکوۃ باب عشرۃ النساء [۶] النساء ۴: ۳۴

الگ رہو اور ان کو مارو پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔

رسول کریم صلعم نے ضرب کی حد بندی کرتے ہوئے فرمایا: وَاضْرِبُوْهُنَّ ضرب غیر مبرح ان کو مارو مگر صرف الیسا جس کا اثر نہ ہو۔

بیوی کے لیے سامان طہارت ونظافت

شوہر پر بیوی کے لیے سامان طہارت ونظافت کا مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو صاف ستھری رکھ سکے اور خاوند کے دل کو زیادہ لبھا سکے۔ خاوند اور بیوی کی باہمی محبت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی گھر کا ماحول پُرسکون اور خوشگوار ہوگا۔

فقہاء نے خاوند کے فرائض میں سے یہ ایک فریضہ قرار دیا ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو سامانِ زینت اور نظافت مہیا کر کے دے۔

ویجب علیہ ما تنظف بہ وتزیل الوسخ کالمشط والدھن السدر والخطمی والاشنان والصابون علی عادۃ اھل البلد واما الطیب فیجب علیہ ما یقطع السھوکۃ ولا غیر علیہ ما تقطع الصنان[1]

شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے لیے ایسی چیزیں مہیا کر دے جس سے وہ اپنے آپ کو ستھری رکھ سکے اور میل کچیل دُور کر سکے جیسے کنگھی تیل۔ بیری کی پتی خطمی اشنان اور صابون جیسا کہ شہر کے رہنے والوں کا رواج ہے۔ اتنی خوشبو کا فراہم کرنا ضروری ہے اسی طرح بغل کی بو کو دُور کرنے کا سامان۔

بیوی پر اعتماد اور بھروسہ

گھر کا انتظام میاں بیوی کے باہمی اعتماد اور بھروسہ پر چلتا ہے۔ اگر ایک فریق بھی بد اعتمادی کرے گا تو گھر کا سکون ختم ہو جائے گا۔ چوں کہ مرد گھر کا صدر ہے۔ اس وجہ سے مرد پر فریضہ ہے کہ وہ بیوی پر اعتماد کرے اور گھر کے اندرونی معاملات اس کے سپرد کر دے۔ تاکہ اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ رسول کریم صلعم نے عورتوں کو ہی گھر کا نگران قرار دیا ہے فرماتے ہیں۔ والمراۃ راعیۃ علی بیت زوجھا[2] عورت اپنے خاوند کے گھر

---

[1] رد المختار ج ۲ ص ۴۰۷ [2] بخاری باب المراۃ راعیۃ بیت زوجھا

کی نگران ہے۔

باہمی مصالحت کی کوشش میاں بیوی کی زندگی میں کئی بار ناراضگی اور شکر رنجی کے مواقع آتے ہیں۔ ناراض اور شکر رنجی اور شکایت کے دُور کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ طلاق خلع کے ذریعہ مستقل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ فریقین باہمی مصالحت کی کوشش کریں اور اُن شکایات کے ازالہ کی کوشش کریں جن کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہوا ہے۔ قرآن اسی طریقہ کو بہتر قرار دیتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ [1]

اور اگر ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا خوف ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح اچھی چیز ہے۔ اسلام نے صلح کرانے کا ایک عمدہ طریقہ یہ بیان کیا ہے کہ دونوں جانب سے حکم مقرر کر دیئے جائیں۔ وہ میاں بیوی کے اختلاف اور رنجشوں کی وجوہ معلوم کر کے ان کو دُور کرنے کی تجاویز پیش کریں۔ میاں بیوی کو پھر اتحاد اور محبت کی لڑی میں منسلک کر دیں ارشاد ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا [2] اور تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو۔ تو ایک فیصلہ کرنے والا اس مرد کے لوگوں میں سے اور ایک فیصلہ کرنے والا اس عورت کے لوگوں میں سے مقرر کرو۔

بیویوں میں عدل و انصاف اگر خاوند کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو ان کے درمیان عدل و انصاف ایک ضروری امر ہے ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا [3] اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند ہوں۔ دو دو، تین تین اور چار چار اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی یا

---

[1] النساء ۴: ۱۲۸ [2] النساء ۴: ۳۵

[3] النساء ۴: ۳

جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے یہ زیادہ نزدیک ہے۔ کہ تم ناانصافی نہ کرو۔

حدیث میں آتا ہے: عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا کانت عند الرجل امراتان فلم یعدل بینھما جاء یوم القیامۃ وشقہ ساقط[1] حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جب کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور ان میں انصاف نہیں کرتا تو قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا نصف بدن خمیدہ ہوگا۔

مطلقہ عورت کو عقد ثانی سے روکنے کی ممانعت

زمانہ جاہلیت میں مطلقہ عورت کو قسم قسم کے طریقوں سے دوسری شادی سے روکتے تھے۔ اسلام نے عورت کو عقد ثانی سے روکنے کی ممانعت کردی ارشاد ہے: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ[2] اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو انہیں اس بات سے مت روکو کہ وہ دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کریں۔ جب کہ وہ جائز طور پر باہم راضی ہو جائیں۔

نکاح سے قبل عورتوں کی رضامندی

اسلام سے قبل عورتوں سے نکاح سے قبل رضامندی حاصل نہیں کرتے تھے۔ ولی جہاں چاہے جس سے چاہے شادی کر دیتا تھا۔ اسلام نے نکاح سے قبل عورتوں سے رضامندی حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ ثیبہ کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔ لوگوں نے پوچھا اس کی رضامندی کی کیا صورت ہے۔ فرمایا خاموش رہے[3]

قانونی حقوق

جس طرح مردوں کے لیے عورتوں کو طلاق دینے کا حق ہے۔ اسی طرح اسلام نے عورتوں کو بھی مردوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہے۔ اس علیحدگی کا نام اسلامی

[1] ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی [2] البقرہ ۲: ۲۳۲

[3] مسلم کتاب النکاح باب استئذان الثیب فی النکاح بالنطق والبکر بالسکوت

اصطلاح میں خلع ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ [۱] پس اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو پھر ان پر اس کے بارہ میں کچھ گناہ نہیں۔ جو عورت فدیہ دے دے اس کی تشریح حدیث سے ہوتی ہے۔ جیبیہ بنت سہل سے روایت ہے جو قیس بن شماس کے بیٹے سہل کے نکاح میں تھیں۔ ایک دن رسول اللہ صلعم نماز فجر کے لیے نکلے۔ تو جیبیہ بنت سہل کو اندھیرے میں اپنے حجرہ کے دروازے پر کھڑا پایا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ جیبیہ نے جواب دیا یا رسول اللہ میں جیبیہ بنت سہل ہوں۔ فرمایا کیسے آنا ہوا۔ عرض کیا میں اور ثابت بن قیس نکاح میں نہیں رہ سکتے۔ جب ثابت آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا یہ جیبیہ بنت سہل ہیں ان کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں جیبیہ نے کہا یا رسول اللہ ثابت نے جو کچھ مجھ کو دیا تھا۔ سب میرے پاس موجود ہے۔ رسول کریم صلعم نے ثابت سے یہ فرمایا کہ اس میں سے کچھ لے لو اور جیبیہ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے لے لیا اور جیبیہ اپنے کنبہ میں جا بیٹھی [۲]

جبریہ شادی میں فسخ نکاح کا حق

اگر ولی لڑکی کی شادی اس مرضی کے خلاف کر دے تو لڑکی کو یہ حق ہے کہ وہ عدالت میں جا کر فسخ نکاح کرا لے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک لڑکی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کر دی ہے۔ آپ نے اس لڑکی کو اختیار دیا کہ چاہے وہ قبول کر لے چاہے وہ رد کر دے [۳]۔

حضرت ابن عباس سے ایک دوسری روایت ہے کہ ایک عورت کا خاوند مر گیا۔ اس نے ایک شخص سے نکاح کرنا چاہا لیکن اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف ایک دوسرے شخص سے شادی کر دی۔ عورت نے رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔ آنحضرت نے اس کے والد کو بلا کر دریافت فرمایا کہ تم نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کی ہے۔ اس نے کہا ہاں جس سے لڑکی شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بہتر شخص کے ساتھ میں نے شادی

---

[۱] البقرہ ۲ : ۲۲۹ [۲] موطا باب ما جاء فی الخلع۔
[۳] سنن ابی داؤد کتاب النکاح باب فی البکر یزوجھا ولا یستأمرھا۔

کی ہے آپؐ نے دونوں میں تفریق کرادی [1]

مفقود الخبر خاوند سے انقطاع

خاوند کے مفقود الخبر ہونے کی حالت میں بیوی کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے

قرآن مجید اور احادیث میں کوئی قطعی فیصلہ تو موجود نہیں کہ بیوی کو کب تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اس وجہ سے فقہا کے درمیان مفقود الخبری کی مدت کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے کے مطابق بیس سال اور امام ابویوسف کی رائے کے مطابق سو سال حضرت امام شافعی کی رائے کے مطابق سات سال اور حضرت امام مالک کے نزدیک چار سال کی میعاد ہے۔ ابن مسیب کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوران جنگ مفقود الخبر ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال تک انتظار کرے۔ آج کل رسل و رسائل کا سلسلہ آسان اور عام ہے اس لیے ایک سال کی میعاد کافی ہے۔

شوہر کا نامرد اور مجبوب ہونا

اگر شوہر نامرد ہے تو مرد کو ایک سال کی مہلت علاج کے لیے دی جائے۔ اگر مرد ہم بستری کے قابل ہو گیا تو بہتر ورنہ بیوی کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ حضرت سعید بن المسیب کا بیان ہے: من تزوج امراۃ فلم یستطع ان یمسھا فانه یضرب اجل سنة فان مسھا والا فرق وا لا فرق بینھما [2]۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرے اور اس کو ہم بستر ہونے کی قدرت نہ ہو تو اس کو ایک سال کی مہلت دی جائے گی اگر اس کے بعد وہ زن و شوہر کے تعلقات کے قابل ہو گیا تو بہتر ورنہ ان دونوں میں علیحدگی کر دی جائے گی۔ لیکن اگر خاوند مجبوب (عضو تناسل کا کٹا ہوا ہونا) اور وہ ہم بستری کے لائق نہیں ہے تو خاوند کو بغیر کوئی مہلت دیے ہوئے عورت کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

امام قدرویؒ فرماتے ہیں: فان کان عنینا اجل الحاکم حولا فان وصل الیھا والا فرق بینھما ان طلبت المراۃ ذلک وان کان مجبوبا فرق القاضی بینھما فی الحال ولم یوجله [3] اگر مرد نامرد ہو تو حاکم اسے علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دے گا۔ اگر وہ ہم بستری کے لائق ہو گیا تب تو خیر ورنہ ان دونوں میں عورت کے مطالبہ پر علیحدگی کر دی جائے گی۔ اگر مقطوع الذکر ہو تو قاضی فوراً بغیر مہلت دیے تفریق کر دے گا۔

---

[1] مسند ابوحنیفہ زوج بریرۃ رض [2] موطا امام مالک ج ۲ صفحہ ۳۲ [3] قدوری مصری کتاب النکاح

حافظ ابن القیم ایک عام اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والقیاس ان کل عیب ینفر الزوج الاخر ولا یحصل بہ مقصود النکاح من الرحمۃ و المودۃ یوجب الخیار[1] ہر وہ عیب جس کی وجہ سے مرد ہم بستری کے لائق نہیں رہتا اور نکاح کا مقصد جو محبت اور مودت ہے فوت ہو جائے تو ایسی حالت میں علیحدگی کا اختیار دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

بیوی کے جذبات کا پاس خاوند کا یہ فرض کہ وہ عورت کے جذبات اور داعیات کا پاس کرے۔ حضرت عمرؓ نے ہر شادی شدہ سپاہی کو چار ماہ کے بعد گھر آنے کا حکم دیا ہوا تھا لا یتخلف المتزوج عن اھلہ اکثر منھا[2] جو سپاہی شادی شدہ ہو وہ اپنی بیوی سے چار مہینے سے زیادہ الگ نہ رہے اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[3] ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں کے حق دینے میں قسم کھا لیتے ہیں چار ماہ کا انتظار ہے اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اگر کوئی خاوند چار ماہ تک بیوی کے پاس جانے کی قسم کھا لے اور رجوع نہ کرے تو اس صورت میں عورت کو طلاق ہو جائے گی اور اس کو دوسری شادی کرنے کی اجازت ہو جائے گی۔

اخلاقی حقوق

اظہارِ وفاداری خاوند کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی سے مصیبت میں اظہار وفاداری کرے۔ اگر ایسی بیماری یا آفت کی وجہ سے بیوی کی شکل و صورت میں فرق آجائے تو عورت کو بدشکل ہو جانے کی وجہ سے بدسلوکی سے پیش نہ آئے بلکہ اپنی وفاداری محبت اور پیار کا اظہار کرے۔ اس سے بیوی کا دل مسرت سے لبریز ہو جائے گا اور وہ اپنے شوہر کو وفادار پا کر اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے

---

[1] زاد المعاد ج ۴ صفحہ ۳۱ [2] رد المختار ج ۲ ص ۳۳۴
[3] سورۃ البقرہ ۲ : ۲۲۶

تیار ہو جائے گی اور وہ ایک جان نثار رفیق ثابت ہو گا۔

بیوی کی رازداری شوہر پہ ایک یہ بھی فرض ہے کہ عورت کے ساتھ مخفی تعلقات کو دوسروں کو سامنے پیش نہ کرے۔ رسول کریم صلعم نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ان من اشر الناس عند اللہ منزلۃ الرجل یفضی الی امراتہ وتفضی الیہ ثم ینشر سرھا [1] لوگوں میں اللہ کے نزدیک بدترین وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے پاس جائے اور وہ اس کے پاس آئے پھر مرد اس کے مخفی تعلقات کو پھیلا دے۔

حضرت امام نووی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ فی ھذا الحدیث تحریم افشاء الرجل ما یجری بینہ وبین امراتہ من امور الاستمتاع ووصف تفاصیل ذلک ما یجری من المرأۃ فیہ من قول او فعل او نحوہ [2] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے راز کی باتوں کو افشا کرنا جیسے استمتاع اور اس کی تفصیل کہ ایسے ایسے ہوا ہے۔ اسی طرح عورت سے متعلق کوئی مخفی بات یا کوئی فعل یا اور کوئی ایسی ہی چیز کا اظہار حرام ہے۔

والدین سے ملنے کی اجازت بیوی کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ خاوند اس کو والدین اور قریبی رشتہ داروں سے ملنے سے محروم نہ کرے۔ رسول کریم صلعم خود حضرت فاطمہ رضؓ کے گھر پہ جا کر ملاقات کرتے تھے۔ فقہاء نے لکھا ہے ہفتہ میں ایک دن والدین سے ملنے کے لیے جائے تو خاوند کو روکنا نہیں چاہیئے۔ یہ اس وقت جب کہ بیوی کے والدین کسی معقول وجہ سے ملنے کے لیے نہ آ سکتے ہوں (دُرِّ مختار)

مطلقہ کو کچھ فائدہ پہنچانا اگر مجبوری کی حالت میں خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو خاوند پر یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ مہر کے علاوہ دستور کے مطابق بیوی کو دے کر رخصت کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یا شریفانہ طریقہ پر انہیں رخصت کرو۔

اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا [3]

حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے اور تمہارے لیے یہ جائز ہے نہیں کہ تم اس مال

[1] مسلم باب تحریم افشاء سر المراۃ [2] شرح مسلم ج ۱ ص ۴۶۴ [3] البقرہ ۲۳۱ [4] البقرہ ۲: ۲۲۹

سے کچھ واپس لو جو تم نے انہیں دیا ہے۔

اخلاق اور آخرت سنوارنے کی کوشش

جہاں مرد پر شادی کے بعد بے شمار فرائض عائد ہوتے ہیں وہاں ایک یہ بھی فرض ہے کہ بیوی کے اخلاق کو سنوارنے اور اس کی آخرت کو بہتر بنانے کی سعی کرے۔ ارشادِ الٰہی ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا[1] اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ: وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[2] اور اپنے قریبی رشتے والوں کو ڈرا۔

خاوند کا صاف ستھرا رہنا

عورت طبعاً نظافت پسند ہے اور اس کی حس جمالیات بہت تیز ہوتی ہے اس وجہ سے شوہر کا یہ فرض ہے۔ وہ اپنے لباس اور جسم کو صاف ستھرا رکھے تاکہ اس کی بیوی اس کو دیکھ کر خوش ہو۔ رسول کریم صلعم کسی صحابی کو گندے لباس میں دیکھ کر ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت عطاء بن یسار کی روایت[3] ہے کہ رسول کریم صلعم مسجد میں تشریف فرما تھے ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال پراگندہ تھے۔ آپ نے اشارہ سے فرمایا کہ بالوں کو درست کرے۔ چنانچہ اس نے سر اور داڑھی کے بال درست کر لیے۔ اس شخص کو واپس جاتے وقت آپ نے اچھی ہیئت میں دیکھا تو فرمایا کیا یہ ہیئت پہلی ہیئت سے اچھی نہیں ہے جو شیطان سی معلوم ہوتی تھی[3]۔ مشہور حدیث ہے: ان اللہ طیب یحب الطیب نظیفٌ یحب النظافۃ اللہ پاک ہے پاکی کو پسند کرتا ہے اللہ صاف اور پاکیزہ ہے اور صفائی کو محبوب رکھتا ہے۔

خاوند کے حقوق

قدرتی حقوق

اسلام نے عائلی زندگی میں شوہر کو گھر کا نگران اور صدر منتخب کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ[5] مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو

---

[1] تحریم ۶۶:۶ [2] الشعراء ۲۶:۲۱۴ [3] مشکوٰۃ باب الترجل [4] مشکوٰۃ باب الترجل۔
[5] النساء ۴:۳۴

بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انہوں نے اپنے مالوں سے کچھ خرچ کیا ہے مرد کے قوام ہونے کی دو وجوہ بیان کی ہیں۔ اوّل مرد عورت سے جسمانی اور دماغی قویٰ میں برتر ہے۔ دوم۔ مرد عورت کے لیے کپڑا، روٹی، گھر وغیرہ مہیا کرتا ہے۔

جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرد عورت سے عقلی قویٰ میں افضل ہے اور وہ جسم اور عضلات میں مضبوط ہے۔ مشہور فلاسفر علامہ پیرو ڈان اپنی کتاب ابتکار المنظام میں لکھتا ہے:

عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے اسی قدر ضعیف ہے جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی عقلی قوت کے مقابلہ میں ضعیف نظر آتی ہے۔ اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے وہ مردوں کی رائے کے مطابق نہیں ہوتی پس مرد اور عورت میں یہ فرق کوئی عارضی امر نہیں بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے[1]

اس قول کو نقل کر کے علامہ فرید وجدی رقمطراز ہیں۔ حواس خمسہ پر انسان کی عقلی اور دماغی نشو و نما کا دار و مدار ہے۔ اس میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ نیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف تر ہیں[2]

پھر علامہ صاحب لکھتے ہیں:

"علم سائیکلوجیا نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔ مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت کے بھیجے سے سو ڈرام زیادہ ہے[3]"

اس کے بعد علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:

"یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلّہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہُوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر (۴۹½) ساڑھے انچاس

---

[1] مسلمان عورت ص ۳۹ [2] مسلمان عورت ص ۳۹
[3] مسلمان عورت ص ۴۱

اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف (۴۴) چوالیس، دو سو اٹھہتر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن (۶۵) اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن (۳۴) چونتیس اوقیہ ثابت ہوا۔ لیکن جب دو سو اکانوے (۱۹۱) دماغ عورتوں کے وزن کیے گئے تو سب سے وزنی دماغ چوّن (۵۴) اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ اکیس (۲۱) اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قویٰ مرد کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہیں[۱]۔"

جدید تحقیقات نے یہ امر واضح کر دیا ہے کہ مرد عورتوں سے جسمانی اور دماغی صلاحیتوں میں افضل اور برتر ہیں۔ اس وجہ سے گھر کے انتظام کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اسلام نے بھی انہی وجوہ کی بنا پر نظام منزلی میں مرد کو صدر قرار دیا ہے۔ اسلام نے مرد کو نظام منزلی کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کرنے کے باوجود یہ حکم دیا ہے کہ گھریلو امور باہمی مشورہ سے طے کیے جائیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا[۲] اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔

پھر ایک عام اصول مقرر کر دیا کہ مومن ہر معاملہ بھی مشورہ سے انجام دیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[۳] ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔

جنسی میلان میں حکم کی بجاآوری

جنسی میلان کی تکمیل ایک طبعی تقاضا ہے اس طبعی تقاضے کی تکمیل کے ساتھ بیشمار اخلاقی تمدنی اور روحانی فوائد وابستہ ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے عورت کو یہ حکم دیا ہے کہ جب اس کا شوہر بلائے تو وہ فرمانبرداری کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اذا الرجل دعا زوجته لحاجته فلتأته وان كانت على التنور[۴] جب خاوند اپنی بیوی کو جنسی میلان کی تکمیل کے لیے بلائے تو وہ فوراً اس کے پاس آ جائے۔ گو وہ تنور پر بیٹھی روٹی پکا رہی ہو اگر وہ حکم نہ بجا لائے تو وہ گنہگار ہوگی۔ فرماتے ہیں:

---

۱ مسلمان عورت ص ۴۱
۲ البقرہ ۲: ۲۳۳
۳ الشوریٰ ۴۲: ۳۸
۴ ترمذی باب عشرۃ النساء

اذا دعا الرجل امرأته الی فراشہ فأبت ان تجی لعنتھا الملئکۃ حتی تصبح (بخاری)

خاوند جب اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے تو فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔

حضرت امام نووی فرماتے ہیں کہ بغیر عذر شرعی بیوی کا خاوند کے مطالبہ ہم بستری کا انکار کر دینا حرام ہے[1]۔ گو جنسی میلان کی تکمیل کے لیے بیوی سے خاوند کا مطالبہ ہمبستری نہایت ضروری ہے۔ لیکن فقہا نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اگر بیوی کی صحت اس امر کی اجازت نہ دے تو مرد اجتناب کرے لو تضررت من کثرۃ جماعہ لم تجز الزیادۃ علی قدر طاقتھا[2] اگر کثرت جماع عورت کی صحت کے لیے مضر ہو تو ایسی حالت میں اس کی طاقت سے زیادہ ہم بستری جائز نہیں۔

تمدنی حقوق

اطاعت دنیا کے تمام نظاموں کے استحکام اور استواری کا راز اطاعت ناظم الامور اور نگران اعلیٰ میں مضمر ہے۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلعم نے اطاعت امیر پر بہت زور دیا ہے۔ منزلی نظام بھی اطاعت کے بغیر نہیں چل سکتا۔ نہ گھر کا ماحول خوشگوار بن سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام بیویوں کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کی اطاعت کریں چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ[3] سو نیک عورتیں خاوندوں کی فرمانبردار ہوتی ہیں۔

حدیث میں آتا ہے حضرت خولا ایک دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بیان کیا کہ ہر رات پہن اوڑھ کر اور آراستہ ہو کر لوجہ اللہ اپنے شوہر کے لیے دلہن بن جاتی ہوں اور ان کے پاس سوتی ہوں مگر پھر بھی وہ توجہ نہیں کرتے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ خدمتِ نبوی میں عرض کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا ان سے کہہ دو کہ وہ اپنے خاوند کی اطاعت کرتی رہیں[4]۔

---

[1] شرح مسلم ج ۱ ص ۴۶۴ [2] در مختار باب القسم

[3] النساء ۴: ۳۴ [4] اسوہ صحابہ ۱ ص ۲۵۲

عن ابی هریرۃ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم لو کنت امر احداً ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا [1]

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ عن ام سلمۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما امرأۃ ماتت وزوجھا عنھا راض دخلت الجنۃ [2] ام سلمہ کہتی ہیں کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا ہر وہ عورت جو اس حالت میں فوت ہو کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔

گھر کا کام کاج کرنا

گھر کے کاموں کو اپنے ہاتھ سے کرنا بیوی کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔ ازواج مطہرات اور حضرت فاطمہؓ اور دیگر صحابیات گھر کے کاموں کو از خود کیا کرتی تھیں۔ حضرت امام بخاری نے اپنی جامع میں ایک باب باندھا ہے۔ عمل المرأۃ فی بیت زوجھا۔ یعنی عورت کا اپنے خاوند کے گھر میں کام کاج کرنا حضرت فاطمہؓ گوشہ جگر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آٹا پیسنے کے لیے چکی چلایا کرتی تھیں اور ان کے ہاتھوں پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بیوی پر اس وقت تک گھر میں اپنے ہاتھ سے کام کرنا لازم ہے جب تک اس کا خاوند مالدار نہیں ہو جاتا۔ خواہ بیوی کسی بڑے گھرانے کی چشم و چراغ کیوں نہ ہو [3]

حفظ غیب

قرآن مجید نے نیک عورتوں کی ایک صفت حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے جو اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے) بیان کی ہے۔ حفاظت کی مفعول "حقوق خاوند" مضمر ہے۔

حفظ غیب سے مراد بیوی کا خاوند کی غیر موجودگی میں اپنی عصمت اور عفت کی حفاظت مال کی حفاظت اور رازوں کی حفاظت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اربع من اعطی فقد اوتی خیر الدنیا والاخرۃ قلب شاکر ولسان ذاکر و

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۳ [2] مشکوٰۃ المصابیح باب عشرۃ النساء

[3] عمدۃ القاری ج ۹ ص ۶۵ ۲۴ زاد المعاد ج ۲ ص

بدن علی البلاء صابر و زوجۃ لا تبغیہ خوفا فی نفسھا ولا فی مالہ [1]
چار چیزیں ہیں جس کو وہ دی گئی ہوں اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل گئی۔ شکر گزار دل، ذکر الٰہی کرنے والی زبان، مصائب میں صبر کرنے والا جسم اور وہ عورت جو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے: قیل لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای النساء خیر قال التی تسرہ اذا نظر و تطیعہ اذا امر ولا تخالفہ فی نفسھا ولا فی مالھا بما یکرہ [2] رسول کریم صلعم سے عرض کیا گیا کہ عورتوں میں سے بہتر عورت کون سی ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ کہ جب شوہر اس کو دیکھے تو اس کو خوش کر دے اور جب وہ حکم دے تو اس کا حکم بجالائے اور اپنی جان اور مال میں کسی ایسی بات میں اس کی مخالفت نہ کرے جو اس کو ناپسند ہو۔

لا تصدق بشیء من بیتہ الا باذنہ فان فعلت فان لہ الاجر و علیھا الوزر ولا تخرج من بیتہ الا باذنہ۔ [3]

بیوی کو شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے خیرات نہیں کرنا چاہیئے اگر وہ ایسا کرے گی تو اس کے لیے ثواب ہوگا اور اس پر گناہ اور اس کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے۔ المرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وھی مسئولۃ عورت اپنے شوہر کے گھر پر نگران ہے اور اس سے پوچھا جائیگا۔

خاوند کے رشتے داروں اور دوستوں سے حسنِ سلوک

قرآن مجید نے عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ [4] سو قریبی کو اس کا حق دے۔ قریبی رشتے داروں کے حقوق کی ادائیگی جس طرح مرد پر فرض ہے اسی طرح عورت پر بھی فرض ہے۔

عفت اور عصمت کی حفاظت کے لوازمات

قرآن مجید کی تعلیم کا یہ کمال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس کی تعلیم کامل ترین ہے۔ قرآن مجید نے پاکدامن رہنے کا حکم دیا ہے تو ساتھ ہی پاک دامن

---

[1] مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النساء صفحہ ۲۸۳
[2] مشکوۃ المصابیح باب عشرۃ النساء ۲۸۳ [3] بخاری کتاب النکاح باب قوا انفسکم و اھلیکم نارا صفحہ ۱۸۳ [4] روم ۳۰ : ۳۸

رکھنے کے لیے طریقے بھی بتلا دیے ہیں۔
تحفظات کے یہ طریقے تین قسم کے ہیں۔

۱۔ اصلاح باطن: اسلام نے اصلاح باطن کی بنیاد معرفت الٰہی پر رکھی ہے جتنی اللہ کی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی گناہوں کی وادی سے دور رہے گا۔ اللہ کی معرفت ہی وہ علاج جس سے انسان اپنے دل کو پاک رکھ سکتا ہے۔ تعزیری قوانین سے ڈر کر ان اعمال سے رُک سکتا ہے جو سوسائٹی کے بگاڑ کا موجب ہو سکتے ہیں لیکن تعزیری قوانین دل کو پاک نہیں کر سکتے اس لیے قرآن پاک کی تمام تعلیمات کا حقیقی محور ایمان باللہ ہے جس کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا تصور مستولی ہوگا وہ گناہوں کے زہر کا پیالہ کبھی بھی اپنے لبوں تک نہیں لائے گا جس طرح وہ شخص جس کو یہ علم ہو کہ اس بل میں سانپ ہے اُس میں ہلاکت سے بچنے کے لیے ہاتھ نہیں ڈالتا اسی طرح جس کا دل اللہ کی حقیقی معرفت سے بھرا ہو وہ گناہوں کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اللہ کی حقیقی معرفت کا نہ ہونا ہی گناہوں کے ارتکاب کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حقیقی معرفت حاصل کرنے کے لیے ذکر الٰہی، دعا، مجاہدہ اور راست بازوں کی صحبت میں رہنے کی تعلیم دی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منکرات اور خواہش سے بچنے کے لیے انسان کی فطرت میں حیا کا مادہ رکھ دیا ہے۔ انسان بالطبع برائیوں سے نفرت کرتا ہے۔ یہ اس کی نفرت حیا کے مادہ سے پھوٹتی ہے۔

اصلاح باطن کا دوسرا طریقہ مادہ حیا کو جلا دینا ہے جو انسان کو ہر وقت برائیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ اگر انسان غلطی سے کسی گناہ کا ارتکاب کر بھی جائے تو پھر اس کو ندامت کے تازیانے مارتا رہتا ہے اور وہ آئندہ اس کے لیے فواحش کا ارتکاب کرنے سے توبۃ النصوح کر لیتا ہے۔ قرآن مجید نے اس مضمون کو آدم علیہ السلام کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ کس طرح جب آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تو اس کو مادہ حیا نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ آستانہ الوہیت پر گر پڑا اور اپنی ندامت کے آنسوؤں سے گناہوں کی میل کو صاف کیا۔
ارشادِ الٰہی ہے: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ[1] شیطان نے دھوکے سے ان کو گرا دیا سو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا۔ ان کے عیب ان پر کھل گئے اور وہ باغ کے پتوں سے اپنے آپ

---

[1] الاعراف ۷: ۲۲

ڈھانکنے لگے۔

آدم علیہ السلام کو اپنی لغزش کا احساس شرم وحیا کی وجہ سے ہوا اور یہ وہ فطری خوبی ہے جس سے انسان برائیوں سے بچتا ہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں الحیا خیر کلہ[1] یعنی حیا سراسر بھلائی ہے ان لکل دین خلقا وخلق الاسلام الحیاء[2] ہر دین کے لیے ایک صفت ہوتی ہے اور اسلام کی صفت حیا ہے۔

۲- انسدادی تدابیر: اسلام نے عورت کی عفت کو محفوظ رکھنے کے لیے بعض ایسی انسدادی تدابیر بھی تجویز کی ہیں ان کو اختیار کرنے سے عورت فواحش سے بچ سکتی ہے۔

پردہ: اسلام میں پردہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محصور رکھا جائے اور کسی کام کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ پردہ کا یہ تصور جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے اسلام میں پردہ سے مراد صرف یہ ہے کہ عورت اور مرد کو آزادانہ اختلاط نظر اندازی اور اپنی آرائش وزیبائش کے دکھانے کے مواقع ختم کیے جائیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل تعلیم دی ہے۔

بغیر ضرورت گھر سے باہر نکلنا: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ[3] اور اپنے گھر میں ٹھہری رہو۔

اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ عورت گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ عورتیں بغیر کسی وجہ اور کام کے گھر سے باہر نہ نکلیں۔ حدیث شریف میں عورتوں کو کام سے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ رسول کریم صلعم نے عورتوں سے فرمایا: کہ تمہیں اجازت ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے اپنے گھروں سے باہر جاؤ[4]۔

فقہا نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چند گنے چنے اسباب کے سوا عورت کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنے کا حق نہیں ان اسباب میں سے ایک یہ کہ وہ ایسے مکان میں ہو جس کے گرنے کا خطرہ ہو۔

ایک یہ کوئی مسئلہ پیش آجائے اور خاوند فقیہ نہ ہو تو وہ بلا اجازت علمی مجالس کی

---

[1] بخاری [2] الموطا اب خروج النساء الی ابواز
کتاب النکاح باب خروج النساء الخ

[3] الاحزاب ۳۳ : ۳۳ [4] بخاری کتاب الوضو

طرف رُخ کر سکتی ہے۔ اسی طرح اس پر حج فرض ہو جائے تو اگر کوئی محرم بھی موجود ہو۔ تو شوہر اسے جانے کی اجازت دے سکتا ہے اور اس سے وہ گنہگار نہ ہو گا۔ اسی طرح والدین کی ملاقات ان کی عیادت تعزیت اور محرم رشتے داروں سے ملنے جلنے کے لیے بھی وہ شوہر کی اجازت کی پابند نہیں (فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص ۴۴۳)

نقاب اوڑھ کر نکلنا:

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا

[1] اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں۔ زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں ایذا نہ دی جائے۔

جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو سارے جسم کو ڈھانپ لے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں بوڑھی عورتوں میں اب تک چادر اوڑھنے کا رواج ہے۔ وہ اس طرح اوڑھتی ہیں کہ بدن ڈھانپنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر کے نیچے چہرہ پر لٹکا لیتی ہیں جس کو گھونگھٹ کہا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مسلمان عورتیں چہرہ کو چھپا کر باہر نکلتی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خواتین کو حکم دیا ہے کہ جب کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنا سر اور منہ چھپا لیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رہے۔

ایک بار محمد ابن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ سلیمانیؒ سے اس آیت کی تشریح پوچھی تو انہوں نے زبان سے تشریح کرنے کی بجائے اپنی چادر لی اور اس طرح اوڑھ کر دکھائی کہ سر اور چہرہ وغیرہ سب کچھ چھپا لیا۔ صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

علامہ زمخشری کشاف میں اور علامہ عبداللہ بن احمد نسفیؒ مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں۔ عورتیں اپنے اوپر چادر کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانپ لیں۔

حضرت احمد جریر فرماتے ہیں۔ شریف خواتین لونڈیوں کا لباس پہن کر گھروں سے باہر نہ نکلیں کہ ان کا چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں بلکہ انہیں چاہیئے کہ اپنے

---

[1] الاحزاب ۳۳ : ۵۹

اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی بدکردار ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرسکے۔

اظہارِ زیبائش کی ممانعت

اسلام عورتوں کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ بن ٹھن کر گھروں سے باہر نکلیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ [۱] پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ [۲] اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ ان کے چھپے ہوئے زیور معلوم ہوجائیں۔ مرد کی فطرت میں داخل ہے جب وہ کسی عورت کی پازیب کی آواز سنتا ہے تو اس کا جنسی میلان کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے عورتوں کو منع کردیا ہے وہ اس قسم کے زیورات پہن کر نہ نکلیں جو چلنے میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر آواز پیدا کریں۔

خوشبو لگا کر نکلنے کی ممانعت

یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عورت خوشبو اور عطر وغیرہ لگا کر گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ خوشبو بھی مرد کی توجہ کو عورت کی طرف کھینچتی ہے۔

ایک حدیث ہے: كل عين زانية والمرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني زانية [۳] ہر آنکھ زانیہ ہے اور جو عورت خوشبو لگا کر مجلس پر گزرتی ہے وہ بھی زانیہ ہے۔

نگاہیں نیچی رکھنا

تمام فتنے نظر اندازی سے اُٹھتے ہیں اس وجہ سے مرد اور عورت دونوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کی تعلیم دی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا [۴]

(مومنوں کو کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو وہ کرتے ہیں اور مومن عورتوں کو کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (عادتاً) کھلا رہتا ہے۔)

---

[۱] الاحزاب ۳۳ : ۳۳ [۲] النور ۲۴ : ۳۱ [۳] ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۸۶
[۴] النور ۲۴ : ۳۰ : ۳۱

حضرت علیؓ سے ایک دفعہ رسول کریم صلعم نے فرمایا: یا لا تتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولی ولیست لک الاخرۃ [۱] اے علی ایک بار نظر پڑ جانے کے بعد دوبارہ نہ دیکھو کیونکہ تمہارے لیے صرف پہلی نظر معاف ہے دوسری نہیں (ابن کثیر) بعض روایت میں آپ نے فرمایا اطرق بصرک تو اپنی نگاہ جھکا لے۔ ایک دفعہ فرمایا: غضوا ابصارکم واحفظوا فروجکم [۲] اپنی نگاہوں کو نیچا رکھو اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرو۔ طبرانی میں ہے رسول کریم صلعم نے فرمایا: لتغضن ابصارکم و لتحفظن فروجکم [۳] تم ضرور اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو۔

اوٹ پیچھے سے استفادہ کرنا

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ [۴] اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے ان سے مانگو۔ یہ تمہارے دلوں کے لیے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاک ہے اس آیت کا منشا یہ ہے۔ کہ غیر مرد آزادانہ دوسرے گھروں میں نہ جائیں۔

غیر مردوں سے کھرے لہجہ میں بات کرنا

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا [۵] اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو نرم آواز میں بات کہو ایسا نہ ہو کہ وہ جس کے دل میں بیماری ہے طمع کرے اور نیکی کی بات کہو۔

عموماً عورتوں کی آواز میں شیرینی اور جاذبیت ہوتی ہے اس وجہ سے اسلام نے عورتوں کو تعلیم دی ہے کہ اگر وہ کسی ضرورت کے تحت کسی مرد سے کلام کرنا پڑے تو مردانہ انداز کلام اختیار کریں تاکہ وہ غلط امید نہ باندھ لے۔

عام گزرگاہ سے اجتناب کرنا

گزرگاہوں اور صدر راستوں پر عام مردوں کا گزر ہوتا ہے جہاں عورتوں کا چلنا فتنہ کا موجب بن جاتا ہے۔ اس وجہ سے عورتوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ یہ راستہ کے کنارے پر چلیں۔

---

[۱] مشکوۃ ۱۶۹ [۲] الجواب الکافی ص ۲۰۴
[۳] ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۸۲ [۴] الاحزاب ۳۳ : ۵۴ [۵] ۳۳ : ۳۲

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: استاخرن فانہ لیس لکن ان تحققن الطریق علیکن بحافات الطریق [1] عورتیں پیچھے ہو جائیں عورتوں کے لیے یہ ضروری ہے وہ راستہ کے کنارے پر چلیں۔

تخلیہ اسلام نے ان تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے جن کے راستہ سے شیطان کسی عورت کی پاکدامنی اور عفت پر حملہ کر سکتا ہے ان خطرناک دروازوں میں سے ایک دروازہ مرد کا عورت سے علیحدگی میں ملنا ہے۔

رسول کریم صلعم نے مرد کو عورت سے علیحدگی میں ملنے سے منع فرما دیا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: لایخلون رجل بامراۃ الا کان ثالثھما الشیطان [2] کوئی مرد کسی عورت سے تخلیہ میں نہیں ملتا مگر تیسرا شیطان موجود رہتا ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلعم سے شوہر کے بھائی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا الحمو الموت [3] یعنی شوہر کا بھائی موت ہے۔

سفر: عورت کو بعض اوقات سفرِ حج، والدین کی ملاقات، عیادت اور تعزیت اور دیگر ضروری حاجتوں کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ اسلام نے فتنوں سے بچنے کے لیے معیت محرم کی شرط لگا دی۔ ارشادِ نبوی ہے: لا یحل لامراۃ ان تحج الا مع زوج او محرم کسی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ خاوند یا کسی محرم کے بغیر حج کرے (معجم طبرانی) یہاں پردہ اور دوسرے تحفظات کے متعلق۔ دان ہمر اور ہیملٹن کے تاثرات درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

دان ہمر کہتا ہے:

> پردہ کو اسلام نے ضروری اور عورتوں کو اجنبیوں سے میل جول رکھنے کو جو حرام کر دیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبہ کو فنا کر دیا جائے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے ان کے ناموس کی حفاظت و احترام کا ایک اور ذریعہ ہے۔ ان کی رسوائی کی روک تھام کا در حقیقت اسلام کی نظر میں عورت کا درجہ و مقام ہے وہ یقیناً قابلِ رشک ہے [4]

---

[1] ابن کثیر ۳ صفحہ ۲۸۶ [2] مشکوۃ صفحہ ۲۶۹

[3] مشکوۃ۔ باب النظر الی المخطوبہ [4] بحوالہ اسلام کا نظامِ حیات مصنفہ عبدالوہاب ظہوری ص ۱۵۰

ہملٹن کہتا ہے :

"اسلامی احکام عورت کی شان میں نہایت صریح ہیں جو اس کی عزت افزائی کو برقرار رکھنے اور اس کی بے حرمتی و ایذا رسانی سے محفوظ رکھنے کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں - اسلام نے پردہ کے باب میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا - جیسا کہ بعض مصنفوں کا خیال ہے بلکہ اس سے غیرت و مروت کے اسباب کا لحاظ رکھا ہے[۱]"

تعزیری قانون

عفت اور عصمت کو محفوظ رکھنے کے لیے ان تمام محرکات اور اسباب کا خاتمہ کرنے کے بعد اگر عورت اور مرد زنا کے مرتکب ہوتے ہیں تو ان کے لیے سو کوڑے کی سزا مقرر ہے - ارشاد الٰہی ہے : اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ[۲] زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور ان پر مہربانی اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو - اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو -

اگر لونڈیاں زنا کی مرتکب ہوں تو ان کی اس سے نصف سزا ہوگی : فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ[۳] پھر جب وہ نکاح میں لائی جائیں اور اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں کی سزا سے آدھی سزا ہے -

حد قذف

قذف کے معنی ہیں کسی پر جھوٹی تہمت لگانا چونکہ اس سے ایک شریف عورت بدنام ہو جاتی ہے - اس وجہ سے شریعت نے اس کی بھی سزا مقرر کر دی ہے -

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[۴]

اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہ نافرمان ہیں -

---

۱؎ ایضاً صفحہ ۱۴۹ ۲؎ النور آیت ۲

۳؎ النساء ۴ : ۲۵ ۴؎ النور آیت ۴

قانونی حقوق

طلاق ازدواجی زندگی میں بعض ایسے مواقع آتے ہیں کہ جب میاں بیوی پُرسکون ماحول میں اکٹھی زندگی بسر نہیں کر سکتے اور اکٹھے رہنے سے مختلف قسم کے اخلاقی معاشرتی مفاسد پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام نے مرد کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ عورت کو طلاق دے دے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ[1]
تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو۔

طلاق کے احکام پہلے گزر چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

اخلاقی حقوق

خندہ پیشانی سے پیش آنا شادی کا ایک اہم مقصد تسکین قلب ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ[2] اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

یہ آیت اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ بیوی کا یہ فرض ہے کہ خاوند جب گھر میں داخل ہو تو اس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرے۔ محبت بھرے لہجہ میں اس کا حال دریافت کرے۔ اس طریقہ سے مرد کی دن بھر کی تھکاوٹ اور پریشانی ایک لحظہ میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے بہترین عورت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: التی تسرہ اذا نظر[3] جب خاوند کی نگاہ بیوی پر پڑے تو اس کو خوش کر دے۔

ہٹ دھرمی سے اجتناب: ہٹ دھرمی اور ضد اور بات بات پر آگ بگولا ہو

---

[1] البقرہ ۲: ۲۳۶ [2] سورۂ روم ۳۰: ۲۱
[3] مشکوٰۃ

جانا رشتہ مودت کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے اگر عورتوں کے لیے یہ ضروری امر ہے کہ وہ خاوند کا خندہ روئی سے خیر مقدم کریں تو اس کے لیے یہ امر اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور سے اجتناب کریں جو رشتۂ مودت کو ختم کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ بیوی کا اپنے رویہ کو درست رکھنے اور ہٹ دھرمی سے باز رہنے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: فَالصّٰلِحٰتُ [1] پس جو نیک روش اختیار کرنے والی عورتیں ہیں۔

صبر اور تحمل سے کام لینا

ازدواجی زندگی میں ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں جب کہ خاوند زیادتی پر اتر آتا ہے۔ گو اسلام نے مردوں کو عورتوں پر زیادتی کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ لیکن اگر پھر بھی اگر خاوند کی طرف سے زیادتی اور تشدد ہو تو عورت کے لیے یہ امر لازمی ہے کہ صبر و تحمل سے کام لے۔ صلح اور آشتی کی طرف ہاتھ بڑھائے تاکہ عمر بھر کی ازدواجی رفاقت کا رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ [2] اور ایک عورت کو اپنے خاوند کی زیادتی یا بے رغبتی کا ڈر ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ اور صلح اچھی چیز ہے۔

زیبائش و آرائش اختیار کرنا

مرد طبعی طور پر بیوی کے زیبائش و آرائش کو پسند کرتا ہے۔ اس وجہ سے بیوی کا یہ فرض ہے کہ زینت اختیار کرے تاکہ اس میں قوت جذب بڑھے اور خاوند اس کی طرف زیادہ مائل ہو۔ عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام میں عورتیں اپنے خاوندوں کو خوش رکھنے میں بے حد کوشش کیا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ کا یہ واقعہ ہے کہ ایک دن اپنے ہاتھوں میں چاندی کے چھلے پہنے ہوئے تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چھلوں کو دیکھ کر فرمایا عائشہ یہ کیا ہے۔ جواب دیا آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پہنے ہیں [3]

حضرت خولا ہر روز اپنے شوہر کے لیے آراستہ پیراستہ ہو جاتی تھیں [4]۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رض نے حضرت عثمان رض بن مظعون کی بیوی کو زینت کے لباس سے عاری دیکھا

---

[1] النساء ۴: ۳۴ [2] النساء ۴: ۱۲۸ [3] اسوۂ صحابہ ج ۲ صفحہ ۲۵۲
[4] ۱۰۲ ۔ ۱۰۸۱ ح ۱ ص ۲۵۲

تو انہوں نے دریافت کیا۔ کیا عثمان سفر پہ گئے ہوئے ہیں[1]۔

حضرت امام شوکانی نیل الاوطار میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا تعجب سے دریافت کرنا یہ ظاہر کرتا ہے۔ بیویوں کو اپنے شوہروں کے لیے زیبائش و آرائش اختیار کرنا پسندیدہ ہے۔

شکر گزاری عورتوں کا اپنے خاوندوں کے احسانات کی شکر گزاری کرنا نہایت ہی اہم فریضہ ہے۔ کیونکہ شکر گزاری محبت کے جذبے کو اُبھارتی ہے۔ اور ناشکر گذاری جذبۂ نفرت کو بھڑکاتی ہے۔ بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم نے خطبۂ عید میں عورتوں کو مخاطب کرکے فرمایا؛ اے عورتوں کی جماعت صدقہ کرو کیونکہ میں نے تمہیں دوزخ میں مردوں کی نسبت زیادہ تعداد میں دیکھا ہے۔ ایک عورت بول اُٹھی یارسول اللہ ایسا کیوں ہوا؟ تو آپ نے جواب دیا تکثرن اللعنة وتکفرون العشیرہ تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔

حقوق والدین

حقوق والدین کی اہمیت والدین معاشرہ کی اصل ہیں۔ اگر یہ اصل مضبوط اور صحیح سلامت رہے تو معاشرہ کا درخت سرسبز اور مثمر رہے گا۔ اس وجہ سے ہر مذہب اور ہر قوم میں والدین کی عظمت مسلمہ ہے۔ شاید ہی دُنیا میں کوئی ایسی قوم ہو جو والدین کی عظمت کی معترف نہ ہو۔ والدین اللہ کی صفت ربوبیت کے مظہر ہوتے ہیں۔

بائیبل میں والدین کے احترام کے باب میں آیا ہے:

تو اپنے والدین کو عزت دے[2]۔ ہر ایک اپنے ماں اور باپ سے ڈرتا ہے[3]"

جو کوئی ماں باپ پر لعنت کرے وہ مار ڈالا جائے گا[4]

---

[1] مسند احمد

[2] خروج ۲۰: ۱۲ [3] احبار ۱۹: ۳ [4] احبار ۲۰: ۹

اسلام نے والدین کے حقوق کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

والدین کا مقام اسلام نے والدین کو عزت و احترام کے بلند مقام پر کھڑا کیا ہے۔ اتنا بلند مقام کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے عبادت کرنے اور شرک سے باز رہنے کا حکم آیا ہے وہاں والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اِذَا اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا[1]

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ سوائے اللہ کے تم کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا[2]

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ہجرت اور جہاد پر بیعت کرنا چاہتا ہوں پوچھا کیا اللہ تعالیٰ اسے اجر چاہتے ہو اور تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے عرض کیا ہاں دونوں زندہ ہیں پس فرمایا جاؤ ان کی خدمت کرو[3]

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا۔ ذلیل ہو گیا وہ شخص ذلیل ہو گیا وہ شخص ذلیل ہو گیا وہ شخص عرض کیا گیا یا رسول اللہ کون۔ فرمایا جس نے ماں باپ سے ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا اور پھر جنت میں داخل نہ ہوا[4]

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے[5] ابو امامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ والدین کا اولاد پر کیا حق ہے۔ فرمایا وہ تیری جنت اور تیری دوزخ ہیں[6]

---

[1] البقرہ ۲: ۸۳ [2] بنی اسرائیل ۷ : ۲۳

[3] مسلم کتاب البر والصلۃ والادب باب بر الوالدین وانہما احق

[4] مشکوۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸

[5] ایضاً ۴۱۸ [6] ایضاً ۴۱۸

معاشرتی حقوق

احسان کرنا

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا [۱]

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور اسے تکلیف سے جنا اور اس کا حمل میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے تک ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا [۲] اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا [۳] اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا [۴] کہہ آؤ میں تم کو پڑھ کر بتاؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے رسول کریم صلعم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کام کونسا ہے۔ آپ نے فرمایا وقت پر نماز پڑھنا پوچھا پھر کونسا ہے۔ فرمایا والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔ پوچھا اس کے بعد فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا [۵]

حضرت عبداللہ بن سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ نے پوچھا تمہارے والدین زندہ ہیں فرمایا جاؤ انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کرو [۶]۔

ابوہریرہ سے روایت ہے کہا ایک آدمی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ فرمایا تمہاری ماں۔ بولا پھر کون فرمایا تیری ماں بولا پھر کون فرمایا تیری ماں بولا پھر کون فرمایا تیرا باپ [۷]۔

---

[۱] الاحقاف ۴۶: ۱۵ [۲] النساء ۴: ۳۶ [۳] عنکبوت ۲۹: ۸ [۴] انعام ۶: ۱۲۵

[۵] بخاری کتاب الادب باب ووصینا الانسان بوالدیہ [۶] مسلم کتاب البر والصلۃ والادب باب بر الوالدین انہما احق بہ [۷] مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸

شکرگزاری دنیا میں انسان کے سب سے بڑے محسن والدین ہیں۔ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے خون سے اس کی پرورش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جب بچہ اس دنیا میں سانس لیتا ہے تو چھاتیوں سے دودھ پلا کر اس کو پالتی ہے ذرا تکلیف ہو جائے۔ ساری رات دکھ اور درد سے آنکھوں میں کاٹتی ہے۔ درد یوں محسوس کرتی ہے گویا وہ خود بیمار ہے۔ اپنا آرام اپنی خوشی اپنی امید سب بچے کی خوشیوں پر قربان کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ بے غرض محبت سے کرتی ہے۔ دل کے کسی گوشہ میں بھی حرص اور طمع نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے اولاد کا یہ فرض ہے کہ والدین کے شکر گزار ہیں قرآن مجید میں آتا ہے: اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ [۱] میرا شکر گزار اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو تم اپنے باپ سے بیزار مت ہو کیوں کہ باپ سے بیزار ہونا ناشکرگزاری ہے[۲]

والدین کا ادب قرآن مجید میں آتا ہے: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا [۳] تو ان کو اُف تک نہ کہہ اور نہ اُن کو ڈانٹ۔ ان دونوں سے ادب سے بات کر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپس کے لڑائی جھگڑے میں ایک دوسرے کو گالی گلوچ دینے سے منع فرمایا کیونکہ ایک آدمی جب دوسرے آدمی کو گالی دے گا تو لازمی طور پر دوسرا شخص جواباً اس کو بھی گالی دیگا تو اس طرح وہ والدین کی توہین اور بے ادبی کے مرتکب ہوں گے: عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الکبائر شتم الرجل والدیہ قالوا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل یشتم الرجل والدیہ قال نعم یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امہ [۴] ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا سب سے بڑا گناہ یہ ہے۔ کوئی اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیا آپ اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے آپ نے فرمایا ہاں کہ کوئی کسی کے باپ کو گالی دے اور وہ اس کے باپ کو گالی دے اور وہ اس کی

---

۱ لقمٰن ۳۱: ۱۴ ۲ صحیح بخاری کتاب الفرائض

۳ بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳ ۴ مشکوٰۃ المصابیح باب البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸

ماں کو گالی دے تو یہ اُس کی ماں کو گالی دے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک دفعہ دو آدمیوں کو دیکھا ایک سے پوچھا یہ دوسرے تمہارے کون ہیں اس نے کہا یہ میرے والد ہیں آپ نے فرمایا دیکھو نہ ان کا نام لینا نہ کبھی ان سے آگے چلنا اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ نے ابنِ عباسؓ سے پوچھا کیا آپ چاہتے ہیں کہ جہنم سے دور رہیں اور جنت میں داخل ہوں۔ ابنِ عباس نے کہا کیوں نہیں، خدا کی قسم یہی چاہتا ہوں۔ حضرت ابنِ عمرؓ نے پوچھا آپ کے والدین زندہ ہیں۔ ابن عباس نے کہا ہاں میری والدہ زندہ ہیں۔ ابنِ عمرؓ نے فرمایا اگر آپ ان کے ساتھ نرمی سے بات چیت کریں اور ان کے کھانے پینے کا خیال رکھیں تو آپ ضرور جنت میں جائیں گے۔ بشرطیکہ کبیرہ گناہ سے بچتے رہیں۔

عاجزی اور انکساری سے پیش آنا

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ[1] اور ان دونوں کے آگے رحم کے ساتھ عاجزی کے بازو جھکا دو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اطاعت

اولاد پر خلاف شرع بات کے علاوہ ہر امر میں والدین کی فرمانبرداری فرض ہے۔

ارشاد ہے: وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔[2] اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اور اگر وہ تجھ پہ زور دیں کہ تو میرے ساتھ دوسروں کو شریک کرے جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ پس میں تمہیں بتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔

رسول کریم صلعم نے والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہ قرار دیتے ہوئے فرمایا: کل الذنوب یغفر اللہ منہ ما شاء الا عقوق الوالدین فانہ یعجل لصاحبہ فی الحیاۃ قبل الممات[3] اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے سوائے

---

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۲۴ [2] عنکبوت ۲۹: ۸

[3] مشکوٰۃ المصابیح ۴۱۸

والدین کی نافرمانی سکہ وہ اس کے مرتکب کو مرنے سے پہلے اس دنیا میں ہی سزا دے دیتا ہے۔" میں تم کو سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! فرمایا خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اُٹھ بیٹھے اور فرمایا ہاں جھوٹی بات اور جھوٹی شہادت اور اس کو بار بار دُہراتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے خیال ہوا کہ آپ سکوت نہ فرمائیں گے۔[۱]

حضرت ابو درداء انصاری کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو نو چیزوں کی وصیت کی تھی۔ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا۔ خواہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاؤ، جلا دیے جاؤ فرض نمازیں نہ چھوڑنا۔ جو عمداً نماز چھوڑے گا اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ شراب نہ پینا کہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔ والدین کی اطاعت کرنا حتیٰ کہ اگر وہ دُنیا چھوڑ دینے کو کہیں تو اُن کے لیے دُنیا چھوڑ دینا۔[۲]

ایک شخص نے رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں ہجرت کی بیعت کرنا چاہتا ہوں اور ماں باپ کو روتا چھوڑ کر آیا ہوں فرمایا واپس جاؤ جس طرح اُن کو رُلایا ہے اُسی طرح ہنساؤ۔[۳]

قرآن مجید میں والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔[۴] جب وہ اس کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا اس نے نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں تو دیکھ تیری تیری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا اے میرے باپ جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر تو مجھے اگر اللہ چاہے صبر کرنے والوں میں سے پائیگا۔

یہ کامل فرمانبردار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رویاء دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ باپ نے اپنے بیٹے کو رویا سنائی تو بغیر کسی ہچکچاہٹ اور حیلہ بازی کے بیٹے نے اپنی گردن ذبح ہونے کے لیے زمین پر رکھ دی۔

---

[۱] بخاری کتاب الادب عقوق الوالدین من الکبائر [۲] ادب المفرد باب برّ والدیہ مالم یکن معصیہ [۳] ایضاً [۴] الصافات ۳۷: ۱۰۲

صحابہؓ کا نمونہ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میرے عقد نکاح میں ایک عورت تھی جسے میں بہت پسند کرتا تھا اور میرے والد حضرت عمرؓ اس سے ناخوش تھے انہوں نے مجھے اُس کو طلاق دینے کے لیے کہا میں نے انکار کر دیا اس پر حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کر دیا تو رسول کریم صلعم نے فرمایا۔ اسے طلاق دے دو[1]

والدین کے اقارب اور دوستوں سے حُسنِ سلوک اسلام والدین کے اقرباء اور ان کے دوستوں سے نیک سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے اب اس سے توبہ کا کوئی رستہ ہے۔ آپ نے پوچھا تمہاری ماں زندہ ہے۔ انہوں نے کہا نہیں پوچھا خالہ زندہ ہے اُس نے کہا کہ اس کے ساتھ نیکی کرو[2]

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلعم سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ سب سے بڑی نیکی اولاد کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ حُسنِ سلوک ہے[3]

آئینی حقوق

نفقہ والدین پر خرچ کرنا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا والدین کا پرورش کرنے کا حق ادا کرنا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ[4] تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہو جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ کے لیے ہے۔

حدیث میں آتا ہے: عن عمرو بن العاص انہ اتاہ رجل فقال یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لی مالا و والدی وان ابی یحتاج الی مالی فقال انت ومالک لابیک۔[5] حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے۔ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے اور صاحب اولاد بھی ہوں اور میرا

---

[1] ترمذی، ابو داؤد
[2] ترمذی کتاب البر والصلۃ
[3] مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب فضل صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوہما
[4] البقرہ ۲ : ۲۱۵
[5] مشکوٰۃ المصابیح البر والصلۃ صفحہ ۴۱۸

باپ میرے مال کی حاجت رکھتا ہے آپ نے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے باپ کی متاع ہے۔

حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے۔ انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرے پاس مال ہے اور میرا والد بھی ہے جسے میرے مال کی حاجت ہے فرمایا تو اور تیرا مال تیرے والد کی متاع ہے۔ اسلئے کہ تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے تم اپنی اولاد کی کمائی میں کھاؤ[1]

والدین کا نفقہ اولاد کے ذمہ ہے اگر اولاد اس بارے میں کوتاہی کرے تو والدین عدالت کے ذریعہ خرچہ لے سکتے ہیں حضرت عمرؓ کے عہد کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کے مال سے قرض کیا تو اس نے حضرت عمرؓ کے پاس مقدمہ دائر کیا حضرت عمرؓ نے فیصلہ دیا انت و مالك لابیك تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

میراث قرآن مجید میں آتا ہے: وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اور اس کے ماں باپ کے لیے دونوں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو چھوڑا ہے۔

بیوہ کی حرمت خاوند کے مرجانے کے بعد بیوہ روئے زمین پر سب سے زیادہ رحم اور حسن سلوک کی مستحق ہوتی ہے مختلف زمانوں میں بیواؤں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ اسے انسانی حقوق سے محروم رکھا جاتا۔ اسے منحوس سمجھ کر عضو معطل کی طرح سوسائٹی سے باہر پھینک دیا جاتا۔ نہ انہیں کسی دعوت میں مدعو کیا جاتا نہ کسی خوشی کی تقریب پر بلایا جاتا۔ ہندوؤں میں تو اسے شوہر کی لاش کیساتھ ہی جل مرنے کے لیے مجبور کیا جاتا۔ بعض مذاہب میں دوسری شادی کرنے کی اجازت حاصل نہ تھی۔

اسلام نے بیواؤں کو سوسائٹی میں ایک عزت کے مقام پر کھڑا کیا ہے اور ان کے حقوق کی نگہداشت کی تعلیم دی ہے۔

نکاح کی اجازت قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ[2] اور تم میں سے جو عورتیں بیوہ ہیں ان کے نکاح کرو۔

میراث نہ سمجھو: عرب میں کسی آدمی کے مرجانے کے بعد اس کی بیویاں اولاد میں ورثہ

---

[1] مشکوۃ المصابیح باب النفقات وحق المملوک ج ۳ صفحہ ۵۰ [2] النور ۲۴: ۳۲

کے طور پر تقسیم ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس رسم کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ بیواؤں کو اپنی میراث نہ سمجھو ارشادِ الٰہی ہے: یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡھًا[۱] اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم زبردستی (بیوہ) عورتوں کو اپنی میراث بنالو۔

مال ہتھیانے سے احتراز وَلَا تَعۡضُلُوۡھُنَّ لِتَذۡھَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡھُنَّ[۲] اور تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ تم انہیں تنگ کرکے ان کا وہ مال لے لو جو تم انہیں دے چکے ہو۔

خبر گیری کرنا حضرت صفوان بن سلیم سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیوہ اور مسکین کی خبر گیری کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا دن کو روزہ رکھنے والے اور رات کو نماز کے لیے کھڑا رہنے والے کی مانند ہے[۳]

اخلاقی حقوق

قُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا[۴]

دُعا میرے رب تو ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے ہوتے پالا۔ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ[۵] اے میرے رب مجھے بخش دینا میرے باپ کو اور مومنوں کو بھی جس دن حساب قائم ہوگا۔ ایک مرتبہ بنی سلمہ کے ایک شخص نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کوئی ایسی نیکی ہے جو ماں باپ کی موت کے بعد ان کے ساتھ کرسکوں فرمایا ان کے لیے دُعا کرو ان کی مغفرت چاہو ان کے بعد ان کے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرو ان کے اعزہ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ ان کے دوستوں کا احترام کرو۔[۶]

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ کسی بندے کے والدین یا ان میں سے ایک مر جاتا ہے اور وہ ان کا فرمانبردار ہوتا ہے۔ پھر وہ ان کے

۱۔ النساء ۴: ۱۹ ۲۔ النساء ۴: ۱۹
۳۔ صحیح ترمذی ابواب البر والاحسان ۴۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۲۴
۵۔ ابراہیم ۱۴: ۴۱ ۶۔ ابوداؤد کتاب الادب فی برِّ الوالدین

لیے دُعا اور استغفار کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سعادت مندوں میں سے لکھتا ہے[1]

محبت اسلام والدین کے ساتھ احسان انکساری اور ادب کے ساتھ پیش آنے کی ہی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ والدین کے بلند ترین مقام کے پیش نظر اس بات کی بھی تلقین کرتا ہے کہ ان کے ساتھ ظاہراً اچھا سلوک کرنے کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں ان کے لیے محبت رکھے۔ حدیث میں ہے: عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما من ولد بار ینظر الی والدیہ نظرۃ رحمۃ الا کتب اللہ لہ بکل نظرۃ حجۃ مبرورۃ قالوا وان نظر کل یوم مائۃ مرۃ قال نعم واللہ اکبر واطیب[2] حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو نیک لڑکا اپنے والدین کو محبت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہر نگاہ کے عوض ایک حج مقبول کا ثواب لکھتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اگرچہ دن میں سو مرتبہ دیکھے فرمایا ہاں خدا بزرگ تر اور پاک تر ہے۔

حقوق اولاد

حقوق والدین تو ہر مذہب نے تسلیم کیے ہیں اور ان کی ادائیگی پر زور دیا ہے۔ لیکن یہ کسی مذہب نے تعلیم نہیں دی کہ والدین پر اولاد کے کیا حقوق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قوموں میں اولاد کو قتل کر دینا کوئی جرم خیال نہیں کیا جاتا تھا روما کے قانون میں باپ کو اولاد کو مار ڈالنے کا پورا اختیار تھا[3] عرب میں اولاد کشی کی رسم رائج تھی۔ راجپوتوں میں دختر کشی کی عام رسم تھی۔ اسلام نے جہاں والدین کے حقوق متعین کیے ہیں اور ان کی ادائیگی معاشرہ کے ضروری ہے اسی طرح اولاد کے حقوق مقرر کر دیئے ہیں۔

اسلام میں اولاد کا مقام اسلام اولاد کو آنکھ کی ٹھنڈک قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت

---

۱ بیہقی ۲ مسلم ۳ لیکی کی تاریخ یورپ ج اول ص ۲۷ ۴ مریم ۱۹: ۲۶

دیا تھا۔

اولاد کی آرزو قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا[1] کہا میرے رب میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور سر بالوں کی سفیدی سے شعلے مار رہا ہے اور میرے رب تجھ سے دعا کر کے محروم نہیں رہا۔ اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں اور میری عورت بانجھ ہے سو اپنے پاس سے مجھے کوئی وارث عطا فرما۔ جو میرا ورثہ اور آلِ یعقوب کا ورثہ لے اور اے میرے رب اسے پسندیدہ بنا۔

معاشرتی حقوق

پرورش کرنا اولاد کی پیدائش کے بعد سب سے اہم فریضہ والدین پر ان کی پرورش کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچہ کی ابتدائی پرورش کے لیے ماں کی چھاتیوں میں دودھ کا انتظام کر دیا ہے۔ تاکہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس قدرتی غذا سے پرورش پائے۔

اللہ تعالیٰ نے دودھ پر پرورش پانے کی مدت دو سال مقرر کی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:-

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔[2] اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ اس کے لیے جو دودھ پلانے کے زمانہ کو پورا کرانا چاہتا ہے اور جس کا بچہ ہے اس پر اچھے طور پر ان کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔

عن انس رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو ھکذا وضم اصابعہ[3] حضرت انس رضی سے روایت ہے۔ کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میرا تعلق اس کے ساتھ (انگلیاں ملا کر فرمایا) اس طرح ہو گا۔

---

[1] مریم ۱۹ : ۴-۶ [2] بقرہ ۲ : ۲۳۳ [3] مشکوٰۃ المصابیح باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق صفحہ ۴۲۱

عن عائشۃ قالت جاءتنی امراۃ معھا ابنتان تسئلنی فلم نجد عندی غیر تمرۃ واحدۃ فاعطیتھا ایاھا فقسمتھا بین ابنتیھا ولم تاکل منھا شیئا ثم قامت فخرجت فدخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فحدثتہ فقال من ابتلی من ھذہ البنات بشیءٍ فاحسن الیھن کن لہ سترا من النار[1] حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا ایک عورت میرے پاس کچھ مانگنے آئی اور اس کے ہمراہ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ اس نے میرے پاس سوائے ایک کھجور کے کچھ نہ پایا میں نے وہی کھجور اسے دے دی۔ پھر اس نے اسے اپنی بیٹیوں میں تقسیم کر دیا اور اس نے خود کچھ نہ کھایا۔ پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے بعد نبی کریم صلعم گھر تشریف لائے اور میں نے آپ کو بتایا تو آپ نے فرمایا جو ان بیٹیوں کی پرورش کی آزمائش میں ڈالا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے آڑ ہوں گی۔

ابوداؤد میں ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کی پرورش اور شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا وہ جنت میں داخل ہوگا[2]

حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے افضل دینار وہ ہے جس کو آدمی اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے اور جس کو جہاد کی سواری پر صرف کرے اور جس کو اللہ کی راہ میں اپنے ساتھیوں پر صرف کرے۔ اس روایت کے ایک راوی ابو قلابہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ پہلے آپ نے اہل وعیال کا ذکر کیا۔ اور فرمایا کہ اس شخص سے بڑا اجر کس کو ہو سکتا ہے جو اپنے صغیر السن بچوں پر صرف کرتا ہے اور اس کے ذریعہ ان کو دوسروں کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہے (ترمذی باب ما جاء فی النفقۃ علی الاھل)

روحانی پرورش (تعلیم وتربیت اور ادب سکھانا)

جسمانی پرورش کے بعد والدین پر سب سے اہم فریضہ اولاد کی روحانی پرورش ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔ ص ۴۲۱

[2] ابوداؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ؎ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اس کے اوپر فرشتے مقرر ہیں سخت اور طاقتور اللہ جو حکم انہیں دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ حکم ملتا ہے وہی کرتے ہیں۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: ما نحل والد ولدہ من نحل افضل من ادب حسن (ترمذی الواب البر والاحسان) کسی باپ نے اپنے بیٹے حسن ادب سے اچھا عطیہ نہیں دیا۔ دوسری روایت ہے آدمی کو اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع خیرات کرنے سے بہتر ہے۔

روحانی پرورش کے طریقے

اسلام نے اولاد کی روحانی پرورش کے تین طریقے بیان کیے ہیں۔

۱۔ تعلیم | قرآن مجید میں آتا ہے:۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ؎ کہہ کیا علم والے اور جاہل برابر ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے: يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ؎ اللہ ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے۔ جو تم میں سے ایمان لاتا ہے اور وہ جنہیں علم دیا گیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ؎ یقیناً خدا سے علم رکھنے والے بندے ہی ہی ڈرتے ہیں۔ یقیناً اللہ غالب بخشنے والا ہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں:۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے۔

آیات اور حدیث اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ علم روحانی راستوں کو آسان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا وسیلہ ہے۔ اس وجہ سے بچے کی روحانی پرورش کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو علم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔

؎ التحریم ۶۶: ۶۔ ؎ الزمر: ۹۔ ؎ المجادلہ ۵۸: ۱۱ ؎ فاطر ۳۵: ۲۸

حضرت امام غزالی کیمیائے سعادت میں لکھتے ہیں کہ قیامت کے دن آدمی کے ساتھ سب سے پہلے جھگڑنے والے اس کے اہل وعیال ہوں گے وہ کہیں گے کہ اے اللہ! تو اس سے ہماری داد لے ہم ناواقف تھے اس نے ہمیں حرام کھلایا اور جو تعلیم و تربیت اس کے ذمہ تھی وہ اس نے ہمیں نہ دی اور ہم جاہل رہ گئے۔

ب۔ دُعا | وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ [1]
میرے لیے میری اولاد کی اصلاح کر میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

ج۔ عبادت کی تلقین | نماز کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ [2] یعنی نماز ہر قسم کی بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں:۔ لوگو! جب تمہارے بچے سات برس کے ہوں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو۔ اگر وہ نماز نہ پڑھیں تو انہیں مارو [3]

حضرت شاہ ولی اللہ بچوں کو ادب سکھانے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ میں کہتے ہیں۔

"چونکہ بچوں کی زندگی میں استقلال نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے والدین کی نگرانی میں زندگی بسر کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ماں باپ کے دلوں میں بے پناہ شفقت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا تاکہ وہ تربیت اولاد کا کام بالطبع انجام دیں اور ہر طرح ان کے نگران حال رہیں وہ ان کی تربیت ایسے طریقے پر کریں جس سے ان کے آئندہ زندگی سنبھل جائے اور وہ ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے جائز اور باعزت طریقے پر کمانا جان سکیں زیور علم سے آراستہ ہوں والدین اپنی اولاد کے بزرگ و محترم ہوتے ہیں اور محسن بھی اور ان کی ظاہری اور معنوی تربیت میں انہوں نے وہ تکالیف برداشت کی ہیں جن کا اندازہ لگانا یقیناً مشکل ہے۔"

عقیقہ کرنا | عن سلمان بن عامر الضبی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول مع الغلام عقیقۃ فاھریقوا

---

[1] الاحقاف ۴۶ : ۱۵ [2] عنکبوت ۲۹ : ۴۵ [3] ابوداؤد

عنہ دماً وامیطوا عنہ الاذی [1]

حضرت سلمان بن عامر ضبی سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ لڑکے کی ولادت کے ساتھ عقیقہ ہے اس کی طرف سے خون بہاؤ اور بالوں وغیرہ کی گندگی اس سے دُور کرو۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وُلِدَ لہ ولد فاَحبّ ان ینسک عنہ فلینسک عن الغلام شاتین وعن الجاریۃ شاۃ [2] حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو۔ تو میں اس بات کو پسند کرتا ہوں اس کی طرف سے قربانی کی جائے لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرا۔

عدل و مساوات اولاد کے درمیان عدل و مساوات قائم رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ بعض اوقات عدل و انصاف کو قائم نہ رکھنا بچوں کے درمیان دشمنی اور والدین کے ساتھ نفرت اور بغض کا سبب بن جاتا ہے جس سے گھر کا امن تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عائلی زندگی کی فضا کو خوشگوار رکھنے کے لیے والدین کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اولاد کے درمیان عدل و مساوات قائم رکھیں حدیث میں ہے نعمان بن بشیر رضؓ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے اپنے ایک لڑکے کو ایک غلام عطیہ میں دیا اور رسول کریم صلعم کو گواہ بننے کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا جیسا تم نے اپنے اس لڑکے کو ایک غلام دیا ہے کیا ویسا ہی اپنے باقی سب لڑکوں کو بھی دیا ہے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو اس کو واپس لے لو [3]

نکاح والدین پہ فرض ہے۔ جب بچہ جوان ہو جائے تو اس کے نکاح کا انتظام کریں۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں:۔ من ولد لہ فلیحسن اسمہ و ادبہ واذا بلغ فلیتزوجہ فان بلغ ولم یزوجہ فاصاب اثما فانما اثمہ علی ابیہ۔ جس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ اسے اس کا اچھا نام چاہیئے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اُس کی شادی کرنی چاہیئے اگر وہ بالغ ہوا اور اس

[1] بخاری۔ [2] ابوداؤد۔ [3] ترمذی ابواب الاحکام

شادی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر پر ہی ہے۔

عن عمر بن الخطاب وانس بن مالك عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فی التوراة مکتوب من بلغت ابنة اثنتی عشرة سنة ولم تزوجها فاصابت اثما فاثم ذلك علیه۔

حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا:۔ تورات میں لکھا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ برس کی ہوئی اور اس نے اس کی شادی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر پر ہی ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کی پرورش اور شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا وہ جنت میں داخل ہوگا[1]۔

نکاح کرتے وقت لڑکیوں سے اجازت لینا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ لا تنکح الایم حتی تستأمر ولا تنکح البکر حتی تستأذن[2] بیوہ کی شادی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کا حکم نہ لے لیا جائے اور کنواری عورت کا نکاح بھی اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔

ایک اور حدیث ہے:۔ الایم احق بنفسها من ولیها والبکر تستأذن فی نفسها واذنها صماتها۔[3]

بیوہ خود اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حق دار ہے۔ اور کنواری کے نکاح کے وقت اس سے اجازت لی جائے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔

آئینی حقوق

نسل کی حفاظت: اولاد کا حق استقرار حمل سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

[2] بخاری باب لا ینکح الاب وغیرہ البکر الثیب الا برضاہا۔

[3] مسلم باب استیذان الثیب بالمنطق والبکر بالسکوت۔

بغیر طبی ضرورت کے اسقاط حمل گناہ ہے۔ اور قتل اولاد کے زمرہ میں آتا ہے۔ بعض لوگ اپنی غربت کے پیش نظر یہ فعل کر گزرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کہتا ہے:-

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ [1] اور اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی یقیناً نسل کشی بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ [2]

کہو آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے تم پر، یہ حکم ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہو قتل نہ کرو۔ سوائے اس کے کہ انصاف چاہتا ہو۔ اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

حدیث میں آتا ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:-

قال قال رجل یارسول اللہ ای الذنب اکبر عند اللہ قال ان تدعوا اللہ ندًا وھو خلقک قال ثم ای قال ان تقتل ولدک خشیۃ ان یطعم معک ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا:- کسی کو خدا کا شریک ٹھہراؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے پوچھا پھر کون سا گناہ ہے فرمایا:- اولاد کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔

---

[1] بنی اسرائیل: ۳۱ [2] الانعام ۶: ۱۵۲

لڑکیوں کے قتل کی ممانعت

عرب میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی ظالمانہ رسم چلی آ رہی تھی۔ بعض قبیلے لڑکی کی پیدائش باعث ذلت اور عار سمجھتے تھے۔ اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی تو وہ مارے شرم کے باہر نہیں نکلتا تھا۔ وہ یوں سمجھتا تھا کہ کوئی بلائے ناگہانی آ گئی ہے۔ اس ذلت اور عار سے بچنے کے لیے وہ لڑکی زندہ درگور کر دیتا تھا۔ اس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے:۔ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ [1] اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس خبر کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی جاتی ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ کیا اسے ذلت کے لیے رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے سو وہ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔

سنن دارمی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم لوگ جاہلیت کے زمانے میں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اولاد کو مار ڈالتے تھے۔ میرے ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس چلی آتی۔ ایک دن میں اس کو بلایا وہ خوش خوش میرے پاس چلی آئی۔ اور میرے پیچھے ہو لی۔ میں ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں گرا دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکارنے لگی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

یہ واقعہ سن کر رسول کریم صلعم کے آنسو رواں ہو گئے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس شخص کو ملامت کی کہ تم نے رسول کریم صلعم کو غمگین کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اور اس پر جو مصیبت پڑی ہے اس کا علاج پوچھنے آیا ہے اور اس سے دوبارہ اس قصہ کو سنا اور آپ اس قدر روئے کہ آنسو بہ کر ریش مبارک تک آ گئے۔ پھر فرمایا:۔ جاؤ جاہلیت کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے۔ اب از سر نو عمل شروع کرو۔[2] مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا حرام کر دیا ہے اور حق کا ترک کرنا ناحق چیزوں کا لینا منع کر دیا ہے اور تمہارے لیے قیل و قال

---

[1] نحل ۱۶: ۵۸۔ [2] سنن دارمی

اور کثرت سوال اور اضاعت مال کو ناپسند کیا ہے[1]۔

حق میراث اسلام نے باپ کی جائیداد میں اولاد کو شریک ٹھہرایا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:
یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِی اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ[2]
اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے مرد کے لیے دو عورتوں کے حصّے کے برابر ہو۔

تمام جائیداد کو ہبہ کر دینے کی ممانعت: اسلام نے صرف اولاد کو ترکہ میں ہی حصے دار نہیں ٹھہرایا بلکہ والدین کے لیے یہ امر بھی ناجائز قرار دے دیا کہ وہ ساری جائیداد وفات سے قبل ہبہ کر دیں۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص صاحب ثروت صحابی تھے ان کے صرف ایک ہی لڑکی تھی وہ ایک مرتبہ اتنے شدید بیمار ہوئے کہ بچنے کی امید جاتی رہی رسول کریم صلعم ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس دولت ہے اور میری وارث صرف ایک لڑکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دو تہائی مال کی وصیت کر جاؤں آپ نے فرمایا نہیں۔ سعد نے عرض کیا اچھا نصف مال کی وصیت کر دوں۔ فرمایا نہیں۔ صرف ایک تہائی کی وصیت کر سکتے ہو ۔ اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ اپنے بعد اپنے ورثا کو خوشحال چھوڑ جانا اس امر سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج چھوڑ جاؤ اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں[3]۔

اخلاقی حقوق

اچھا نام رکھنا بچے کی ولادت کے بعد اس کا نام ایسا رکھا جائے جو اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب کی عکاسی کرتا ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے

احب الاسماء الی اللہ عبداللہ وعبدالرحمان[4]

اللہ کو زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برا اور کم بخت نام اس شخص کا ہوگا جو ملک الملوک کہلائے گا[5]

---

[1] بخاری۔ [2] النساء ۴: ۱۱، ۱۲ [3] مسلم باب الوصیۃ بالثلث۔
[4] مشکوٰۃ المصابیح باب الاسامی صفحہ ۴۰۷ [5] مشکوٰۃ المصابیح صفحہ ۴۰۷۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی اچھے نام رکھنے کی فلاسفی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعت کے اہم اور عظیم ترین مقاصد میں سے ایک یہ مقصد بھی ہے کہ تمام ارتفاقات ضروریہ اور تدابیر معاشیات و اقتصادیات میں ذکر الٰہی شامل کر دیا جائے اور اسے دو چند کر دیا جائے تاکہ یہ امور بھی دعوت اسلام کی زبان بن کر حق کی دعوت دیں اور نومولود بچے کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن سے موسوم کرنا در حقیقت اسے توحید سے آگاہ و باخبر کرنا اور توحید آشنا بنانا ہے نیز اہل عرب اور دیگر ممالک کے باشندے اپنی اولاد کا نام ان لوگوں کے نام سے رکھتے تھے جن کی وہ لوگ عبادت و پرستش کیا کرتے تھے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی مراسم توحید قائم کرنا تھا اس لیے لازم و ضروری ہے کہ نام رکھنے میں سنت و توحید اور طریق توحید کا اعتبار اور لحاظ رکھا جائے۔[1]

حسن سلوک سے پیش آنا

محبت اور سلوک بچے کے کردار اور ذہنی قوی کو جلا دیتا ہے اور اخلاق اور نفسیاتی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ اس وجہ سے رسول کریم صلعم نے بچوں سے حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ فرماتے ہیں:

من لم یرحم صغیرنا ولم یوقّر کبیرنا فلیس منا۔[2] جو چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور بڑے کی توقیر نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حدیث شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے واقعات محفوظ ہیں حضرت فاطمہ جب آپ کی خدمت میں آتیں تو ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اپنے پہلو میں بٹھاتے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے جب سفر میں جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ سے رخصت ہوتے اور جب واپس آتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہ سے ملتے۔[3]

رسول کریم صلعم کو اپنے نواسوں حضرت حسن حضرت حسینؓ اور اپنی نواسی حضرت امامہ سے جو پیار تھا۔ وہ مسلمانوں کے لیے اولاد سے پیار کرنے میں مشعل راہ ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اقرع بن حابس نے رسول کریم صلعم کو حضرت حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا اور ابن عمر کہتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت حسین کا بوسہ لیتے دیکھا اور اقرع بن حابس نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں میں نے ان میں سے کسی ایک کا بھی بوسہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۳۹۱ [2] مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔ صہ ۴۲۳

[3] یہ تمام واقعات فضائل فاطمہ میں ہیں۔

نہیں لیا۔ یہ سن کر آنحضرت صلعم نے فرمایا: جو شخص رحم نہیں کرتا۔ اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔[1]

آپ کی صاحبزادی حضرت زینب کی ایک صغیر السن بچی امامہ تھیں۔ رسول کریم صلعم کو اس سے اتنی محبت تھی کہ کبھی کبھی مسجد میں ساتھ لے آتے اور گود میں لیے ہوئے نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امامہ کو کندھے پر بٹھائے ہوئے مسجد میں تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی۔ جب رکوع میں جاتے تھے تو اتار دیتے تھے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے۔[2]

عفو اور درگزر کرنا

بچے کم علمی اور کم تجربہ اور کم عقل کی وجہ سے شرارتیں کرتے رہتے ہیں ان کو معاف کر دینا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں سو ان سے بچتے رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

بیٹی سے پیار اور محبت

عرب اور بعض دوسری قومیں بیٹی کی ولادت کو عار اور ننگ سمجھتی تھیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے بیٹی کے متعلق خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ ان سے محبت اور حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کی بیٹیوں سے نفرت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔
وَیَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَہٗ وَلَھُمْ مَّا یَشْتَھُوْنَ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ[4] اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ پاک ہے اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جب ان میں سے ایک کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے۔ اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوتا ہے۔

چہرہ کے سیاہ ہو جانے سے مراد غم اور نفرت کا پیدا ہونا ہے حدیث شریف میں آتا ہے

---

[1] ترمذی ابواب البر والاحسان۔ [2] بخاری باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقہ فی الصلوٰۃ
[3] التغابن ۶۴: ۱۴ [4] النحل ۱۶: ۵۷، ۵۸۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا:۔ کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا:
جس کے ہاں بیٹی پیدا ہو۔ پس وہ نہ تو اسے زندہ درگور کرے اور نہ ذلت کی حالت میں رکھے اور نہ بچوں کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا[۱]۔

معاشرہ کے بقیہ اجزائے ترکیبی اور ان کے حقوق و فرائض

رشتے داروں کے حقوق

معاشرے کے اور بھی عناصر ترکیبی ہیں۔ جن کے ملنے سے معاشرہ تشکیل ہوتا ہے۔ انسان اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسرے انسانوں خاص طور پر رشتہ داروں کا بہت ہی محتاج ہے۔ یہ احتیاج اس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ ایک دوسرے کے حقوق متعین کیے جائیں۔ پھر ہر ایک ان متعینہ حقوق و فرائض کی نگہداشت کرے۔

حقوق و فرائض کی نگہداشت اور حفاظت ہی معاشرہ کو بنیان مرصوص بناتی ہے۔ اگر ان حقوق کی حفاظت نہ کی جائے تو سوسائٹی انتشار اور ہلاکت کا شکار ہو جائے۔

قرآن مجید نے رشتہ داروں کو ذی القربیٰ اور ارحام کے الفاظ سے پکارا ہے۔ قرب کئی لحاظ سے ہوتا ہے۔ نسبت کے لحاظ سے قرب پھر نسبت یا تو والد کے لحاظ سے ہوگی یا ماں کے لحاظ سے پھر قرب مرتبہ کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے اور قرب مکان و زمان کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے۔ یہاں قرب سے مراد نسبت کے لحاظ سے ہے۔

ارحام رحم کی جمع ہے۔ یعنی عورت کا رحم اور استعارۃً قرابت پر بولا جاتا ہے کیونکہ قریبی ایک ہی رحم سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید اور حدیث میں رشتہ داروں کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ[۲] قریبی رشتے داروں کو ان کے حق ادا کرو فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ[۳] اور قرابت داروں کو ان کے حق ادا کرو۔

قُلْ لَّاۤ اَسْــٴَـلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى[۴]

کہہ میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر قریبیوں میں باہم محبت وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا[۵]

۱۔ ابوداؤد۔ ۲۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶ ۳۔ روم ۳۰: ۳۸ ۴۔ شوریٰ ۴۲: ۲۳ ۵۔ نساء ۴: ۱

اس خدا سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتے داروں کے حقوق کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے ۔

اس تاکیدی حکم کے ساتھ قطع رحم کرنے والوں کو فاسق کہا گیا ہے ۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ [1] اور سوائے فاسقوں کے کسی کو گمراہ نہیں ٹھہراتا (فاسق وہ ہیں) جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں ۔ اور اسے کاٹتے ہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ ملایا جائے ۔

وصل رحم اور قطع رحم کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے :۔ الرحم شجنة الرحمن فقال الله من وصلك وصلته ومن قطعك قطعته [2] رحم رحمن سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے اللہ نے فرمایا جو تجھ کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو تجھ کو کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا ۔

مسلم میں آتا ہے ۔ وہ قوم اللہ کی رحمت سے محروم رہتی ہے جس میں کوئی قاطع رحم ہوتا ہے اور اس کو دنیا ہی میں قطع رحم کی سزا مل جاتی ہے [3]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں فراخی پیدا ہو اس کو صلہ رحم کرنا چاہیئے ۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی عمر میں اضافہ ہو اس کو صلہ رحم کرنا چاہیئے ۔

ایک اعرابی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے ایسی چیز بتایئے جو مجھ کو جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کر دے ۔ فرمایا اللہ کی عبادت کرو کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ ۔ نماز پڑھو ، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحم کرو [4] ۔

حضرت جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا [5]

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے ۔ انہوں نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کوئی احسان جتانے والا قطع رحم کرنے والا اور شراب کشید کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا [6]

---

[1] بقرہ ۲ : ۲۷ [2] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ [3] ادب المفرد ۔
[4] ادب المفرد باب صلہ رحم [5] بخاری باب اثم القاطع [6] نسائی ۔ دارمی ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمثیلی پیرائے میں صلہ رحم کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: کہ جب اللہ تعالیٰ مخلوقات کی پیدائش سے فارغ ہو چکا تو رحم نے اللہ تعالیٰ کا دامن تھام لیا اور کہا یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ (صلہ رحم کو) کاٹنے سے بچے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ بے شک کیا تجھ کو یہ بات پسند نہیں کہ جو تجھ کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا۔ اور جو تجھے کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا۔ رحم نے عرض کیا ہاں! اے پروردگار عالم فرمایا تو یہ تجھ کو دیا گیا یہ بڑا حق ہے۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگ چاہو تو آیت پڑھو۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ[۱] (محمد ۴۷: ۲۲) (پس اگر تم حاکم بن جاؤ تو قریب ہے کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور اپنے رحموں کو قطع کرو)۔

معاشرتی حقوق

احسان | اسلام رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ[۲] ماں باپ اور رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ[۳] اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ[۴] اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں کے ساتھ۔

حدیث شریف میں ہے۔ ابوہریرہ سے روایت ہے:۔ انہوں نے کہا میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص اس بات سے خوش ہو کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور عمر بڑھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے رشتے داروں سے حسن سلوک کرے۔[۵]

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ [۲] بقرہ ۲: ۸۳
[۳] نحل ۱۶: ۹۰ [۴] النساء ۴: ۳۶۔ [۵] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم

مالی امداد رشتے داروں کی مالی امداد اور دست گیری کرنا بڑی نیکی کا کام ہے۔ جس کو قرآن اور حدیث میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے
وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی[1] (حقیقی نیکی یہ ہے) کہ مال کی محبت کے باوجود رشتے داروں کو دے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی۔[2]
بے شک اللہ انصاف، حسن سلوک اور رشتے داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

قرابت داروں کو مالی امداد اور دست گیری کرنے کی اہمیت اس تاریخی واقعہ سے ہوتی ہے کہ واقعہ افک میں حضرت ابوبکرؓ کے ایک عزیز مسطح بھی شامل تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کی دست گیری کرنا بند کر دی اس پر یہ حکم نازل ہوا۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ[3] اور تم میں جو لوگ بڑائی اور وسعت مال رکھتے ہیں۔ وہ رشتے داروں اور محتاجوں کو دینے کی قسم نہ کھالیں۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ[4] کہہ جو تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ رشتہ داروں یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ حضرت حکیم بن حزام رسول کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ صدقہ کا آغاز اس شخص سے کرو جو تمہارے عیال میں ہو اور اچھا صدقہ وہ ہے۔ جو فاضل مال سے دیا جائے اور جو شخص سوال سے بچے گا۔ اللہ اسے بچائے گا اور جو شخص مستغنی رہے گا اللہ اسے غنی کر دے گا۔[5]

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں۔ ابو طلحہ انصار مدینہ میں کھجور کے باغات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے لیکن ان کو اموال میں سے ایک میٹھا کنواں بہت پسند تھا جو مسجد نبوی کے سامنے تھا۔ رسول کریم صلعم اس کے پاس سے ہو کر گزرتے تو اس کا پانی پیتے جو خوشگوار اور میٹھا ہوتا جب یہ آیت نازل ہوئی۔ لن تنالو البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکو گے جب تک تم اپنی عزیز ترین چیزیں خرچ نہ کرو گے) ابو طلحہ نے کہا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ تم اپنی پسندیدہ اشیاء

---

[1] البقرہ ۲: ۱۷۷ [2] نحل ۱۶: ۹۰ [3] نور ۲۴: ۲۲ [4] البقرہ ۲: ۲۱۵
[5] صحیح بخاری کتاب البر۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور یہ کنواں مجھے بہت ہی محبوب اور عزیز ہے۔ اس لیے اس کو میں بطور صدقہ کے دیتا ہوں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی اور ذخیرہ آخرت کا سامان ٹھہرائے گا آپ اس صدقہ کو اللہ کی مرضی کے مطابق جہاں چاہیں خرچ کریں۔ آپ نے فرمایا آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے۔ میں نے تمہاری بات سن لی ہے۔ میری رائے میں یہ بہتر ہے کہ اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دو ابو طلحہ نے کہا کہ یا رسول اللہ میں ایسا ہی کروں گا چنانچہ انہوں نے اپنے رشتے داروں اور بنی عم میں اسے تقسیم کر دیا [۱]۔

قرآن مجید میں میراث سے محروم رشتہ داروں کے متعلق یہ حکم ہے۔ اگر وہ میراث کی تقسیم کے وقت حاضر ہوں تو فیاضی سے کام لے کر کمزور رشتے داروں کی مالی اعانت کرنا چاہیئے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا [۲] اور جب میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان سے اچھی بات کہو۔

اس آیت کریمہ میں میت کے وارثوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اگر میراث کی تقسیم کے وقت نادار اور غریب رشتہ دار حاضر ہوں تو ان کی مالی اعانت کر دینی چاہیئے تاکہ باہم محبت اور الفت بڑھے۔ ان کی غربت اور افلاس دور ہو۔

میراث وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ [۳] اور جو بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم میں سے ہی ہیں اور رشتہ کے تعلقات والے اللہ کے حکم میں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تو رسول کریم صلعم نے اسلامی معاشرہ کو مستحکم کرنے اور بنیان مرصوص بنانے کے لیے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کے درمیان اخوت قائم کر دی۔

انصار نے یہاں تک قربانی کر دی کہ گھر بار مال و اسباب نصف نصف مہاجرین

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ [۲] النساء ۴: ۸ [۳] الانفال ۸: ۷۵

کو دینے کے لیے تیار ہو گئے - وفات کے بعد حصہ میراث بھی تو اسلام نے اس امر سے روک دیا اور یہ تعلیم دی کہ میراث میں حقیقی وارث رشتہ دار ہی ہیں -

آج مسلمان گھروں میں رشتہ داروں کو میراث سے محروم رکھنے کے لیے قسم قسم کے حیلے اختیار کیے جاتے ہیں - جس سے ایک طرف تو دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے دوسری طرف منافرت تباغض اور عداوت بڑھ جاتی ہے -

خاندانوں میں قتل کی بے شمار واردات اسی وجہ سے ہو رہی ہیں کہ مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کے شرعی حق کو غصب کیا جا رہا ہے -

حدیث شریف میں ہے - حضرت ابو موسیٰ رضؓ سے کسی نے بیٹی، پوتی اور بہن کے حصّوں کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے کہا - آدھا بیٹی کے لیے اور آدھا بہن کے واسطے اور تم ابن مسعود سے دریافت کرو یقیناً ہے وہ بھی میری طرح جواب دیں گے - اس شخص نے ابن مسعود رضؓ سے جا کر پوچھا اور حضرت ابو موسیٰ کا جواب بھی بتا دیا - انہوں نے کہا اگر میں یہ جواب دوں تو میں اس میں وہی حکم لگاؤں گا جو رسول کریم صلعم نے لگایا ہے - بیٹی کے واسطے نصف نواسہ کے واسطے چھٹا - یہ دو تہائی ہو گئیں اور باقی ایک تہائی بہن کے واسطے - پھر ابو موسیٰ رضؓ سے ابن مسعود رضؓ کا یہ فتویٰ بیان کیا گیا تو انہوں نے کہا جب تک فقیہہ ابن مسعود تم میں زندہ ہے - مجھ سے کبھی کبھی نہ پوچھنا [1]

حضرت ابن عباس رضؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:- میراث اہل تک پہنچا دو اور جو باقی ہے وہ زیادہ قریبی مرد کے واسطے ہے - [2]

اخلاقی حقوق

اصلاح معاشرہ کی اساس لوگوں کے کردار اور اخلاق کی درستی پر ہے - جس سوسائٹی کے لوگ اخلاق فاضلہ اور کردار عالیہ کے زیور سے مزین ہوں گے - اس سوسائٹی کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو گی - اسی وجہ سے رشتہ داروں کے باہمی حقوق و فرائض میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر ایک رشتہ دار ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفرائض - [2] صحیح بخاری کتاب الفرائض

احکام کی پابندی کرنے کی تعلیم و تبلیغ کا فریضہ انجام دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رسالت کی گراں ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے کر میدانِ عمل میں اترے تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو یہ حکم دیا کہ وہ پیغامِ رسالت کو اپنے رشتہ داروں تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ نے دعوت پر مدعو کرکے اور علانیہ بھی اپنے رشتہ داروں کو پیغامِ رسالت پہنچایا اور ان کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کے لیے بلایا۔ ارشادِ الٰہی ہے:۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ [۱] اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا اور اپنے بازو کو اس کے لیے جھکا جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔

بخاری میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکارا! اے بنی فہر! اے بنی عدی! اور قریش کے مختلف بطنوں کو پکارتے رہے جب تمام جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس وادی میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو میری بات مان لو گے؟ انہوں نے کہا ہاں! کیونکہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ فرمایا تو میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔

محبت و مودت

رشتے داروں سے محبت کرنے کا اتنا اہم فریضہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغِ اسلام کی راہ میں جو مصائب جھیلنے پڑے ان کے صلہ میں آپ نے اپنی امت سے صرف رشتے داروں سے محبت سے پیش آنے کی خواہش کی۔ ارشادِ الٰہی ہے:۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى [۲] کہہ تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا مگر قریبیوں میں باہم محبت چاہتا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ اہلِ جنت تین قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل منصف بادشاہ لوگوں کے ساتھ احسان کرنے والا اور بھلائی کی توفیق دیا گیا۔ دوسرا مہربان شفیق اور نرم دل آدمی جو قریبی رشتے داروں اور نیز ہر مسلمان کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ تیسرا عیالدار پارسا جو حرام کاری سے باز رہتا ہے اور محتاجی کے اظہار سے شرم کرتا ہے [۳]

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

[۱] الشعراء ۲۶: ۲۱۴، ۲۱۵ [۲] شوریٰ ۴۲: ۲۳ [۳] مسلم

جو شخص رشتہ داروں کے ساتھ اس لیے سلوک کرتا ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ ایسی رنگ میں پیش آئیں تو یہ اعلیٰ درجہ کی صلہ رحمی نہیں ۔ کمال درجہ کی صلہ رحمی یہ ہے جب دوسرے رشتہ دار اس سے بدسلوکی سے پیش آئیں تو یہ اس وقت ان سے تعلق جوڑے اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرے ۔

یتیموں کے حقوق

یتیم معاشرہ کا وہ محتاج اور بے بس فرد ہوتا ہے جس کا باپ کم سنی میں ہی فوت ہو جاتا ہے ۔ وہ یتیم فرد سوسائٹی کی مدد اور خدمت کا بہت محتاج ہوتا ہے ۔ اسلام نے یتامیٰ کے حقوق متعین کر کے ان کی نگہداشت اور حفاظت کی بہت تاکید کی ہے ۔ عربوں میں ہر وقت قتل و غارت کا بازار گرم رہتا تھا ۔ اس وجہ سے یتیموں کی کثرت تھی ۔ ان کو باپ کی وراثت سے محروم رکھا جاتا اور نہ ان کی پرورش کا سامان ہوتا تھا ۔ وہ سوسائٹی میں ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کی یتامیٰ سے بدسلوکی کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا ہے ۔ ارشادِ الٰہی ہے :۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۔ [1] کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے ۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا [2] ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کی خاطرداری نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے اور میراث کو سب کچھ سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بیحد پیار کرتے ہو ۔

معاشرتی حقوق

احسان اسلام نے یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے ۔ اور اس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ عبادتِ الٰہی کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کے حکم کے بعد یہ حکم دیا کہ یتامیٰ کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ چنانچہ

---

[1] الماعون ۱۰۷ : ۲،۱ [2] الفجر ۸۹ : ۱۷، ۱۸، ۱۹

ارشادِ الٰہی ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ۔ ؎۱ اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور قریبیوں یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ بھی۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مسلمانوں میں سب سے بہتر وہ گھر ہے جس میں کوئی یتیم ہو۔ اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا برتاؤ کیا جائے ؎۲

جو کسی یتیم لڑکی یا یتیم لڑکے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا جو اس کے پاس ہے۔ تو میں اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے اور آپ نے دونوں انگلیوں کو ملا کر لوگوں کو دکھایا ؎۳

یتیم کو دھکے دینے اور اس کو ڈانٹ ڈپٹ سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:- اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ؎۴ کیا تو نے اس شخص کی حالت کو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ وہ مذہب کی تکذیب کرتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ؎۵ سو یتیم پر سختی نہ کر۔

نقطہ انسانی طبعی ضروریات میں سے سب سے اہم ضرورت پیٹ کی بھوک دور کرنا ہے اس طبعی ضرورت کے پیش نظر اسلام دولت مندوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ یتامیٰ کی پرورش کریں تاکہ اس بے کس طبقے کی روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے:- وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ

؎۱ النساء ۴: ۳۶ ؎۲ ابن ماجہ ؎۳ ترمذی - احمد ؎۴ الماعون ۱۰۷: ۱، ۲
؎۵ الضحیٰ ۹۳: ۹ -

لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا [1]

اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

دوسری جگہ آیا ہے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ [2]

یا بھوک کے دن کھانا کھلانا قریبی یتیم کو

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى

(البقرہ ۲: ۲۱۵) کہہ جو کچھ بھی اچھے مال سے خرچ کرو وہ ماں باپ اور قریبوں اور یتیموں کے لیے ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

مَنْ آوٰى يَتِيْمًا اِلٰى طَعَامِهٖ وَشَرَابِهٖ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ الْجَنَّةَ الْبَتَّةَ اِلَّا اَنْ يَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ [3]

جو شخص یتیم کو اپنے کھانے پینے میں شریک کرے گا خدا اُس کے لیے جنت واجب کر دے گا۔ بشرطیکہ وہ کسی ایسے گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو جو قابلِ معافی نہ ہو۔

صحابہ کا نمونہ:- جب یتامیٰ کی پرورش اور ان کو کھانے پر مدعو کرنے کی آیات نازل ہوئیں تو ہر صحابی کا گھر یتیم خانہ بن گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کسی یتیم بچے کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔

كان لا ياكل الطعام الا وعلى خوانه يتيم [4]

کھانا نہیں کھاتا تھا مگر اس کے دسترخوان پر یتیم ہوتا تھا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے خاندان اور انصار کی یتیم لڑکیوں کی پرورش اپنے گھر میں لا کر کرتی تھیں [5]

ایک مرتبہ ایک یتیم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک شخص پر ایک نخلستان کا دعویٰ کیا مگر اس کا ثبوت نہ پیش کر سکا اس لیے آپ نے مدعا علیہ کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ وہ یتیم رونے لگا۔ آپ کا دل رحم سے پگھل گیا۔ مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو خدا اس کے بدلے میں جنت دیگا۔ مگر وہ نہ مانا۔ ایک صحابی حضرت

---

[1] الدہر ۷۶: ۸، ۹ [2] بلد ۹۰: ۱۴، ۱۵ [3] ترمذی ابواب البر والصلۃ فی رحمۃ الیتیم [4] ادب المفرد [5] موطا امام مالک و مسند احمد

ابوالاحداح پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس شخص سے کہا تم اس نخلستان کو میرے نخلستان سے بدل سکتے ہو! وہ تیار ہو گیا۔ ابوالاحداح نے اس کا نخلستان اپنے نخلستان سے بدل کر یتیم کے حوالے کر دیا۔[1]

اصلاح جس طرح یتیم کی جسمانی پرورش ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی روحانی پرورش بھی ضروری ہے۔ اسلام نے یتامیٰ کی اصلاح اور کردار کو سنوارنے کا حکم دیا ہے: تاکہ وہ سوسائٹی کا ایک اچھا فرد ثابت ہوں نہ کہ ننگِ وعار۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ۔[2]

اور تجھ سے یتیموں کی نسبت پوچھتے ہیں کہ ان کی اصلاح کرنا اچھا ہے۔

انصاف عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ جو فرد سوسائٹی میں کمزور ہوتا ہے۔ اس کے معاملہ میں انصاف نہیں کیا جاتا۔ انسان کی اس طبعی کمزوری کو دیکھ کر اسلام نے یتامیٰ کے بارہ میں خاص طور پر یہ تاکید کی ہے کہ ان کے بارہ میں انصاف سے کام لیا جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی کمزوری انصاف کی راہ سے ہٹا دے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا۔[3]

یہ کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہو اور جو کچھ بھلائی تم کرو تو اللہ اسے جاننے والا ہے۔

آئینی حقوق

مال کی حفاظت کسی بچے کے والدین فوت ہو جائیں۔ ورثہ میں اس کے حصے میں مال و دولت آ جائے تو یتیم بچے کے اعزا و اقربا پر یہ لازم ہے کہ وہ اس مال کی حفاظت کریں۔ جب وہ سنِ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ

---

[1] استیعاب تذکرہ ابوالاحداح۔ [2] البقرہ ۲ : ۲۲۰
[3] النساء ۴ : ۱۲۷

إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ ۱؎

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس طریق سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۲؎

اور یتیموں کو ان کا مال دے دو اور اچھی چیز کو بری چیز سے نہ بدلو۔

یتیم کا مال کھانا گناہ ہے

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۳؎ اور ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ نہ ملا کر کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ جو شخص یتیم کا مال کھاتا ہے وہ گویا جہنم کی آگ سے پیٹ بھرتا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا۔ ۴؎

جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

اگر یتیم کا سرپرست کوئی غریب مفلس شخص ہے تو اسلام اس کو بقدر ضرورت حق خدمت لینے کی اجازت دیتا ہے اگر ولی آسودہ حال ہے تو وہ یتیم کے مال سے اس کا معاوضہ ہرگز نہ لے۔

ارشاد الٰہی ہے:۔ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۵؎

اور جو مفلس ہو تو وہ دستور کے مطابق کھائے۔

وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۶؎

اور جو خوش حال ہے ان کے مال سے پرہیز کرے۔

جب تک یتیم عاقل بالغ نہ ہو جائے اور اس میں مال کی حفاظت کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے اُس وقت تک مال اس کی تحویل میں نہیں دینا چاہیئے۔ جب وہ عقل و شعور کی عمر کو پہنچ جائے تو اُس کا مال اُس کو دے دینا چاہیئے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

۱؎ الانعام ۶: ۱۵۲ ۲؎ نساء ۴: ۲ ۳؎ نساء ۴: ۲ ۴؎ نساء ۴: ۱۰
۵؎ نساء ۴: ۶ ۶؎ نساء ۴: ۶

فَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا[۱] اور کم عقل لوگوں کو تم اپنے مال نہ دے دو جن کو اللہ نے تمہارے لیے سہارا بنایا ہے اور تم انہیں ان کے ذریعہ سے کھانے کے لیے دو اور انہیں کپڑا پہناؤ اور انہیں بھلی بات کہتے رہو۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ[۲]

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تب اگر ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

اختلاف اور جھگڑے سے بچنے کے لیے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے یتیم کا مال گواہوں کی موجودگی میں واپس کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا[۳]

پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو ان پر گواہ کر لو اور اللہ کافی حساب لینے والا ہے۔

مال غنیمت میں سے یتیموں کا حصہ اسلام نے صرف انفرادی طور پر ہی یتیموں کی پرورش اور دست گیری کی ترغیب نہیں دی بلکہ قومی بیت المال میں مال غنیمت اور فے میں سے یتیموں کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ[۴] اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم دشمن سے حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور وہ رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے:۔ وَمَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ[۵]

جو اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مال غنیمت دلایا تو وہ اللہ کے لیے اور

---

[۱] نساء ۴: ۵ [۲] نساء ۴: ۶ [۳] نساء ۴: ۶ [۴] الانفال ۸: ۴۱
[۵] حشر ۵۹: ۷

رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں کے لیے اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

انصاف نہ کر سکنے پر یتیم لڑکیوں سے شادی کرنے کی ممانعت

جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ عرب میں یتیم ذلیل و مقہور طبقہ خیال کیا جاتا تھا۔ امراء یتیم لڑکیوں سے شادی کر لیتے اور ان سے بدسلوکی سے پیش آتے۔ ان کے ازدواجی حقوق کو پامال کرتے۔ وہ یتیم لڑکیاں امراء کے ہاتھوں میں محض کھلونا بنی رہتیں۔ اسلام آیا تو اس نے یتیموں کو عزت کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ امراء کو یہ حکم دیا کہ اگر وہ یتیم لڑکیوں کے بارہ میں انصاف سے کام نہیں لے سکتے تو ان کو صرف ایک ہی شادی کرنی چاہیئے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ[1] اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند ہوں۔

اخلاقی حقوق

اولاد جیسا برتاؤ

وَلۡیَخۡشَ الَّذِیۡنَ لَوۡ تَرَکُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّیَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَیۡهِمۡ فَلۡیَتَّقُوا اللّٰهَ وَلۡیَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا[2] اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو ان کے لیے ڈرتے ہوں۔ پس چاہیئے کہ اللہ کا تقویٰ کریں اور چاہیئے کہ سیدھی سادھی بات کریں۔

اس آیت کریمہ میں فطرتِ انسانی کو اپیل کی ہے۔ کہ جس طرح کوئی شخص مرنے لگے اور اس کی چھوٹی چھوٹی اولاد پیچھے رہ جائے۔ اس کی یہ دلی تمنا ہوتی ہے کہ دوسرے اس کی اولاد پر رحم کریں اور متکفل ہوں۔ اسی طرح ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ یتیموں کے ساتھ اپنے بچوں کی طرح نیک سلوک کریں اور ان کے متکفل بنیں۔

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

---

[1] نساء ۴ : ۴
[2] نساء ۴ : ۹

جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کے کرتا ہے تو اسے ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ گزرتا ہے نیکیاں ملتی ہیں [۱]۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلعم سے اپنی سنگدلی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو۔ اور محتاج کو کھانا کھلایا کرو۔[۲]

ہمسایوں کے حقوق

قرآن مجید نے اعزاء و اقرباء کے حقوق و فرائض کی اہمیت کے بعد ہمسایوں کی ذمہ داریوں پر زور دیا ہے۔ کیونکہ ہمسائے ہی ایک دوسرے کے قریب رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی غمی و خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔ ہمسایہ وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوں۔

اسلام نے الجار (پڑوسی) میں ہر قسم کے رفقائے کار کو شامل کیا ہے۔ جیسے دو ہمسفر دو طالب علم۔ دو اُستاد۔ دو مزدور وغیرہ۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ۔[۳] اللہ تعالیٰ نے قریبی پڑوسی اور دُور والے پڑوسی اور پہلو والے ساتھی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔

اِس آیت کریمہ میں پڑوسی کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو رشتے دار ہو اور پڑوسی بھی ہو۔ دوسرے جو صرف پڑوسی ہو۔ تیسرے رفقائے کار۔

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ[۴]

حضرت جبرئیل پڑوسیوں کے متعلق اس تاکید کے ساتھ وصیت کرتے رہے کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ انہیں وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔

جس کو پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے۔ یا جس کو خدا اور اس کے

---

[۱] ترمذی۔ [۲] مسند امام احمد [۳] نساء ۴: ۳۶

[۴] بخاری کتاب الادب الوصایا بالجار۔

رسولِ کریمؐ کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔

معاشرتی حقوق

پڑوسی کو ایذا نہ دی جائے معاشرہ کا تانا بانا ایک دوسرے کو تکلیف اور ایذاء دینے سے ہی ٹوٹتا ہے۔ اور باہمی ہمدردی اشتراک عمل۔ تعاون اور موالات سے ہی معاشرہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے اس وجہ سے اسلام نے پڑوسیوں کو ہر قسم کی ایذاء دینے سے منع فرمایا۔

حدیث شریف میں ہے۔ ابو شریح روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم وہ مومن نہیں خدا کی قسم وہ مومن نہیں خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ کسی صحابی نے پوچھا کون یا رسول اللہ! فرمایا جس کے شر سے اسکے پڑوسی محفوظ نہ ہوں[۱]

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ کہ رسولِ کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے[۲]۔

ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ فلاں عورت رات بھر نمازیں پڑھتی ہے اور دن کو روزہ رکھتی ہے اور صدقہ بھی کرتی ہے لیکن اپنے پڑوسی کو اپنی زبان سے ایذاء پہنچاتی ہے۔ فرمایا وہ جہنمی ہے۔ کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں عورت صرف نمازیں پڑھتی ہے رمضان کے روزے رکھتی ہے۔ کچھ کپڑے خیرات بھی کر دیتی ہے لیکن کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی۔ فرمایا وہ جنتی ہے[۳]

حُسنِ سُلوک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس وقت تک بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی یا پڑوسی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے[۴] جو

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔ [۲] بخاری باب من کان یومن باللہ ویوم الاخرۃ فلا یوذ جارہ [۳] ادب المفرد باب لایوذی جارہ [۴] مسلم باب الایمان باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔

شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[1]

فرمایا: اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک پڑوسیوں میں سب سے بہتر وہ ہے۔ جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو[2]

خرچ کرنا

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن بہت سے ایسے پڑوسی ہوں گے جو اپنے پڑوسیوں کا دامن تھامے ہوئے کہیں گے کہ یا رب اس نے اپنا دروازہ مجھ پر بند کر رکھا تھا اور روزمرّہ کی استعمال کی چیز دینے سے روکتا تھا[3]

وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے[4]

جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کر دیا کرو تاکہ پڑوسی کو بھی دے سکو[5]

حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میرے دو پڑوسی ہیں ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجا کروں۔ فرمایا: جس کا دروازہ تمہارے گھر کے قریب ہو[6]

مال و عزت و آبرو اور جان کی حفاظت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلعم سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! خدا کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ پھر کون سا گناہ فرمایا اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کر دینا کہ بڑے ہو کر تیرے ساتھ کھائیں گے۔ اس نے عرض کیا پھر کون سا گناہ فرمایا پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا[7]

ایک مرتبہ پڑوسی کے مال و عزت کی حفاظت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

آپ نے صحابہ کرام سے زنا کے بارہ پوچھا۔ تو انہوں نے جواب دیا وہ حرام ہے اور اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے فرمایا لیکن اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا دس عورتوں کے ساتھ بدکاری کرنے سے زیادہ سنگین ہے۔ پھر چوری کے بارہ میں سوال کیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا حرام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام قرار دیا ہے فرمایا: پڑوسی کے

---

[1] مسلم باب الایمان باب الحث علی اکرام الجار۔ [2] ادب المفرد باب خیر الجیران۔
[3] ادب المفرد باب من اغلق الباب علی الجار۔ [4] ادب المفرد باب من لا یشبع دون جارہ
[5] ادب المفرد باب یکثر ماء المرق فیقسم فی الجیران [6] بخاری باب حق الجوار فی قرب الابواب۔ [7] متفق علیہ۔

گھر میں چوری کرنا دس گھروں میں چوری کرنے سے زیادہ سنگین ہے[1]
قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو قتل کریں گے۔[2]

آزادی کی حفاظت ابوداؤد میں روایت ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ ایک صحابی نے عین خطبہ کے دوران اٹھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے ہمسایہ کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ ان کے سوالوں کو سُن کر جواب نہ دیا تاکہ کوتوال شہر ان کی گرفتاری کے لیے معقول وجہ رکھتا ہو تو اٹھ کر بیان کرے لیکن جب تیسری مرتبہ اس صحابی نے اپنے سوال کا اعادہ کیا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو آپ نے حکم صادر فرمایا: خلوالہ جیرانہ کہ اس کے پڑوسی کو رہا کر دو[3]۔

بیمار پرسی کرنا پڑوسی سے حسنِ معاشرت کے لیے صرف مسلمان ہونا ہی شرط نہیں بلکہ غیر مسلم پڑوسی بھی اسی حسن سلوک اور موالات کا مستحق ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔

بریدہ سے روایت ہے: ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا ہمارے ساتھ چلو کہ ہم اپنے اس یہودی ہمسائے کی عیادت کریں۔ بریدہ نے کہا ہم اس کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا کیا حال ہے۔ تیرا دل کیسا ہے[4]

آئینی حقوق

شفعہ شفعہ ہمسایہ کا ایک شرعی حق ہے۔ اگر کوئی ہمسایہ اپنی جائیداد فروخت کرنا چاہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ پہلے اپنے پڑوسی سے دریافت کرے کہ وہ خریدنا چاہتا ہے یا کہ نہیں۔ اگر وہ خریدنا چاہے تو اس کے ہاتھ فروخت کرے۔ اگر وہ نہ خریدنا چاہے تب وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے۔ اگر پڑوسی سے بغیر پوچھے کوئی جائیداد کو فروخت کر دے تو پڑوسی کو عدالت کی معرفت فروخت کی ہوئی جائیداد حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ حدیث میں ہے۔

---

[1] ادب المفرد باب حق الجار [2] ادب المفرد [3] ابوداؤد
[4] کتاب الآثار باب الایمان۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمسایہ اپنے شفعہ کا زیادہ مستحق ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو شفعہ کے لیے اس کا انتظار کیا جائے مگر یہ شفعہ اس وقت ہو گا جب ان دونوں کا راستہ ایک ہو۔ (بخاری)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مشترک چیز میں شفعہ کا حکم دیا ہے۔ جب تک اس کی تقسیم نہ ہوئی ہو۔ خواہ مکان ہو۔ خواہ باغ ہو۔ مالک کو یہ جائز نہیں کہ اپنے شریک کو اطلاع دیئے بغیر اسے فروخت کر دے۔ شریک کو اختیار ہے چاہے اس کو لے لے یا چھوڑ دے جب مالک فروخت کر دے اور شریک کو اطلاع نہ دے تو شریک اس کا زیادہ مستحق ہو گا حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے۔ کہ سعد نے اپنا ایک گھر مجھے پیش کیا اور کہا اسے لے لو۔ گو مجھے اس کی زیادہ قیمت ملتی ہے جو تم مجھ کو دیتے ہو لیکن تم اس کے زیادہ مستحق ہو۔ کیونکہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ پڑوسی کے ہوتے ہوئے اجنبی آدمی خریدنے کا حق نہیں رکھتا [1]

اخلاقی حقوق

دین کی تعلیم تعلیم یافتہ پڑوسیوں کا یہ حق ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دین کی تعلیم دیں۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔ لوگ اپنے پڑوسیوں میں دینی سمجھ پیدا نہیں کرتے ایسا کیوں ہے؟ پھر دوبارہ فرمایا کہ ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں سے دین نہیں سیکھتے؟ اور اس کے بعد حکم دیا کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو لازماً تعلیم دیں۔ حضور کے اس خطبہ کی خبر جب قبیلہ اشعر کے لوگوں کو ہوئی تو آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ کیا ہم دوسرے لوگوں میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں؟ ان کے خیال میں یہ ان پر فرض نہ تھا آپ نے فرمایا:۔ ہاں یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ پھر ان لوگوں نے حضور سے اس کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے ایک سال کی مہلت مانگی [2]

---

[1] کتاب الآثار باب الشفعہ [2] راہ عمل از مولانا جلیل احمد ندوی

حاجت مندوں کے حقوق

قرآن مجید نے حاجت مند کو دو لفظوں فقیر اور مسکین سے پکارا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے
اَلصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ [۱] زکوٰۃ صرف ناداروں اور مسکینوں کے لیے ہے۔
حضرت امام شافعیؒ نے فقیر اور مسکین کا فرق صرف اتنا بیان کیا ہے۔ فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو نہ وہ کوئی پیشہ جانتا ہو۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا ہنر تو ہو۔ مگر اس کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ ہو۔ اسی پر انہوں نے قرآن مجید کی آیت: وَاَمَّا السَّفِیْنَةُ فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ [۲] کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ جن کے پاس کشتی نہ تھی وہ نادار نہ تھے۔

یہ دنیا دار الابتلاء ہے۔ یہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں کہ لاکھوں پتی آدمی کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے کوڑیوں کا محتاج ہو جاتا ہے۔ کوئی صحیح اور تندرست اعضاء والا شخص کسی عضو سے بے کار ہو جاتا ہے۔ کوئی صاحب ہنر آدمی ہے۔ لیکن اس کا ہاتھ اتنا تنگ ہے کہ وہ ہتھیار اور آلات ہی نہیں خرید سکتا۔ ذہین طالب علم ہے۔ والدین تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ تعلیم جاری رکھنے کے لیے ان کو مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے اور بھی معاشرہ میں لوگ ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسلام نے ہر قسم کے محتاج کی ضرورت کو پورا کرنے کی بڑی تاکید کی ہے۔ تاکہ ضرورت مند طبقہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور معاشرہ کی تقویت اور استحکام کا موجب بن سکے۔

معاشرتی حقوق

حسن سلوک قرآن مجید میں آتا ہے: وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ [۳] اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اسی طرح رشتہ داروں یتیموں اور حاجت مندوں کے ساتھ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ [۴] اور مانگنے والے کو مت جھڑک۔ سائل سے مراد ہر وہ ضرورت مند ہے۔ جو کسی مالی مدد کا خواستگار ہوتا ہے۔

مالی امداد: اسلام نے امراء کے مالوں میں نادار اور حاجت مندوں کو حق دار قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [۵] اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق تھا۔

---

[۱] التوبہ ۹: ۶۰۔ [۲] الکہف ۱۸: ۷۹۔ [۳] نساء ۴: ۳۶۔ [۴] الضحیٰ ۹۳: ۱۰۔ [۵] الذاریات ۵۱: ۱۹۔

امام راغب کے نزدیک محروم سے مراد وہ شخص ہے جس کا رزق وسیع نہیں جس طرح اوروں کا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور جس کی حاجت کا علم نہیں ہوتا کہ اسے کوئی خیرات دے۔

دوسری جگہ آتا ہے :- لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ [1]

بڑی نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو۔ بلکہ بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لیے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے۔

قرآن مجید نے حاجت مندوں کو نہ دینے کی ہولناک سزا کا ذکر کیا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا کتنا ضروری ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے :- خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ لَا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ۔ [2]

اسے پکڑو پھر اسے طوق پہناؤ پھر اسے دوزخ میں داخل کرو پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی ناپ ستر ہاتھ ہے۔ اسے جکڑ دو وہ اللہ عظمت والے پر ایمان نہیں لاتا تھا۔ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا۔ سو آج اس کے لیے یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے سوائے خطا کاروں کے اسے کوئی نہیں کھاتا۔

دوسری جگہ حاجت مندوں کے حقوق کو نہ ادا کرنے کو دین کی تکذیب قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ [3]

---

[1] البقرہ ۲: ۱۷۷، [2] الحاقہ ۶۹: ۳۰۔۳۴
[3] ۱۰۷: ۱۔۳

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی حاجتمند آتا تو اسے آپؐ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا[1]

ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو[2]

جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا[3]

صحابہؓ کا نمونہ: صحابہ کرام نے اسلام کی تعلیم کے پیش نظر ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جائیداد وقف کر دی تھی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنا ایک عمدہ مال رسول کریم صلعم کے زمانہ میں خیرات کر دیا تھا وہ ایک باغ تھا جس کا نام ثمغ تھا۔ حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلعم سے عرض کیا میرا ایک مال ہے اور وہ مجھے بہت عزیز ہے میں چاہتا ہوں کہ اسے خیرات کر دوں آپؐ نے فرمایا تم باغ اس شرط پر خیرات کر دو کہ اس کے درخت نہ بیچے جائیں اور نہ ہبہ کیے جائیں۔ نہ ان میں وراثت جاری ہو۔ بلکہ پھل کام میں لائے جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر اس باغ کو خیرات کر دیا۔ ان کا یہ صدقہ اللہ کی راہ میں غلاموں اور مسکینوں مہمانوں اور مسافروں اور قرابت والوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ جو شخص اس کا متولی ہو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دستور کے مطابق خود بھی کھالے یا اپنے کسی دوست کو بھی کھلائے بشرطیکہ وہ اس سے مال جمع کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔[4]

صدقہ دینے والوں کے لیے اخلاقی احکام: صدقہ دینے والوں کو یہ حکم دیا کہ وہ صدقہ لینے والے پر نہ احسان جتائیں اور نہ کسی اور طریقے سے ایذا پہنچائیں ارشادِ الٰہی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى[5] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو جتا کر اور ستا کر باطل نہ کرو۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب تعاون المؤمنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ)
[2] بخاری باب کل معروف صدقۃ۔ [3] صحیحین۔ [4] صحیح بخاری کتاب الوصایا [5] البقرہ ۲: ۲۶۴

اگر حاجت مند سوال کرتے وقت اصرار سے کام لے تو اس کو نرمی اور محبت سے جواب دینا چاہیئے اور صبر کی تلقین کرنی چاہیے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ [1] نیک بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ انصار کے چند آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مانگنے آئے تو آپ نے ان کو دے دیا۔ پھر مانگا آپ نے پھر دے دیا حتیٰ کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا تو آپ نے فرمایا میرے پاس جتنا بھی مال ہوا اس کو تم سے بچا کر جمع رکھنے والا نہیں ہوں۔ لیکن جو شخص مانگنے سے بچا رہے گا خدا اسے محتاجی سے بچائے رکھے گا۔ اور جو صبر کرے گا خدا اسے صبر کی توفیق دے گا اور کوئی شخص صبر سے بہتر اور فراخ چیز نہیں دیا گیا [2]

اسلام کی تعلیم ہر پہلو سے جامع اور اکمل ہے۔ اسلام نے جہاں حاجت مندوں کی دستگیری کی تعلیم دی ہے وہاں مفت خوری کے لیے سوال کی بڑی مذمت کی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمہارے لیے لکڑی کا بوجھ اٹھا کر کمانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ بھیک مانگے اور دینے والے کو اختیار ہے کہ وہ دے یا نہ دے [3] ایک دفعہ ایک ضرورت مند صحابی نے آپ سے سوال کیا، آپ نے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے اس نے جواب دیا ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔ آپ نے اس کو منگا کر نیلام فرمایا اور اس کی قیمت سے کلہاڑی خرید کر اس کو دی اور فرمایا۔ جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرو ان کی محنت میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ ان کی حالت اتنی اچھی ہو گئی کہ پھر ان کو کسی سے مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہی [4]۔

آئینی حقوق

اسلام نے حاجت مندوں کے لیے زکوٰۃ سے شرعی حق مقرر کر دیا ہے۔ اور حکومت پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ مال زکوٰۃ سے ان کی حاجت براری کرے ارشادِ الٰہی ہے:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ [5] زکوٰۃ صرف نادار اور مسکینوں کے لیے ہے۔

---

[1] البقرہ ۲: ۲۶۳ [2] صحیحین [3] بخاری باب کراہیۃ المسئلۃ [4] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ
[5] التوبہ ۹: ۶۰

مہمان و میزبان کے حقوق و فرائض

مہمان کے حقوق

معاشرتی حقوق

تکریم: کسی مذہب نے بھی مہمان نوازی کی تعلیم نہیں دی۔ لیکن زمانہ جاہلیت میں مہمان نوازی کو وجہ تکریم سمجھا جاتا تھا۔ اور اسلام نے مہمان نوازی کی اہمیت کو اور بھی بڑھایا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے ذکر میں ان کی مہمان نوازی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے تکریم ضیف کا سبق ملتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ [1]

کیا تیرے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر آئی؟ جب اس پر داخل ہوئے کہا سلام اس نے کہا سلام۔ یہ اجنبی لوگ تھے۔ پس وہ اپنے گھر کی طرف چپکے سے گیا اور ایک موٹا بچھڑا لایا سو اسے ان کے نزدیک کیا کہا کیا تم کھاتے نہیں۔

ان آیات سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں ۱۔ مہمان اور میزبان کے درمیان کلام کی ابتدا سلام سے ہونی چاہیے۔ اس سے دونوں کی دلی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ جب مہمان آجائے تو اس کے کھانے کا بندوبست فوراً کرنا چاہیے۔ اور اس سے یہ دریافت نہیں کرنا چاہیے کہ آیا وہ کھانا کھائے گا یا کہ نہیں۔ ممکن ہے۔ کہ مہمان ایسے وقت میں آجائے جب گھر والے کھانا کھا چکے ہوں۔ تو مہمان سے کھانا کھانے کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ شرم و حیا سے کھانا کھانے سے انکار کر دے۔ اور بھوکا رہے۔

۳۔ مہمان کے سامنے عمدہ اور بافراغت کھانا رکھنا چاہیے جیسا کہ عجل سمین (موٹا بچھڑا) سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جب مہمان آئے تو لوط کی قوم نے ان کی اہانت کرنا چاہی

---

[1] ذاریات ۵۱: ۲۴-۲۷۔

لیکن حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی طرف سے دفاع کیا اور ان کو اہانت اور ذلت سے بچایا۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۙ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ

لوطؑ نے کہا یہ میرے مہمان ہیں تو تم مجھے رسوا نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو[1]

حدیث شریف میں آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے[2]

ضیافت: حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے۔ کہا گیا یا رسول اللہ اس کا جائزہ کیا ہے۔ تو فرمایا:۔ ایک دن ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہو گا[3]

اخلاقی حقوق

متابعت: مہمان کو رخصت کرتے وقت اس کے ساتھ تکریم و تعظیم کے لیے کچھ فاصلہ تک چلنا چاہیئے رسول کریم صلعم نے فرمایا:۔ مِنَ السنة اَنْ یخرج الرجل مع ضیفه اِلی باب الدار۔[4] یہ بات سنت سے ہے کہ آدمی اپنے مہمان کے ساتھ اس کی تکریم کے لیے گھر کے دروازے تک جائے۔

ایثار: معاشرہ کو مستحکم کرنے کے لیے اپنی ضرورت اور حاجت پر دوسروں کی حاجت اور ضرورت کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ اس سے محبت بڑھتی ہے بغض اور عناد دور ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِىْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[5]

اور وہ جو ان سے پہلے ہجرت کے گھر میں رہتے اور ایمان رکھتے تھے۔ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتا ہے اور اپنے سینوں میں اس کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو انہیں دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ پر انہیں مقدم رکھتے ہیں گو انہیں تنگی ہی ہو

---

[1] الحجر ۱۵: ۶۸، ۶۹ [2] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین [3] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ [4] ابن ماجہ بیہقی [5] الحشر ۵۹: ۹

جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے تو وہی کامیاب ہوں گے۔

اس آیت کریمہ میں انصار کے ایثار کا ذکر کیا ہے کہ جب مسلمان تہی دست مدینہ آئے تو انصار نے اپنے مالوں اور مکانوں میں سے حصہ دے دیا۔

اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں اس شخص کا واقعہ بیان کیا ہے جس کے سپرد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہمان کیا۔ اس کے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے اور کچھ نہ تھا۔ تو میاں بیوی نے بچوں کو تو بھوکا سلا دیا اور چراغ بجھا کر جو کچھ تھا وہ مہمان کو کھلا دیا اور خود بھوکے رہے۔

میزبان کے حقوق

اسلام نے مہمان کے حقوق بیان کرنے کے ساتھ میزبان کے حقوق بھی بیان کیے ہیں جو مہمان کو ادا کرنے چاہئیں۔

معاشرتی حقوق

بغیر اجازت گھر میں داخل نہ ہونا: قرآن مجید میں آتا ہے: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ[1]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کر لو یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کر لو۔

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی ہے کہ گھروں میں بغیر اجازت کے اور السلام علیکم کہنے کے داخل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انسان ہر وقت اس حالت میں نہیں ہوتا کہ وہ پسند کرتا ہو۔ کہ کوئی اسے دیکھ لے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ پر کھڑے ہو کر تین دفعہ سلام کہتے اگر اندر سے جواب ملتا تو اندر تشریف لے جاتے ورنہ واپس تشریف لے آتے۔ مہمان کے ساتھ دوسرا آدمی ہو تو میزبان کو اطلاع کر دینا ضروری ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ انصار میں ایک شخص تھا

---

[1] النور ۲۴: ۲۷

تھا جس کو ابوشعیب کہتے تھے۔ اس کا ایک قصاب غلام تھا۔ انصاری نے اپنے غلام سے کہا۔ کہ میرے لیے تھوڑا سا کھانا تیار کر دے کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کروں گا اور چار آدمی آپ کے ساتھ اور ہوں گے۔ اور آپ ان کے پانچویں ہوں گے۔ چنانچہ آپ بلائے گئے اور آپ کے ہمراہ چار آدمی اور راستہ میں ایک اور شخص بھی ان کے پیچھے ہو لیا تو رسول کریم صلعم نے انصاری سے فرمایا۔ تو ہم نے پانچ آدمیوں کو دعوت دی تھی۔ یہ شخص رستے میں ہمارے ساتھ ہو لیا ہے اگر پسند ہو تو آنے کی اجازت دے دو ورنہ چھوڑ دو اس نے کہا کہ میں نے اس کو اجازت دے دی ہے [1]

کھانا کھانے کے بعد کوئی نہ اُٹھے: اگر کسی دعوت پر چند آدمی اکٹھے ہو جائیں جب تک سب کھانا نہ کھا لیں اس وقت تک کوئی آدمی بھی اگر وہ سیر ہو کر دوسرے آدمیوں سے پہلے دسترخوان سے اُٹھ کھڑے ہوں تو دوسرے آدمی شرم سے کھانا چھوڑ دیتے ہیں اور بھوکے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب دسترخوان بچھا دیا جائے تو کوئی شخص نہ اُٹھے حتیٰ کہ دسترخوان اُٹھا نہ لیا جائے اور اپنا ہاتھ کھانے سے نہ اٹھائے تاوقتیکہ اور لوگ سیر ہو کر نہ کھا لیں خواہ خود سیر ہی ہو گیا ہو اور اگر پہلے ہاتھ کھینچ لینا چاہتا ہے تو عذر بیان کر دے کیوں کہ بغیر عذر کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا ساتھی کو شرمندہ کرتا ہے اور وہ بھی اپنا ہاتھ سکیڑ لیتا ہے اور ممکن ہے کہ اسے کھانے کی ضرورت ہو [2]

کم مدتِ قیام: حدیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہمان کو کسی کے پاس تین دن سے زیادہ قیام نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہو گی اور اس پر بوجھ پڑے گا [3]

اخلاقی حقوق

دُعائے خیر: مہمان اپنے میزبان کے لیے دعائے خیر کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صاحب خانہ کے لیے دُعا فرمایا کرتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ رسول کریم صلعم انصار کے ایک گھر والوں سے ملنے کے لیے تشریف

---

[1] بخاری [2] ابن ماجہ [3] بخاری کتاب الاداب باب اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ بنفسہ

کم خور

نہ اُٹھے۔ کیونکہ بعض آدمی ہوتے ہیں بعض دفعہ کسی کو بھوک ہی کم لگی ہوتی ہے

لے گئے۔ اور وہاں کھانا تناول فرمایا جب تشریف لانے لگے تو آپ نے گھر کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا اور وہاں چٹائی پر پانی چھڑکا گیا تو آپ نے اس پر نماز ادا کی اور ان کے لیے دُعا فرمائی۔ بخاری[1]

بیمار کے حقوق

انسانی معاشرہ میں بیماریوں کا ایسا طبقہ ہے جو ہماری ہمدردیوں اور خبرگیری کا مستحق ہے اس وجہ سے اسلام نے ان کی عیادت کا حکم دیا ہے عیادت کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے کہ مریض کی بیمار پُرسی کر جائے۔ بلکہ اس کا حقیقی مفہوم مریض کی دیکھ بھال اور غمخواری اور ہمدردی ہے۔ اسلام نے بیماروں کے لیے بعض شرعی سہولتیں دے دی ہیں۔ حج ساقط ہو جاتا ہے جہاد موقوف ہو جاتا ہے وضو معاف ہو جاتا ہے اگر کھڑا ہونے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی اجازت ہے اگر بیٹھ کر بھی نماز ادا نہیں کر سکتا تو لیٹ کر۔ اگر لیٹ کر بھی نہیں تو اشارہ سے روزہ توڑنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

قرآن مجید نے ایک کلی اصول مقرر کر دیا ہے۔ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ[1] اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔

عیادت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے[2]

صحابہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے[3]

فرمایا جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دُعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں[4]

---

[1] نور ۲۴: ۶۱ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] سنن کتاب الجنائز۔

دُعا: جناب رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے۔ تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے۔ اور اس کو تسلی دے اور اس کے شفا پانے کے لیے دُعا کرے ۔[۱]

ایک دفعہ رسول کریم صلعم نے عیادت کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہ کی۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہانوں کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیونکر کرتا اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا۔ مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا ۔[۲]

خادم اور آقا کے فرائض

خادم کے معاشرتی حقوق

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی ہر چیز کے لیے رحمت کا پیغام لے کر آئے۔ اس پیغام نے ظلم وجور کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ دنیا کے ہر ملک میں بعثتِ نبوی سے قبل خادموں کے ساتھ نہایت ہی وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک ہوتا تھا۔ ہر وقت محنت اور کام میں مصروف رکھے جاتے۔ پیٹ بھر کر روٹی نہ دی جاتی۔ تن ڈھانپنے کے لیے چار گرہ کپڑا نہ دیا جاتا۔ ذراسی غلطی پر مار مار کر لہولہان کر دیا جاتا۔ سب سے بڑھ کر اگر کوئی ملازمہ عورت ہے تو اس کی آبرو محفوظ نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو ذریعہ آمدن بنا لیا جاتا۔ اسلام نے خادموں کے حقوق مقرر کیے۔ ان کو پستی سے اٹھا کر مقام عزت پر لا کھڑا کیا۔

حُسنِ سلوک: اسلام نے صرف والدین اور رشتے داروں سے نیک سلوک کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ملازموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی تعلیم بھی دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔[۳] اور اللہ کی عبادت کرو اور

---

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز

[۲] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

اس کے ساتھی کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے ساتھ جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا فخر کرنے والا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلاث من کن فیہ یسّر اللہ حتفہ وادخلہ جنتہ، رفق بالضعیف وشفقۃ علی الوالدین واحسان الی المملوک [1] جس میں تین خصلتیں ہوں خدا اس کی موت آسان کر دیتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرے گا۔ ناتوانوں کے ساتھ نرمی اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اور غلاموں کے ساتھ احسان کرنا۔

حسن الملکۃ یمن وسوء الخلق شوم [2] غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا برکت کا باعث ہے اور بدخلقی سے پیش آنا بے برکتی کا موجب ہے۔

کھانا کپڑا: اسلام صرف یہی تعلیم نہیں دیتا کہ ملازموں کو کھانا کپڑا دیا جائے بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ آقا جو کھائے وہی ملازم کو کھلائے اور جو پہنے وہی ملازم کو پہنائے۔

حضرت ابوذر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لونڈی غلام تمہارے بھائی بہن ہیں۔ خدا نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے تو جس کے بھائی بہن کو اللہ تعالیٰ اس کے ماتحت کر دے اس کو چاہیئے کہ جیسا وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے ان کو ایسے کام پر مجبور نہ کیا جائے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔ اگر کوئی ایسا کام کرنے کے لیے کہا جائے تو آقا خود بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے چنانچہ حضرت ابوذرؓ جو خود کھاتے پہنتے تھے وہی غلام کو کھلاتے پہناتے تھے [3]

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جب تم لوگوں میں سے کسی کا خادم آپ کے لیے کھانا تیار کر کے لائے کیوں کہ اس نے کھانا پکانے میں آگ کی گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے۔ اس لیے اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانا چاہیئے اگر کھانا کم ہو تب بھی اس کے ہاتھ پر چند لقمے رکھ دینا چاہیئے [4]

---

[1] ترمذی [2] ابوداؤد [3] بخاری باب قول النبی العبید اخوانکم فاطعموھم مما تاکلون۔ [4] مسلم کتاب الایمان باب اطعام المملوک مما یاکل۔

فرمایا: لعن اللہ قوما یرغبون عن ارقائهم اَن یاکلوا معهم[1] اور ان لوگوں پر لعنت کرے جو اپنے غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

ملازموں کو مارنے کی ممانعت: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا لوگو! میں تم کو بتاؤں بدترین آدمی کون ہے وہ جو تنہا کھاتا ہے اپنے نوکر کو تازیانہ لگاتا ہے مگر اس کو کھانے کے لیے کچھ نہیں دیتا۔[2]

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم لونڈی غلاموں کے ساتھ بھلائی کرنے کی ہدایت فرماتے تھے کہ جو تم کھاتے اور پہنتے ہو وہی ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور اللہ کی مخلوق (ملازم) کو سزا نہ دو[3]

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کو مارے تو اللہ کو یاد کرے[4]

حضرت ابومسعود سے روایت ہے کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی ابومسعود جان لو ابومسعود جان لو پیچھے مڑ کر دیکھا تو رسول کریم صلعم تھے آپ نے فرمایا تم کو اپنے غلام پر قدرت ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ طاقت تم پر رکھتا ہے ابومسعود کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر میں نے اپنے کسی غلام کو نہیں مارا[5]

عفو درگزر: اسلام نے صرف مارنے اور جھڑکنے ہی سے منع نہیں کیا بلکہ ان سے غلطی سرزد ہو جائے تو درگزر کرنے کی تعلیم دی ہے حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی یا رسول اللہ ہم خدمتگاروں کے قصوروں سے کتنی دفعہ درگزر کریں آپ خاموش رہے۔ اس نے پھر اپنی بات کو دہرایا آپ پھر خاموش رہے۔ جب تیسری دفعہ اس نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ درگزر کیا کرو[6]

شادی کی ذمہ داری: رومن ایمپائر میں غلام قانونی طور پر شادی کا حق دار نہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس باب سلیوری) لیکن

---

[1] الادب المفرد باب ہل یجلس خادمہ اذا اکل [2] مشکوٰۃ باب النفقات وحق المملوک [3] ادب المفرد باب اکسوہم مما تلبسون [4] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب جاء فی ادب الخادم [5] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب النہی عن ضرب الخدام وشتمهم [6] ابوداؤد ترمذی ابواب البر والصلۃ ما جاء فی ادب الخادم۔

قرآن میں آتا ہے آقا پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خدمتگار (مرد یا عورت) کی شادی کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ[1]

اور جو تم میں سے مجرد ہیں۔ ان کے نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو صلاحیت رکھتے ہوں اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ فراخی والا علم والا ہے۔

حضرت امام بیضاوی صاحب فرماتے ہیں: وفیہ دلیل علی وجوب تزویج المولیۃ والمملوک (تفسیر بیضاوی مطبوعہ مصر صفحہ ۲۰۵) یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ غلام اور باندی کا نکاح کرنا واجب ہے۔

انسانی اخوت اسلام نے روئے زمین کے تمام انسانوں کو اخوت کی سلک میں منسلک کیا ہے۔ سب کی ایک ہی اصل قرار دی ہے ارشادِ الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا[2] اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور اللہ کے حقوق کی جس کے ذریعہ تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں انھم اخوانکم فضلکم اللہ علیھم[3]۔ وہ تمہارے بھائی ہیں جن پر اللہ نے تم کو فضیلت دی ہے۔

ایک اور روایت ہے اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم[4] غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں کر دیا ہے۔

امامت کا حق اسلام میں نماز صرف عبادت کا اہم رکن ہے نماز کے متعلق رسول کریم صلعم فرماتے ہیں مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑا اس نے کفر کیا اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ نماز مومنوں

---

[1] نور ۲۴: ۳۲ [2] النساء ۴: ۱ [3] ابوداؤد باب حق المملوک [4] ابوداؤد باب حق المملوک و الادب المفرد۔

کے معراج کا ذریعہ ہے، اسلام نے اس اہم عبادت میں غلام کو امامت کا حق دیا ہے حدیث میں آتا ہے حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ابوحذیفہ کے غلام سالم نماز میں امامت کراتے تھے۔ آپ کی اقتداء میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و ابوسلمہؓ زید اور عامر بن ربیعہؓ بھی شامل ہوتے تھے نماز پڑھتے تھے[1]

حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو عمار بن یاسر کو کوفہ کا امام نماز اور قائد لشکر بنا کر بھیجا[2]

غلاموں کی عبادت: اسود بن ابی زید سے روایت ہے کہ جب کوئی وفد حضرت عمرؓ کے پاس آتا تو اس سے دریافت کرتے تھے کہ تمہارے علاقے کا گورنر کیسا ہے؟ وہ کہتے بہت اچھا آدمی ہے پھر آپ دریافت کرتے کہ غلاموں کی عیادت کرتا ہے یا کہ نہیں وہ کہتے ہاں کرتا ہے اور ازاں دریافت کرتے کہ ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے ان غرباء کو اس کے دروازہ پر بیٹھنے کی اجازت بھی ہے یا کہ نہیں وہ جواب ہاں میں دیتے اگر ان سوالات میں سے کسی ایک سوال کا جواب نفی میں ہوتا تو حضرت عمرؓ گورنر کو معزول کر دیتے تھے[3]

آقا کو نصیحت کرنے کا حق: دوسری اقوام عالم میں غلام کو آقا کے سامنے بولنے تک کی اجازت نہیں اسلام نے غلاموں کو فکری اور قولی آزادی بخشی ہے وہ اپنے آقا کے کسی غلط فعل پر نکتہ چینی کر سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے: ان العبد اذا نصح لسیدہ واحسن عبادۃ اللہ فلہ اجرہ مرتین[4] غلام اپنے آقا کو نصیحت کرے اور اللہ کی اچھی طرح عبادت کرے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔

آئینی حقوق

خدمت گار اور غلام مالِ غنیمت میں ویسے ہی حقدار ہیں جیسے احرار قرآن مجید میں غنیمت سے متعلق جتنی آیات آئی ہیں ان میں آزاد اور غلام کی تفریق نہیں کی۔ اسی بنا پر

---

[1] صحیح بخاری باب استقضاء الموالی و استعمالہم [2] فتوح البلدان بلاذری یوم جلولاء الوقیعۃ
[3] تاریخ طبری ج ۵ صفحہ ۳۳ [4] ابوداؤد و الادب المفرد باب اذا نصح العبد لسیدہ

حضرت عمرؓ ابوبکرؓ بیت المال سے وظائف تقسیم کرتے وقت آزاد اور غلام میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کان ابی یقسم للحر والعبد۔ میرے باپ غلام اور آزاد دونوں کے لیے تقسیم کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نے ہر مسلمان کے لیے ہر مہینہ میں دو مد گیہوں اور دو قسط زیتون کے لیے اور دو قسط سرکہ کے لیے مقرر کر دیئے ہیں تو ایک شخص نے کہا والعبد یعنی کیا غلام کو بھی اتنا ہی ملے گا آپ نے فرمایا والعبد۔ ہاں غلام کو بھی۔[1]

حرام کاری پر مجبور نہ کرنا زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ لونڈیوں سے زنا کراتے اور اس کی اُجرت وصول کرتے تھے۔ اسلام نے لونڈیوں کی عصمت محفوظ رکھنے کے لیے اس رسم کو مٹا دیا۔ فرمایا۔ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَن يُكْرِههُّنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِن بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ[2] اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو تاکہ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہو اور جو کوئی انہیں مجبور کرے گا تو اللہ ان کے جبر کے بعد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

شہادت کا حق: رومیوں کے نزدیک غلام کی شہادت کو قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے غلام کی شہادت کو معتبر سمجھا ہے۔ حضرت انس بن مالک سے غلاموں اور باندیوں کی شہادت کے معنی پوچھا گیا تو فرمایا غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو۔[3]

حافظ امام ابن تیمیہؒ شہادتِ عبد کے جواز پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر کسی ایک فقیہہ نے کہا ہے کہ غلام کی گواہی قابل اعتبار نہیں تو اس سے رسول کریم صلعم پر کوئی الزام نہیں آتا اور نہ اس کا قول اور اللہ رسول کے فرمان کے بالمقابل ہمارے لیے حجت ہو سکتا ہے اسی طرح کی بات کہنا رسول کریم صلعم پر کھلا ہوا بہتان ہے۔ آپ کی طرف سے ایک حرف بھی ایسا نہیں آیا جس میں فرمایا گیا ہو کہ غلاموں کی گواہی قابل اعتبار نہیں اس کے برعکس کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور اجماع صحابہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج باب فی قسم الفی [2] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۶۶۔
[3] نور ۲۴ : ۳۳ [4] بخاری شہادۃ الاماء والعبد۔

اور میزان عدل سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ غلام کی شہادت ان
تمام امور میں معتبر ہونی چاہیئے جن میں حر کی شہادت قبول ہوتی ہے[1]

ملکیت کا حق اسلام سے قبل غلاموں کو حق ملکیت حاصل نہ تھا اسلام نے ان کے حق ملکیت کو تسلیم کیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ بریرہ حضرت عائشہؓ کی باندی تھیں کسی نے ان کو گوشت ہبہ کیا۔ رسول کریم صلعم گھر تشریف لائے تو دریافت کیا کچھ کھانے کو ہے بولیں گوشت ہے مگر فلاں نے مجھ کو صدقہ دیا ہے آپؐ نے فرمایا۔ لَکِ صَدَقَۃٌ وَلَنَا ھَدِیَّۃٌ وہ گوشت تمہارے لیے تو صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نوکر بھی اشیاء کے مالک ہوتے ہیں ۔

سیادت کا حق معاشرتی زندگی میں غلاموں کو احرار کے ساتھ پوری مساوات بھی عہد نبوی میں غلاموں کو لشکر کی قیادت سونپی گئی۔ رسول کریم صلعم نے شام کی مہم کی قیادت حضرت اسامہؓ کے سپرد کی وہ صرف اٹھارہ برس کے نوخیز جوان تھے۔ ان کے والد زید کو موتہ کی لڑائی میں قائد لشکر مقرر کیا گیا تھا۔

امان کا حق: غلام کا امن دینا:۔ جنگ میں جس طرح ایک حر کسی شخص کو امن دے سکتا ہے اور قائد لشکر اس کو معتبر سمجھتا ہے اسی طرح غلام کے قول کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عمر ایک سردار کو لکھتے ہیں : ان عبد المسلمین من المسلمین و ذمتہ من ذمتھم یجوز امانہ[2] مسلمانوں کا غلام مسلمانوں میں سے ہے اس کا عہد بھی مسلمانوں کے عہد کی طرح ہے اس کا امن دینا جائز ہے

غلام کو خصی کرنے کی ممانعت بعثت سے قبل دنیا کی مختلف اقوام میں غلام کو خصی کرنے کی رسم چلی آرہی تھی - رسول کریم صلعم نے اس بہیمانہ رسم کو ختم کیا۔ فرمایا مَنْ خصّٰی عبدہ خصیناہ[3] جو شخص اپنے غلام کو خصی کرے گا ہم بھی اس کو خصی کر دیں گے۔

تہمت لگانے کی ممانعت حدیث شریف میں آتا ہے :
من قذف مملوکہ وھو بریٔ مما قال

---

[1] القیاس فی الشرع الاسلامی صفحہ ۱۲۸ [2] ابوداؤد فی حق المملوک۔
[3] ابوداؤد من قتل عبدہ ۔

جلد یوم القیمۃ الا ان یکون کما قال [1]

جو شخص اپنے کسی غلام پر تہمت لگائے اور وہ اس سے بری ہو اس کو قیامت کے دن کوڑے لگائے جائیں گے مگر یہ کہ ایسا ہی ہو جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ آقا پر حد قذف لگائی جائے گی۔

غلاموں کے لیے حدود و عقوبات ازروئے احکام فقہ غلاموں کے لیے حدود و عقوبات آزاد آدمیوں کی نسبت نصف ہیں جس جرم کی پاداش میں ایک آزاد آدمی کے لیے اسی کوڑے ہیں تو اسی جرم میں عبد کو چالیس کوڑے لگائے جائیں گے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر غلاموں کے لیے انتہائی سزا (جو آزاد آدمیوں کے لیے ہے) مشروع کر دی جائے تو اس سے ظلم کا دروازہ وا ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک مالک اپنے غلام کو قتل کر دے گا اور بہانہ یہ تراشے گا کہ اس نے زنا کیا تھا اور پھر اس سے کوئی بازپرس بھی نہیں ہو گی اس بنا پر غلاموں کے حدود کو ایک حد تک کم کر دیا ہے کہ ہلاکت پر منتج نہ ہوں [2]

اخلاقی حقوق

تعلیم دینا خدمت گار صرف خدمت کے لیے ہی نہیں ہوتا بلکہ آقا کا یہ فرض ہے کہ اس کی تعلیم کا بھی اہتمام کرے۔ حضرت ابن عباسؓ اپنے غلام حضرت عکرمہ کو قرآن اور حدیث کی تعلیم دیتے تھے اور وہ سبق یاد نہ کرتے تو پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے تھے [3]

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں تین شخصوں کو دو اجر ملیں گے ایک وہ جو اپنی باندی کو تعلیم دے اور خوب اچھی تعلیم دے اس کو ادب سکھائے اور خوب سکھائے پھر اس کو آزاد کر کے خود اس سے نکاح کرلے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو اہل کتاب تھا پھر اسلام لے آیا۔

---

[1] بخاری [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۱۶۰ [3] دارمی ص۴۳

تیسرا وہ شخص جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے [1]

غلام کی دعوت قبول کرنا حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول کریم صلعم غلاموں کی دعوت قبول کرتے تھے۔ اور ان کے ہاں چلے جاتے تھے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم غلاموں اور باندیوں کی دعوت قبول کرتے تھے اور ان کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ایک درزی غلام کے پاس تشریف لے گئے، اس نے ایک پیالہ پیش کیا جس میں کدو تھا۔ آپ نے خوشی سے قبول فرما کر نوش کیا [2]

آقا کے حقوق

معاشرتی حقوق

خدمت گزاری ملازم پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کام کاج محنت اور دیانتداری سے انجام دے قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ [3] حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے باپ سے کہا بہترین آدمی جسے تو ملازم رکھنا چاہتا ہے وہ ہے جو مضبوط بھی ہو، دیانت دار بھی۔

حدیث میں آتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہو کر دیکھے گا کہ اس کا غلام اس سے اوپر کے درجہ میں ہے وہ کہے گا اے اللہ یہ تو میرا خادم ہے جواب ملے گا میں نے اس کو اس کے عمل اور تجھ کو تیرے عمل کا بدلہ دیا ہے

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ تین آدمیوں کو دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد صلعم پر بھی ایمان لایا اور دوسرے وہ غلام جو خدا کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے آقاؤں کا بھی اور تیسرے وہ شخص جس کے پاس باندی ہو اور با اخلاق وہ اس سے ہم بستر ہوتا ہو پھر اس نے اچھا ادب سکھایا اور اچھی تعلیم دی پھر اس کو آزاد کر دے تو اس سے نکاح کر لیا تو اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے [4]

حضرت جریر سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جب غلام بھاگ جاتا

---

[1] بخاری باب من اسلم من اہل الکتاب [2] شرح الشفاء للشہاب ج ۲ صفحہ ۷۷۔

[3] القصص ۲۸: ۲۶ [4] صحیحین

ہے تو اس کی کوئی نماز قبول نہیں کی جاتی اور انہی سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ جو غلام بھاگ جاتا ہے وہ اللہ کے ذمے اور عہد سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایک اور روایت میں انہی سے مروی ہے کہ جو غلام اپنے آقاؤں کی خدمت سے منہ پھیر کر بھاگ جاتا ہے جب تک اس کے پاس واپس نہ آجائے وہ کافر رہتا ہے۔[1]

خیر خواہی ملازم پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کی خیر خواہی سامنے رکھے۔ وہ دیکھے کہ اس سے غلطی سرزد ہو رہی ہے تو نصیحت کر دے حدیث میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جب غلام اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے اور اچھی طرح خدا کی عبادت کرتا ہے تو اسے دہرا اجر ملے گا۔[2]

غلامی کا خاتمہ

اسلام سے قبل دنیا کے ہر خطے میں غلامی کا رواج تھا۔ ضروریات زندگی کی اشیاء کی خرید و فروخت کی طرح غلاموں کی بھی خرید و فروخت ہوا کرتی ہے۔ اسلام نے اس انسانی توہین آمیز رواج کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ غلامی کے خاتمہ سے متعلق اسلامی تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

اوّل:۔ مستقبل میں ہمیشہ کے لئے غلامی کو ختم کرنے کے متعلق تعلیم۔

دوم:۔ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی آزادی کا بندوبست۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی آزادی کا انتظام:۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء ۴: ۳۶) اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر اور ان کے بھی جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے (غلام) اس آیت کریمہ میں علاقوں کے ساتھ معاشرہ کے دیگر افراد کی طرح حسن سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:۔ اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فاعینوهم (بخاری کتاب العتق باب

قول النبی العبید اخوانکم فاطعموھم مما یاکلون) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ خدا نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے تو جس کے تحت بھائی بہن کو اللہ اس کے ماتحت کر دے اس کو چاہیئے کہ جیسا وہ خود کھاتا ہے، ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے۔ اپنے غلاموں کو ایسا کام نہ دے جو ان کی طاقت سے باہر ہو اور اگر کبھی ایسا کام دو تو پھر اس کام میں خود ان کی مدد کرو۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں تم کو بتاؤں کہ بدترین آدمی کون ہے۔ وہ جو تنہا کھاتا ہے، اپنے غلام کو تازیانہ لگاتا ہے۔ مگر اس کو دیتا کچھ نہیں (مشکوٰۃ باب النفقات وحق المملوک)

وسائل وحریت:۔ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے متعلق دو طریقے اختیار کئے ہیں:۔ (۱) طوعی (۲) جبری

طوعی طریقہ:۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ (البلد ۹۰: ۱۲-۱۳) اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ کسی گردن کو آزاد کرنا۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَفِى الرِّقَابِ (البقرہ ۲: ۱۷۷) لیکن بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لئے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مدد دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں (من اعتق نسمة اعتق اللہ لکل عضو منھا عضواً من النار (متفق علیہ) جو شخص کسی ایک نفس کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے دوزخ کی آگ سے آزاد کرے گا۔ حضرت براء سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہؐ! مجھے آپ کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو جنت میں داخل کر دے۔ آپ نے فرمایا تم نے لفظ تو مختصر کہے ہیں مگر بات بہت بڑی دریافت کی ہے (جنت میں داخل کرنے والا عمل یہ ہے) اعتق النسمة وفك الرقبة۔ یعنی غلام کو آزاد کرو اگر اکیلے آزاد نہ کر سکو تو دوسروں کے ساتھ مل کر آزاد کرو (بیہقی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العتیق) اس ترغیب کا یہ نتیجہ ہوا کہ صحابہ کرام کثرت سے غلام آزاد کرتے تھے

شرح بلوغ المرام میں چند صحابہ کرام کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد بیان کی گئی ہے وہ درج ذیل کی جاتی ہے۔ گو یہ فہرست یقیناً نامکمل ہے لیکن یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ صحابہ کرام غلاموں کو آزاد کرانے میں کس قدر مشتاق تھے۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۳ غلام آزاد کئے۔

۲۔ حضرت عائشہؓ نے ۶۷

۳۔ حضرت عباسؓ نے ۷۰

۴۔ حضرت حکیم بن حزامؓ نے ۱۰۰

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار

۶۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تین ہزار

۷۔ حضرت عثمان بن عفان نے بتیس صرف ایک دن میں، جو ان کی شہادت کا دن تھا۔ ویسے ان کی مجموعی تعداد بہت زیادہ ہے۔

۸۔ ذوالکلاع الحمیری نے آٹھ ہزار صرف ایک دن میں (سبل السلام شرح بلوغ المرام کتاب العتیق)

جبری طریقہ:۔ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے بعض گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ قتل خطا[1]، کفارہ ظہار[2]، کفارہ یمین[3]، روزہ توڑنے کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کی تعلیم دی ہے۔

احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی معمولی گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من لطم مملوکۃ او ضربہ فکفارتہ ان یعتقہ[4]

مکاتبت:۔ وہ جبری انتظام ہے جس سے غلام خود بخود آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس انتظام کے تحت مالک اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر غلام اس کے پاس رہنا پسند نہیں کرتا تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے مناسب رقم پیدا کرنے کی شرط کر کے آزادی حاصل کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ[5]

اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انہیں دو۔ اگر ایک غلام کی ملکیت میں کئی آدمی شریک ہوں تو ایک شخص اپنا حصہ آزاد کرتا ہے۔ تو اس صورت میں صرف وہ حصہ ہی نہیں بلکہ پورا غلام آزاد ہو جائے گا۔ اگر آزاد کرنے والا شخص مالدار ہے تو اس پہ دوسرے شرکاء کے حصوں کو آزاد کرنا ضروری ہے ورنہ غلام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسب کرکے دوسرے شرکاء کو

---

[1] النساء ۴: ۹۲ [2] المجادلہ ۵۸: ۳، ۴ [3] المائدہ ۵: ۸۹
[4] ابوداؤد [5] نور ۲۴: ۳۳

قیمت ادا کرے اور اس کے بعد وہ آزاد ہو جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔ من اعتق نصیباً او شقصاً فی مملوکٍ فخلاصہ علیہ فی مالہ ان کان لہ مال والا قوم علیہ فاستسعی بہ غیر مشقوق علیہ (ابوداؤد باب فی العتق علی الشروط) جس شخص نے کسی مشترک غلام میں اپنا حصہ آزاد کر دیا۔ پس اگر وہ مالدار ہے تو اس پر واجب ہے کہ اپنے شرکاء کے حصوں کے بقدر مال ادا کر کے اس کو آزاد کرے ورنہ اس کی قیمت مقرر کر لی جائے اور اس غلام سے بغیر کسی سخت محنت مشقت کے اس سے سعی و کسب کرایا جائے۔

غلاموں کی آزادی کے لئے بیت المال میں حصہ :۔ اسلام نے صرف آزاد کرنے کی ترغیب نہیں دی بلکہ بیت المال میں غلاموں کی آزادی کے لئے ایک مستقل حد مقرر کر دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے :۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ (التوبہ ۹: ۶۰) زکوٰۃ صرف ناداروں کے لئے ہے اور مسکینوں اور ان کے کارکنوں کے لئے اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے قرض داروں کے لئے اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اس آیت میں ایک اسلامی حکومت پر یہ فرض ٹھہرایا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال میں سے ایک حصہ غلاموں کے آزاد کرنے میں صرف کرے۔

ہمیشہ کے لئے غلامی کو ختم کرنے کی تعلیم : اسلام سے قبل غلام بنانے کے دو طریقے تھے :۔

اوّل :۔ جنگ کے دوران میں فاتح قوم مفتوح قوم کے مرد و زن کو غلام بنا کر ان کی متاع آزادی کو ہمیشہ کے لئے سلب کر لیتی۔

دوم :۔ جنگ نہ ہو۔ تب مختلف حربوں سے طاقتور کمزوروں کی آزادی کو چھین لیتے تھے۔ مثلاً چوری چھپے یا علانیہ ڈاکہ ڈال کر مرد و زن کو لے بھاگنا یا چھین لینا یا خرید لینا۔

اسلام نے نسل انسانی کو غلام بنانے کے تمام طریقوں سے نجات دلائی اور غلامی کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

طریقہ دوم یعنی طاقتور کا کمزور لوگوں کو چوری چھپے
غلام بنانا حرام فعل ہے یا علانیہ ڈاکہ ڈال کر یا خرید و فروخت کے ذریعہ غلام

بنا لینے کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے: عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ تعالیٰ ثلاثۃ انا اخصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرًّا فاکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرًا فاستوفی منہ ولم یعط اجرہ [1]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن سے قیامت کے دن جھگڑوں گا۔

اوّل:۔ وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر اس عہد کو توڑتا ہے۔

دوم:۔ وہ شخص جو کسی کو آزاد شخص کو غلام بناتا ہے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھا جاتا ہے۔

سوم:۔ وہ جو کسی شخص کو کام پر لگاتا ہے اور پھر اس سے کام تو پورا لے لیتا ہے مگر اس کی مزدوری نہیں دیتا۔

دوسری روایت یوں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ نے روایت کی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ہیں جن کی نماز قبول نہ کی جائے گی اور میں ان سے قیامت کے دن لڑوں گا۔

اوّل:۔ وہ شخص جو میرا واسطہ دے کر کسی سے کوئی عہد باندھتا ہے اور پھر بدعہدی کرتا ہے۔

دوم:۔ وہ جو اسے غلام بناتا ہے۔ جسے خدا نے آزاد رکھا ہے۔

سوم:۔ وہ جو مزدور سے تو پورا کام لیتا ہے اور پھر اس کی مزدوری نہیں دیتا [2]

قرآن مجید میں بھی چوری چھپے یا علانیہ ڈاکہ ڈال کر کسی کو آزادی سے محروم کر دینا ناجائز قرار دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ [3] ایک نبی کے لئے شایان نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں جنگ کر کے غالب نہ آئے تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ تمہارے

---

[1] بخاری کتاب البیع [2] ابوداؤد بروایت فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۳۴۲ [3] الانفال ۸: ۶۷

لئے آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے اور اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو تم کو اس بارے میں جو تم کرنے لگے تھے۔ بھاری عذاب پہنچ کر رہتا۔

ہجرت کے بعد جب کفار مکہ مسلمانوں کی تباہی کے منصوبے تیار کرنے لگے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی جماعت بھیجی۔ انہیں کفار مکہ کے تین آدمی مل گئے جن پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور ایک کو قتل کیا اور دو کو گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حملہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، مقتول کا تو خون بہا ادا کیا، اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس طرح جب مسلمان جنگِ بدر کے لئے نکلے تو اسلامی فوج میں بعض مسلمانوں کا خیال ہوا کہ فوج سے نبرد آزما ہونے کی بجائے قافلہ پر حملہ کر دیا جائے۔ ان وجوہ کی بناء پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ سوائے جنگ کے اور کسی طریقے سے قیدی نہیں بنا سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے جنگ کے سوا دوسرے طریقوں کے ذریعے غلام بنانے کو "عرض الدنیا" کے الفاظ سے پکارا ہے اور "لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذ تم فیہ عذاب عظیم" کے الفاظ میں تنبیہہ کی ہے کہ اب وہ زمانہ گذر چکا ہے کہ جب طاقتور محض دنیاوی اغراض کے لئے آزاد انسانوں کو متاع حریت سے محروم کر دیتے تھے۔ جنگ کے سوا اور کسی طریقے سے قیدی بنانا عذاب عظیم کا موجب ہے۔

پس ان آیات میں جنگ کے ذریعہ کمزور قوموں کو غلام بنانے کے طریقہ کو ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیا ہے۔ اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر جنگ چھڑ جائے اور جنگ میں قیدی پکڑے جائیں کیا وہ ہمیشہ کے لئے اپنی متاع آزادی سے محروم ہو جائیں گے اور فاتح قوم کے غلام بن جائیں گے۔

اسلام نے اس کا جواب نہایت ہی عمدہ پیرائے میں دیا ہے۔ جس سے رسم غلامی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا۝

سو جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو گردنیں مارنا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آجاؤ تو قید میں مضبوط باندھ لو پھر بعد میں یا تو احسان کے طریق پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

---

۱۵ محمد

اس آیت کریمہ میں قیدیوں کے متعلق واضح حکم دے دیا کہ یہ قید عارضی ہوگی جب جنگ ختم ہو جائے گی یا تو ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ہوگا یا احسان کے طور پر۔

احسان کو مقدم رکھا ہے جس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیئے۔

اس آیت نے قطعی فیصلہ دے دیا ہے کہ جنگی قیدی محض عارضی قیدی ہیں۔ جنگ کے اختتام پر ان کا چھوڑ دینا ضروری ہے۔

متذکرہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ کے سوا غلام بنانا مستوجب عذاب عظیم ہے۔ اگر دفع شر کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو اگر جنگ میں قیدی پکڑے جائیں تو ان کی قید عارضی ہوگی۔ اختتام جنگ پر یا ان قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینا ہوگا یا فدیہ لے کر۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

جب اسلامی غزوات پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ بات کھل سامنے آجاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کو یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دیا یا فدیہ لے کر۔

غزوہ بدر میں جتنے قیدی ہاتھ آئے بعض سے معاوضہ لے کر اور بعض کو بغیر معاوضہ کے رہا کر دیا۔ جن قیدیوں کو بلا معاوضہ رہائی دی گئی تھی۔ ان میں سے ابوعزہ عمر والجمحی بھی تھا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ نظمیں لکھا کرتا تھا۔

غزوہ حنین میں چھ ہزار قیدی رہا کئے تھے۔ غزوہ بنی المصطلق میں چھ سو قیدی گرفتار ہوئے اور سب کو دفعتاً آزاد کر دیا گیا۔

فتح مکہ کے وقت ان تمام کفار کو جو آپ کے جانی دشمن تھے اور مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے مدینہ پر کئی مرتبہ حملہ کر چکے تھے۔ لا تثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دیا۔ انہی میں سے ہندہ بھی تھیں۔ جس نے حضرت حمزہ رضؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ رضؓ، عبداللہ رضؓ بن ابی سرح، اور کعب بن زہیر بھی جو اسلام دشمنی میں سرخیل کفار تھے معاف کر دیئے گئے۔

غزوہ طائف میں جتنے قیدی آپ کے پاس آئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابن عباس کے الفاظ یہ ہیں: اعتق صلی اللہ علیہ وسلم یوم الطائف کل من خرج الیہ من رقیق المشرکین۔

یعنی طائف کے دن مشرکوں کے جتنے غلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ نے سب کو آزاد کر دیا اور پس اسلام کی اس تعلیم نے غلامی کی رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا

اور ان تمام طریقوں کو کلیتہً بند کر دیا۔ جن کے ذریعہ غلام بنائے جا سکتے تھے۔

آزاد شدہ غلاموں کا اسلامی سوسائٹی میں مقام

اسلامی سوسائٹی میں آزاد شدہ غلام ویسے ہی معزز و مکرم سمجھے جاتے تھے جیسے دوسرے آزاد شہری اور ان کو وہی حقوق حاصل تھے جو دوسروں کو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید رضؓ بن حارثہ اور ان کے بیٹے اسامہؓ کو جنگی مہموں میں سپہ سالار مقرر کیا اور جلیل القدر اور صاحب عزت صحابیوں کو ان کے ماتحت رکھا۔ اس سے بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن زینبؓ بنت جحش کو حضرت زیدؓ کے نکاح میں دے دیا۔ سالمؓ بن معقل مولی ابی حذیفہ جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ان چار قاریوں میں شمار ہوتے ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی تعلیم کے لئے مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت بلالؓ کو ہمیشہ "سیدنا" کے لفظ سے پکارا کرتے تھے۔

غلاموں کو یک لخت کیوں آزاد نہ کیا گیا

مقبوضہ غلاموں کی تدریج آزادی حکمت بالغہ پر مبنی ہے۔ فوری آزادی صرف آقاؤں کے لئے ہی باعث مضرت نہ تھی بلکہ غلاموں کے لئے بھی نقصان دہ تھی اور سوسائٹی کے تمدن اور اخلاق کے لئے تباہ کن تھی۔ وہ لوگ جو پشتوں سے غلاموں کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے تھے ان میں نہ صرف آزادی کی روح ہی فوت ہو چکی تھی بلکہ ان کے قوائے عملیہ بھی مضمحل ہو چکے تھے اگر ان کو خالی ہاتھ رہا کر دیا جاتا تو لاکھوں مرد و زن بے خانماں ملک میں پھرتے۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہوتا۔ نتیجہ یہ نکلتا یا تو وہ گداگری کی زندگی بسر کرتے یا ڈاکہ زنی سے بسر اوقات کرتے۔ اس طرح ملک کا تمدن اور اخلاق تہ و بالا ہو جاتا۔ ان قباحتوں سے بچنے کے لئے غلاموں کی اصلاح اور انسداد غلامی کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔

۱۔ فوری اصلاح ۲۔ بتدریج اصلاح ۳۔ مستقل غلامی کا خاتمہ

فوری اصلاح یہ کہ غلام کے مرتبہ کو بلند کر دیا۔ آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ جو وہ کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں جو خود پہنیں وہی غلاموں کو پہنائیں ان کی بساط سے بڑھ کر کام نہ دیں اگر وہ کام میں مشقت محسوس کریں تو ان کا ہاتھ بٹائیں۔ آقا اور غلام کے درمیان ایک کامل اخوت قائم کر دی۔ وہ پستی جو غلامی کی وجہ سے غلاموں کی روح میں رچی ہوئی تھی رفعت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کے باعزت رکن سمجھنے لگے۔

دوسری اصلاح بتدریج تھی یعنی جیسے جیسے غلام سوسائٹی کے مفید رکن بنتے چلے جائیں ان کو مکاتبت کے ذریعہ یا گورنمنٹ کے خزانے سے یا عوام کی جیبوں سے آزادی بخشی جائے۔ قرآن اور حدیث دونوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ [1]

اور جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ان میں سے جو آزادی کی تحریر مانگیں تو انہیں لکھ دو۔ اگر تم ان میں بھلائی جانتے ہو اور ان کو اللہ کے مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں یحییٰ بن کثیر روایت بیان کرتے ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکاتبوان علمتم فیھم خیرا قال ان علمتم فیھم حرفۃ ولا تر سلوھم کلا علی الناس [2] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جو قرآن شریف میں آتا ہے کہ "اگر تم غلاموں میں بھلائی پاؤ تو ان سے مکاتبت کرو۔ بھلائی سے مراد پیشہ وغیرہ کی اہلیت ہے اور فرمایا تم ان کو ایسی حالت میں مت چھوڑو کہ وہ لوگوں پر بوجھ ہوں۔

حضرت ابوذر رض فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ای الرقاب افضل۔ یعنی آزاد کرنے کے لئے کون سا غلام سب سے افضل ہے۔ فرمایا جو سب سے زیادہ گراں قیمت ہو اور مالک کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قدر ہو

ان الفاظ میں غلاموں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مفید اور قیمتی فرد بنائیں، تاکہ ان کی آزادی کے لئے راہ ہموار ہو سکے کیونکہ آزادی کا سب سے پہلے وہی غلام مستحق ہے جو مفید ہو۔

اسلامی بیت المال میں غلاموں کے لیے ایک مد مقرر کر دی تاکہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ ماوردی لکھتے ہیں:

"زکوٰۃ میں پانچواں حصہ غلاموں کا ہے۔ امام ابو حنیفہ رح اور امام شافعی کے نزدیک مکاتبین کو رقم دی جائے۔ جس سے خود کو آزاد کر لیں۔ امام مالک رح فرماتے ہیں کہ غلام خرید کر آزاد کئے جائیں [3]۔"

۲۔ اسلام نے انسانوں کو مستقل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے اور ان کی خرید و فروخت کو حرام قرار دے کر ہمیشہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

پس عہد نبوی میں غلاموں کی اصلاح اور خاتمہ اسیری کے یہی تین بہترین طریقے تھے جو اسلام نے اختیار کئے ان طریقوں سے ایک تو غلامی کی رسم ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ دوسرا سوسائٹی کا انتظام اور اخلاق بھی تباہ نہ ہوا۔

---

[1] النور ۲۴: ۳۳ [2] ابو داؤد بحوالہ تفسیر ابن کثیر زیر آیت مکاتبت
[3] الاحکام السلطانیہ ۱۸۳

دوستوں کے حقوق

انسان کا مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے جہاں اور بے شمار سوسائٹی کے افراد سے واسطہ پڑتا ہے وہاں اس کے دوست اور شناسا ہیں۔ جن کے تعاون کی ہر وقت ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے دوستوں کے حقوق و فرائض بھی بیان کر دیئے ہیں۔

معاشرتی حقوق:

اسلامی معاشرہ کا بنیادی پتھر اخوت اور امداد باہمی ہے اس وجہ سے اسلام نے ہر عمل کرنے کی تعلیم دی ہے جو اخوت کو تقویت دے اور ہر عمل سے روکا ہے جو اخوت کو مجروح کرے۔

حسن سلوک: قرآن مجید میں آتا ہے۔
وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ [1]
اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور قریبیوں کے ساتھ بھی اور یتیموں اور قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور دوستوں اور مسافر کے ساتھ بھی۔ دوسری جگہ آتا ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ

[1] النساء ۴: ۳۶

أُمَّهَاتُهُمْ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهَاجِرِيْنَ اِلَّا اَنْ تَفْعَلُوْا اِلٰى اَوْلِيَاۤئِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُوْرًا [1] نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجروں کی نسبت ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں۔ مگر یہ دوسری بات ہے کہ تم اپنے دوستوں سے اچھا سلوک کرو یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

ظلم سے اجتناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوستوں اور بھائیوں پر ظلم وستم سے منع کرتے ہوئے فرمایا جس کسی نے اپنے بھائی دوست کی عزت یا کسی اور چیز کے بارے میں ظلم کیا ہو۔ اسے چاہیئے کہ آج اس سے معاف کرا لے قبل اس کے کہ اس کے پاس درہم و دینار نہ رہیں اگر اس کا کوئی عمل نیک ہوگا تو اس میں سے بقدر اس کے ظلم کے لیے لیا جائے گا۔ اگر اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں نہ ہوں گی تو اس مظلوم کی بدیاں اس کے ذمہ ڈال دی جائیں گی [2]

ترکِ ملاقات سے ممانعت حدیث میں آتا ہے حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی (دوست) سے کسی ناراضی کی وجہ تین دن سے زیادہ ترک ملاقات کرے دونوں ایک راستہ میں ملیں تو ایک ادھر منہ موڑ کر چلا جائے اور دوسرا ادھر اور دونوں میں بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے [3]

حضرت ابو خراش سُلمی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلعم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ جس نے ایک سال تک اپنے بھائی (دوست) سے ترک ملاقات کی تو گویا اس نے اسے قتل کر ڈالا ہے [4]

ایثار قرآن مجید میں آتا ہے: يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ [5] اور وہ اپنے آپ پر دوستوں کو مقدم رکھتے ہیں گو انہیں تنگی ہو۔

---

[1] الاحزاب ۳۳ [2] صحیح بخاری کتاب المظالم [3] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۷ [4] ابوداؤد [5] حشر ۵۹: ۹۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلعم نے بنی نضیر کے مال مہاجرین میں تقسیم کر دئے۔ اور انصار میں سے صرف تین کو حصّہ دیا۔ ایک ابو دجانہ دوسرے سماک بن خرشہ اور تیسرے سہل بن حنیف پھر انصار سے فرمایا۔ تم چاہو تو مہاجرین کو اپنے مالوں اور مکانوں سے حصہ دے دو۔ اور اس غنیمت میں شریک ہو جاؤ اور چاہو تو تمہارے مال تمہارے پاس ہی رہیں اور مال غنیمت میں سے تمہیں کچھ نہ دیا جائے۔ انصار نے عرض کیا کہ آپ ہمارے مال اور ہمارے گھر انہیں تقسیم کر دیجئے۔ اور ہم مال غنیمت میں بھی انہیں ترجیح دیتے ہیں اور اس میں شریک نہیں ہوتے [۱]

تعارف حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا جب ایک شخص دوسرے شخص سے دوستی کرے تو چاہیئے کہ اس کا اور اس کے باپ کا نام پوچھ لے اور دریافت کر لے کہ کن لوگوں میں سے ہے کیونکہ یہ بات دوستی کو زیادہ تقویت دیتی ہے [۲]

بدظنی سے ممانعت بدظنی رشتہ مودت کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اس وجہ سے قرآن مجید اور حدیث میں بدظنی کرنے سے روکا ہے عموماً دو دوستوں کے درمیان بدظنی ہی لڑائی کا موجب ہوتی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ [۳]
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو گمان بد کرنے سے بچو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں ایاکم والظن فان الظن اکذب الاحادیث [۴] بدگمانی سے بچو اس لیے بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

سفارش اسلام کسی صاحب اختیار کے پاس جائز کام کے لیے کسی ضرورت مند کی سفارش کو مستحسن سمجھتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے
وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا [۵] جو کوئی بھلی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا اور جو کوئی بری بات کی سفارش کرے اس کو اس سے حصہ ملے گا۔

مذاق اڑانے سے پرہیز عموماً دوستوں کے درمیان لڑائی ایک دوسرے کا مذاق اڑانے سے ہو جاتی ہے۔ دوستی کے رشتہ کو مضبوط رکھنے

---

۱ بخاری ۲ ترمذی ۳ الحجرات ۴۹ : ۱۲ ۴ مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۷
۵ نساء ۴ : ۸۵

کے لیے اسلام نے مذاق اڑانے سے منع کردیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ[1]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔

دوستوں کے بعض حقوق و فرائض عام حقوق سے مشترک ہیں ان کا ذکر مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض کے عنوان کے تحت آئے گا۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض

معاشرتی حقوق

اخوت و وحدت اسلام سے قبل تمام عرب معاشرہ افتراق و انتشار کا شعار تھا۔ معمولی سی بات پر جنگ چھڑ جاتی تو ایک طویل سلسلہ اختیار کر لیتی پشتہا پشت اس لڑائی کی آگ میں جھلتی رہتیں۔ اگر کسی ایک خاندان کا آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کے بیٹے انتقام لینے کے درپے ہو جاتے اگر وہ نہ لے سکتے۔ تو ان کے بیٹے علیٰ ہٰذا القیاس جب تک بدلہ لے لیا نہ جاتا اس وقت تک ان کے خون میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ان لڑائیوں کو مورخین ایام العرب کے نام سے پکارتے ہیں قرآن مجید میں عربوں کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ارشادِ الٰہی ہے: وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا[2] تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسلام آیا اس نے ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو دینی اخوت کی لڑائی میں منسلک کر دیا قرآن مجید میں آتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ[3] مومن بھائی بھائی ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ[4] اور اس نے ان کے (مومنوں) دلوں میں الفت ڈالی۔ اگر تو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر دیتا تو ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتا لیکن اللہ نے ان میں الفت ڈال دی وہ غالب حکمت والا ہے۔

---

[1] الحجرات ۴۹: ۱۱ [2] آل عمران ۳: ۱۰۳ [3] الحجرات ۴۹: ۱۰ [4] انفال ۸: ۶۳

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ؕ[1]
اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔
تفرقہ اور انتشار سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ[2] اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو اگر ایسا کروگے تو تمہاری طاقت سست پڑجائے گی اور ہوا اکھڑ جائے گی۔
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ[3] اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آچکی تھیں۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا[4] تم اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی اخوت کو تمثیل کے رنگ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا۔
ترى المؤمنين في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد اذا اشتكى عضو تداعى له سائر جسده بالسهر والحمى۔[5] مسلمانوں کے ایک دوسرے سے محبت کرنے رحم کرنے شفقت کرنے کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جب ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہوجاتا ہے۔
المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضهم بعضا۔[6]
ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے۔ جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے۔
اختلاف اور افتراق کے بدنتائج سے ڈراتے ہوئے رسول کریم صلعم نے فرمایا۔
انما اهلك من كان قبلكم الاختلاف۔[7]
اگلے لوگوں کو اختلاف نے ہلاک کر دیا۔ اسلام کے اس درس اخوت کا اقرار غیر مذاہب کے فاضل علماء نے بھی کیا۔ ہندو فاضل بابو بپن چندر پال

---

[1] آل عمران ۳: ۱۰۲ [2] الانفال ۸: ۴۶ [3] آل عمران ۳: ۱۰۵
[4] بخاری [5] مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب تراحم المؤمنین
[6] مسلم باب تراحم المؤمنین [7] کنوز الحقائق حرف الہمزۃ

لکھتا ہے۔

"اسلام نے اخوت اور برادرانہ روابط پر جس قدر زور دیا۔ اور وہ جس قدر شد و مد سے اس پر عمل پیرا ہوا۔ اس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا رواج موجود نہیں یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی ہی تھی جس نے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی مذہبی زندگی اور خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا" [۱]

شری راج وید پنڈت گدا دھر پرشاد شرما رئیس اعظم الہ آباد لکھتے ہیں۔

"..... اور میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میری رائے میں جس مذہب کو اخوت باہمی اخلاق و تہذیب اور دولت اتحاد کی فراوانی کثرت کے ساتھ عطا کی گئی ہے وہ مذاہب کا سردار "اسلام" ہے [۲]

مسٹر کے سکا مارن بی۔ اے اچھوتوں کے لیڈر رقم طراز ہیں۔

"میرے خیال میں دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہم کو نجات دے سکتا ہے اور اس کی آغوش میں ہم سیاسی، معاشرتی و مذہبی رخصت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں اخوت و مساوات اور عملی ہمدردی اس قدر بلند درجہ پر پہنچ گئی ہو۔ جیسی کہ اسلام میں ہے"۔ [۳]

حقیر نہ جاننا انسان کے دل میں دوسرے کے خلاف حقارت اور نفرت تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ تکبر ایسا مرض ہے جس سے سوسائٹی کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس سے طبقاتی جنگ ہوتی ہے۔ جو قوموں اور ملکوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ تکبر کی وجہ سے شیطان راندہ درگاہ الٰہی ہوا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ [۴] اور لوگوں سے گال نہ پھلاؤ اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل۔ اللہ کسی خود پسند شیخی خورہ کو پسند نہیں کرتا۔

---

[۱] رسالہ نور قادیان۔ [۲] رسالہ مولوی رسول نمبر ۱۳۴۵ھ [۳] الامان دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۳۱ء۔ [۴] لقمان ۳۱: ۱۸

عیب نہ لگانا اور برے لقب سے نہ پکارنا

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ؎ اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو ایمان کے بعد برا نام کیا ہی برا ہے۔

حدیث میں آتا ہے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ کسی سفر میں حضرت صفیہ رضؓ کا اونٹ بیمار ہو گیا اور حضرت زینب رضؓ کے پاس ایک فالتو اونٹ تھا تو حضورؐ نے زینب رضؓ سے فرمایا کہ صفیہ رضؓ کو اپنا اونٹ دے۔ زینب رضؓ نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دے دوں؟ اس پر رسول کریم صلعم کو بہت غصہ آیا اور آپ نے ذی الحج محرم اور صفر کے کچھ دنوں تک زینب کو چھوڑ دیا (ابو داؤد)

انسان ضعیف ہے۔ اس سے ہر دم لغزشیں ہونے کا امکان ہے اس وجہ سے اسلام مسلمان بھائی کے گناہوں کی تلاش میں لگے رہنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ مسلمان بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے وَلَا تَجَسَّسُوْا ؎ اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگے رہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کے عیوب تجسس نہ کرو جو شخص ان کی برائیوں کی تلاش میں رہے گا تو اللہ اس کے عیوب کا تجسس کرے گا اور جس کے عیوب کا اللہ تجسس کرے گا اس کو اس کے گھر کے اندر رسوا کرے گا۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ)۔

غیبت کرنا

غیبت کے معنی ہیں کسی کی عدم موجودگی میں وہ بات کرنا اگر وہ اس شخص کے سامنے کی جائے تو اس کو سن کر تکلیف ہو۔ قرآن مجید نے غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؎

اور نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا کہو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم اس سے کراہت کرتے ہو۔

؎ الحجرات ۴۹ : ۱۱ ؎ الحجرات ۴۹ : ۱۲ - ؎ الحجرات ۴۹ : ۱۲

رسول کریم صلعم نے فرمایا۔ لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کیا چیز ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تمہارا اپنے بھائی کو ایسی بات سے یاد کرنا جو اسے اچھی نہ لگے کسی نے عرض کیا اگر میرے بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہتا ہوں۔ تو پھر آپ کیا فرماتے ہیں آپ نے فرمایا اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہے جو تو کہتا ہے تو تو نے اس غیبت کی اور اگر وہ بات اس میں نہیں جو تو کہتا ہے تو تو نے اس پر بہتان باندھا[1]

فرمایا: غیبت زنا سے بڑھ کر ہے کیونکہ آدمی زنا کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ زانی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو نہیں بخشتا جب تک وہ شخص نہ بخشے جس کی غیبت کی ہے۔ اور حضرت انس رضی سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا زانی توبہ کرتا ہے اور غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں[2]

صلح کرانا معاشرہ میں مفادات کے تصادم کی وجہ سے لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ اگر دو مسلمان بھائیوں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیئے۔ تاکہ سوسائٹی میں افتراق اور انتشار نہ پیدا ہو۔

ارشاد الٰہی ہے:۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا[3] اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔

سلام کرنا اسلام نے دو مسلمانوں کو ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنے کا حکم دیا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ تم پر سلامتی ہو۔ یہ حکم مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کا کام سوسائٹی میں امن و سلامتی برقرار رکھنا ہے۔ اسلام بھی اس دنیا میں سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ[4] اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری باتوں پر ایمان لائے ہیں۔ تو کہہ تم پر سلامتی ہو۔

---

[1] مسلم [2] مشکوٰۃ۔ [3] الحجرات ۴۹ : ۹ [4] الانعام ۶ : ۵۴

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یایھا الناس افشوا السلام و اطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام [1]

اے لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سوئے ہوئے ہوں تو نماز پڑھو تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

سلام کرنے کے لیے شناسا اور انجان کی کوئی تخصیص نہیں [2]

سلام کرنے کے اصول بیان کرتے ہوئے رسول کریم صلعم نے فرمایا۔

چھوٹا بڑے کو گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے [3]

جس شخص کو سلام کیا جائے تو اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے یا اس سے بہتر طریقہ سے جواب دے۔ [4]

ارشاد ہے: وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا

اور جب تمہیں کوئی سلام کرے تو تم اس کو اس سے بہتر طریقے پر جواب دو یا انہیں الفاظ میں جواب دو۔

السلام علیکم کا بہترین الفاظ میں جواب وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہے۔

نماز جنازہ پڑھنا جب کوئی مسلمان بھائی مر جائے تو دوسرے مسلمانوں پر نماز جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ اگر نماز جنازہ میں کوئی آدمی بھی شریک نہ ہو۔ تو اس بستی کے تمام رہنے والے گناہ گار ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ [5]

اور ان کے لیے دعا کر کیونکہ تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے۔

رسول کریم صلعم نے فرمایا جس نے ایمان و اخلاص سے کسی مسلمان کے جنازے میں شرکت کی۔ اور نماز اور دفن تک برابر شریک رہا تو اس کو دو قیراط اجر ملے گا [6]

ترمذی میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے جنازہ میں شرکت کی اور تین بار جنازہ کو کندھا دیا تو اس نے اپنا حق ادا کر دیا [7]

---

[1] ترمذی باب ماجاء فی افشاء السلام [2] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ [3] بخاری کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی [4] نساء ۴: ۸۶ [5] توبہ ۹: ۱۰۳ [6] بخاری جلد اول کتاب الایمان باب اتباع الجنائز [7] ترمذی۔

مدد کرنا قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ[1]
اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی دوست مددگار ہیں۔

حضرت سالم رضؓ سے روایت ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو دشمن کے حوالے کرے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کی کسی مشکل کو آسان اور اس کی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مشکل آسان کر دے گا[2]

عیادت کرنا مسلم میں ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی بیمار پرسی کے لیے جاتا ہے تو جب تک واپس نہ آجائے جنت کے راستہ پر گامزن رہتا ہے[3]

جب کوئی صبح کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں[4]

صحیح مشورہ دینا رسول کریم صلعم فرماتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دینا چاہیے[5]

دعوت قبول کرنا دعوت سے محبت اور تعلقات بڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے رسول کریم صلعم نے دعوت قبول کرنے کو مسلمان پر ایک حق قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں

ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ سلام کرنا، سلام کا جواب دینا۔ جب وہ چھینکے تو یرحمکم اللہ کہنا، دعوت قبول کرنا، اس کی عیادت کرنا، اس کے جنازہ میں شریک ہونا[6]

تکفیر سے اجتناب مسلمانوں کی تباہی کا ایک سبب کفر بازی ہے۔ حالانکہ اسلام نے سختی سے ایک دوسرے کو کافر کہنے سے منع کیا ہے۔ جب سے مسلمانوں نے اسلام کے اس حکم کو توڑا ہے۔ ان پر ذلت اور مسکنت غالب آگئی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا[7]
جو تمہیں سلام علیکم کہے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔

---

[1] التوبہ ۹: ۷۱ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب المواخاۃ [3] مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب [4] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز۔ [5] مسلم کتاب السلام باب من حق المسلم للمسلم والسلام [6] مسلم کتاب السلام باب من حق المسلم للمسلم والسلام
[7] نساء ۴: ۹۴ -

رسول کریم صلعم نے فرمایا۔ جب کوئی مسلمان بھائی اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہتا ہے تو کفر ان دونوں میں سے کسی ایک پر لوٹ آتا ہے[1] یعنی جس کے متعلق کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے۔ اس میں کفر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تو فتویٰ لگانے والا خود کفر کا مرتکب ہوتا ہے

آئینی حقوق

جان، مال و آبرو کی حفاظت

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا[2] جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے بدلہ کے یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی زندہ رکھے تو گویا اس نے سب کو زندہ رکھا۔

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خَالِدًا فِیْہَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا[3] اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ اسی میں رہے گا اور اللہ اس پر ناخوش ہے۔ اور اس پر لعنت کرتا ہے۔ اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کرے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔ یَّوْمَ تَشْہَدُ عَلَیْہِمْ اَلْسِنَتُہُمْ وَاَیْدِیْہِمْ وَاَرْجُلُہُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ[4] جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ہٰذَا[5]

تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کفر اخاہ۔ [2] المائدہ ۵ : ۳۲ [3] نساء ۴ : ۹۳ [4] النور ۲۳ : ۲۴ [5] بخاری کتاب الحج۔

دن کی حرمت ہے یعنی حج کے دن کی۔

بے جا حمایت نہ کرنا سوسائٹی میں بے جا حمایت کی وجہ سے ظلم بڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے بے جا حمایت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا الْقُرْبَىٰ ؕ[1]

اور جب کہو تو انصاف اور عدل سے کہو اگرچہ قریبی ہو۔

اخلاقی حقوق

نیکی کا حکم دینا جس طرح انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی روحانی حالت کو درست کرے اسی طرح اس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی روحانی حالت کو سدھارتا رہے اور اس کو نیکی کرنے کی ترغیب دے اور برائیوں سے روکے۔

ارشادِ الٰہی ہے: يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[2]

وہ (مسلمان) اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ[3]

اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روک۔

اچھی بات کہنا ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے نرم لہجہ اور محبت بھرے انداز میں گفتگو کرے اس سے باہمی محبت اور الفت اور ہمدردی بڑھتی ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ کہ اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۔[4]

اور لوگوں سے اچھی دل لگتی بات کہو۔

دعا کرنا وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ؕ[5]

اور اپنے قصور کے لیے حفاظت مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے۔

---

[1] الانعام ۶: ۱۵۳ [2] التوبہ ۹: ۷۱ [3] لقمان ۳۱: ۱۷ [4] البقرہ ۲: ۸۳ [5] محمد ۴۷: ۱۹

عام انسانوں کے حقوق

ماضی اور حال میں ہر مفکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ دنیا میں عدم توازن اور بدامنی صرف انسانی حقوق متعین نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہر مفکر نے اپنی ذہنی استعدادوں کو بروئے کار لاکر انسانی حقوق کا چارٹر مرتب کیا ہے کہ دورِ حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کے ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ انگلستان میں کنگ جان نے ۱۲۱۵ء میں میگنا کارٹا جاری کیا تھا۔ وہ درحقیقت امراء کے دباؤ کی وجہ سے مرتب کیا گیا تھا۔ وہ صرف بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد سی تھی۔ اس میں امراء کے حقوق کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ عوام الناس کے حقوق کی اس میں کوئی نشان دہی نہ کی گئی تھی۔

ٹام پین (Tom Pain) (۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۹ء) نے حقوق انسانی پر ۱۷۹۱ء میں ایک پمفلٹ مرتب کیا۔ اسی پمفلٹ نے مغربی ممالک میں حقوق انسانی کے تصور کو اشاعت دی۔

۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس کے عہد میں "منشور حقوق انسانی" مرتب ہوا۔ جو روسو کے نظریہ معاہدہ عمرانی کا ثمرہ تھا۔

بگوٹا کانفرنس میں امریکی ریاستوں نے ۱۹۴۸ء میں انسانی حقوق و فرائض کا ایک منشور مرتب کیا۔

دو عالمگیر جنگوں کی تباہیوں نے بیسویں صدی کے انسان کو یہ امر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسانوں کے حقوق متعین کیے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا چنانچہ ۱۹۴۱ء کے اٹلانٹک چارٹر اور واشنگٹن، ماسکو، ڈمبارٹن اوکس کے مذاکرات کے بعد آخر کار سان فرانسسکو کے چارٹر کے ذریعہ ادارہ اقوام متحدہ کی اساس رکھی گئی۔ اور حقوق انسانی کو ایک بین الاقوامی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء سے لیک سیکسس میں مسز فرینکلن روز ویلٹ کی زیر صدارت متعدد اجلاس ہوئے اور ایک چارٹر مرتب کیا گیا۔ جسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے آخری شکل دے کر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو عالمی اعلان حقوق انسانی کا نام دے کر منظور کیا اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہر سال ۱۰ دسمبر کو دنیا کے ہر

ملک میں یوم حقوق انسانی منایا جاتا ہے۔

یو۔این۔او کے اعلان کے تیس آرٹیکل ہیں۔ آرٹیکل ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ تو محض رسمی ہیں۔ بارہ آرٹیکل اقتصادی اور سماجی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔ تین قانون کے ضابطوں اور ملزم کے حقوق کے متعلق ہیں۔ صرف بارہ ایسے آرٹیکل ہیں۔ جو انسانی حقوق کے اصول بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے پانچ ایسے ضروری جزو ہیں۔ جن کا ذکر کرنا مناسب ہے۔

آرٹیکل نمبر۱: انسان آزاد پیدا کیے گئے ہیں۔ اور اپنے رتبہ اور حقوق میں مساوی ہیں۔

آرٹیکل نمبر۲: ہر انسان کو وہ آزادیاں اور حقوق مکمل طور پر حاصل ہیں۔ جو اس اعلان میں بیان کئے گئے ہیں۔ مذہب، رنگ، نسل، جنس، زبان، نشست جائیداد یا رتبہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

آرٹیکل نمبر۳۔ ہر شخص کو زندہ رہنے اور آزادی اور حفاظت کا حق حاصل ہے۔

آرٹیکل نمبر۴۔ کسی کو غلامی میں نہیں رکھا جائے گا۔ ہر قسم کی غلامی اور غلاموں کی تجارت قطعاً ممنوع ہے۔

آرٹیکل نمبر۵: کسی شخص کو اذیت نہیں دی جائے گی۔ نہ اس کے ساتھ بے رحمی کا یا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔ نہ کوئی ایسی سزا دی جائے گی۔

یہ وہ منشور ہے جسے دورِ حاضر کے تمام مدبرین نے مل کر مرتب کیا۔ اس منشور کا عملی پہلو بہت ہی تاریک ہے۔ اقوام متحدہ اس منشور پر عمل نہیں کرا سکی۔ ہر ملک میں انسانی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ کشمیر عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستان کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ بھارت میں جو مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں۔ ان کو پڑھ سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہ آیا مسلمان انسانوں کی حکومت میں زندگی بسر کر رہے ہیں یا درندوں کی کچھاروں میں رہ رہے ہیں۔

اسرائیل انسانی حقوق کی پامالی میں سب سے سبقت لے گیا ہے۔ آئے دن عرب اسرائیلی مقبوضات سے بے خانماں اور بے آسرا کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ دربدر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ اور کوئی طاقت اسرائیل کے ہاتھ کو ظلم کرنے سے نہیں روکتی۔ سب تماشائی بن کر دیکھ رہی ہیں۔

قبرص میں مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ کس طرح عیسائی مسلمانوں پر ظلم ستم ڈھا رہے ہیں۔

افریقہ میں اری ٹریا (Eriteria) کے مسلمانوں کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔

روڈیشیا۔ جنوب مغربی افریقہ اور جنوبی افریقہ کی رنگ دار قوموں کے زیر دستوں کو جائز اور بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔

ویت نام میں تو انسانی حقوق کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اسلام کا حقوق انسانی کے متعلق منشور آج سے چودہ سو سال پیشتر اسلام نے جو حقوقِ انسانی کا چارٹر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا دورِ حاضر کے تمام مدبرین مل کر بھی اس سے بہتر تیار نہیں کر سکتے۔ اسلامی چارٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے۔ کہ اس کے پیش کرنے والے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منشور کے ہر آرٹیکل پر فوری عمل کر کے دنیا کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا تھا۔

معاشرتی حقوق

اسلامی معاشرہ کا دائرہ پورے عالم انسانیت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اور سب کے لیے حقوق متعین کرتا ہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق عند اللہ من احسن الی عیالہ [1]

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا۔ [2]

اور انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر وہ الگ الگ ہو گئے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ [3]

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے۔

فرمانِ نبوی اور آیاتِ قرآنی سے یہ امر واضح ہے کہ اسلام کا حلقہ تمام دنیا کو اپنے

---

[1] طبرانی و بیہقی [2] یونس آیت ۱۹ [3] نساء ۴: ۱

اندر لیے ہوئے ہے۔

تکریم انسانیت اسلام کی نظر میں ہر انسان کا بچہ پیدائش کے اعتبار سے معزز اور مکرم ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ۔[۱] اور ہم نے آدمؑ کے بیٹوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔

پیدائشی حریت ہر انسان پیدائشی طور پر آزاد ہے۔ اور کوئی انسان دوسرے کو غلام اور محکوم نہیں بنا سکتا۔

ارشادِ الٰہی ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔[۲]
کسی بشر کے لیے شایاں نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے۔ پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ ان من شرار الناس الذين يبيعون الناس[۳] وہ لوگ بہت ہی برے ہیں جو آدمیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

شرار الناس الذين يشترون الناس ويبيعونهم[۴] وہ لوگ برے ہیں جو انسانوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مذكم تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا[۵] تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا ہے۔

مساوات يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ[۶]

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے اور خبردار ہے

---

۱ بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰ ۲ آل عمران ۳: ۷۹ ۳ بخاری بحوالہ کنوز الحقائق ۴ ترمذی کنوز الحقائق ۵ احسن المحاضر جلد ۲ صفحہ ۱۔ ۶ الحجرات ۴۹: ۱۳

رسول کریم صلعم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے مشہور خطبے میں فرمایا۔
ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقوی لہ۔ اے لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

اسلام نے جہاں مساوات کی پاکیزہ تعلیم دی ہے۔ وہاں اس کے عملی نمونے کے اظہار کے لیے دو عبادتیں نماز اور حج مقرر کی ہیں۔ مسجد میں نماز کے وقت اور حج کے موقع پر بلا تفریق رنگ و نسل ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں۔

ایک ہندو لیڈر سر پی۔ سی رائے لکھتا ہے۔

"اسلام مذاہب عالم میں سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہے۔ یہ بنی نوع انسان کو ٹھیک ایک سطح پر سمجھتا ہے جونہی کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے اس کا درجہ تمام مسلمانوں کے برابر ہو جاتا ہے مسجد میں شاہ و گدا امیر و غریب اور ایک ادنےٰ سے ادنےٰ مزدور اور بہشتی دوش بدوش نماز پڑھتے ہیں۔"

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبالؒ)

اسلام رنگ و نسل کا امتیاز جانتا ہی نہیں ہے

بابو بپن چندر پال لکھتا ہے۔

"اسلام نے اخوت اور برادرانہ روابط پر جس قدر زور دیا ہے اور وہ جس شد و مد سے اس پر عمل پیرا ہوا اس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا رواج موجود نہیں۔ یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی ہی تھی جس

لہ مسند احمد۔ ٹہ اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظروں میں مؤلفہ خلیفہ عبدالرحمٰن ص ۲۱۔

سنے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں مذہبی زندگی اور خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا اسلام نے سیاسی طور پر بنی نوع انسان کو ایسے حقوق عطا کئے جو رومیوں اور دیگر اقوام نے صدیوں میں بھی اپنی رعایا کو نہ دئے تھے۔ اسلام نے ٹیکس محدود کرایا۔ قانوناً سب انسانوں کو ایک دوسرے کے مساوی بنا دیا۔ حکومت خود اختیاری کے قانون رائج کیے، بادشاہوں کے اختیارات پر پابندیاں عائد کر دیں"۔ [۱]

مسٹر گنگا مارن بی۔ اے اچھوتوں کے لیڈر نے اچھوتوں کی نجات کے راستہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہم کو نجات دے سکتا ہے۔ اور اسی کی آغوش میں ہم سیاسی، معاشرتی و مذہبی رفعت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے۔ کہ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں اخوت و مساوات اور عملی ہمدردی اس قدر بلند درجہ پر پہنچ گئی ہو۔ جیسی کہ اسلام میں ہے"۔ [۲]

عدل و انصاف عدل کی حدود زندگی کے ہر شعبۃ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن یہاں صرف عدالتی عدل مراد ہے جب مدعی اور مدعا علیہ عدالت کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ تو حاکم کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ قانون کے مطابق فریقین میں فیصلہ کرے۔ خواہ وہ عدالت ملکی ہو یا بین الاقوامی۔ عدل کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے دنیا کا امن تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ [۳]

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ

جب لوگوں کا فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا الْقُرْبٰى [۴]

اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگرچہ قریبی ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ [۵]

اللہ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

---

[۱] اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظروں میں ط ۲، ۲۲ [۲] الامان دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۳۱ء [۳] النساء ۴ : ۵۸۔ [۴] الانعام ۶ : ۱۵۳
[۵] النحل ۱۶ : ۹۰ ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ [1]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو اس تعلیم کی علی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہے آپ نے فیصلہ کرتے وقت امیر و فقیر، مسلم و کافر سلطان و گدا اور چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں رکھی۔ ایک دفعہ ایک مخزومیہ خاتون نے چوری کی ایک بڑے اونچے خاندان کی عورت ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اگر اس عورت کو سزا ہو گئی تو خاندان کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ بعض صحابہ نے حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر سفارش کریں۔ چنانچہ رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ رسول کریم صلعم نے سن کر فرمایا۔ انما هلك من كان قبلكم انهم كانوا يقيمون الحد على الوضيع ويتركون الشريف والذى نفسى بيده لو فاطمة فعلت ذلك لقطعت يدها [2] تم سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ نیچ قوم کے لوگوں کو سزا دیتے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹتا۔

اسلام بنی نوع انسان کے ساتھ احسان کی تعلیم دیتا ہے۔ احسان حسن سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں رعنائی۔ خوبصورتی۔ عام اصطلاح میں احسان کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنا جس سے ان کا دل خوش ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: احسن كما احسن الله اليك تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔ [3]

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ [4]

اللہ تمہیں عدل و احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

---

[1] المائدہ ۵: ۸ [2] بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع و الشریف [3] قصص ۲۸: ۷۷ [4] النحل ۱۶: ۹۰

احسان کی تشریح کے بارہ میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ[1] اور جن کے مال میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کے لیے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ معاشرہ میں جو کوئی بھی محتاج ہو۔ یا کام کرنے کے قابل نہ رہا ہو۔ معاشرہ کی دولت میں اسکا حق ہے۔ اسلامی معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی ضروریات کو پورا کرے۔

یعنی معاشرہ کے تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنا۔

حقِ رزق اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ[2] اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا[3] ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ[4] ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ ضروریات زندگی میں روٹی کپڑا مکان وغیرہ شامل ہیں ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۸، ۱۱۹) تیرے لیے یہ ہے تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں رہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ ابن آدم کا حق سوائے ان تین چیزوں کے اور کسی شے سے وابستہ نہیں گھر جس میں وہ رہے کپڑا جس سے وہ تن ڈھانپے اور خشک روٹی اور پانی (ترمذی)

آزادیٔ سکونت قرآن مجید میں آتا ہے۔ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ[5] کہ زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ[6] جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ یقیناً تجھے وطن واپس لائے گا۔

---

[1] المعارج ٧٠: ٢٤، ٢٥ [2] الروم ٣٠: ٤٠ [3] الزخرف ٤٣: ٣٢ [4] الانعام ٦: ١٥١
[5] العنکبوت ٢٩: ٢٠ [6] القصص ٢٨: ٨٥

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں کُوْنُوْا حَیْثُ شِئْتُمْ وَبَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَا تَسْفِکُوْا دِمَاءً وَلَا تَقْطَعُوْا سَبِیْلًا وَلَا تَظْلِمُوْا اَحَدًا۔ تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان یہ شرط ہے کہ نہ تم خونریزی کرو اور نہ تم راہزنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو (نیل الاوطار جلد ۶ صہ ۱۳۹)

ہجرت کا حق قرآن مجید میں آتا ہے۔ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا؎۱ (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔؎۲

پناہ لینے کا حق ارشادِ الٰہی ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ؎۳ اور اگر ان مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو۔

محنت کا پورا پورا حق اسلامی سوسائٹی میں ہر آدمی اپنی محنت اور کسب کا ثمرہ پانے کا مستحق ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ؎۴ اور ہر نفس کو جو اس نے کیا ہے پورا دیا جائے گا۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی؎۵ اور کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو وہ کوشش کرتا ہے۔

کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِیْنٌ؎۶ ہر شخص اپنی کمائی کا ثمرہ پانے کا حقدار ہے

مذہبی آزادی کا حق ہر انسان کو اسلامی معاشرہ میں یہ حق حاصل ہے کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے ترک کر دے ارشادِ الٰہی ہے لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ؎۷ دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ؎۸

؎۱ النساء ۴: ۹۷ ؎۲ المومن ۴۰: ۶۴ ؎۳ التوبہ ۹: ۶ ؎۴ الزمر ۳۹: ۷۰ ؎۵ النجم ۵۳: ۳۹ ؎۶ الطور ۵۲: ۲۱ ؎۷ البقرہ ۲: ۲۵۶ ؎۸ الکہف ۱۸: ۲۹

اور کہہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

کسب کی آزادی فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [۱]۔ پس جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: اسعوا فان اللہ کتب علیکم السعی [۲] کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر کوشش کرنا فرض کر دیا۔

اعملوا فکل میسر لما خلق لہ [۳] عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہو۔

طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ [۴] فریضہ عبادت کے بعد حلال کمائی کا طلب کرنا بھی ایک فرض ہے۔

اسلام نے ان تمام ذرائع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ جن سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرہ ۲: ۱۸۸) اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ ——————— اسی طرح اسلام نے جہاں آزادی کسب دی ہے۔ وہاں دولت کی گردش کے لیے چند اصول بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ اگر دولت مند ان اصولوں پر کاربند نہیں رہتے تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ ان کے خلاف حالات کے تقاضا کے مطابق کاروائی کرے۔

مزدور کا حق نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا [۵]۔ ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیوی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے اور ایک دوسرے کے درجے بلند کئے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ [۶] مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

---

[۱] الجمعہ ۶۲ [۲] مسند امام احمد۔ کنوز الحقائق [۳] بخاری و مسلم [۴] کنز العمال [۵] الزخرف ۴۳: ۳۲ [۶] ابن ماجہ باب الاجارہ

فرمایا: تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا۔ اور جس سے میں جھگڑا کروں گا اس کو مغلوب و مقہور کر کے چھوڑوں گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام لے تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا [1]

مظلوم کو فریاد کا حق اسلام مظلوم کو فریاد کرنے اور ظالم سے بدلہ لینے کا حق دیتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا [2] اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ مظلوم خواہ کسی قوم و ملت کا ہو، اس کی دادرسی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (الشوریٰ ۴۲: ۴۱، ۴۲) جو کوئی اپنے اوپر ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر الزام کا راستہ نہیں۔ الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں انہی کے لیے دردناک دکھ ہے۔

عزتِ نفس کا تحفظ انسان کی ذہنی اور ترقی کے تمام سوتے عزتِ نفس سے ہی پھوٹتے ہیں اسی وجہ سے معبودانِ باطلہ کی عبادت سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ان کی عبادت سے نفس کی تباہی و بربادی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اس حق کی پوری تفصیل سورۂ حجرات میں بیان کی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ [3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے شاید وہ ان سے بہتر ہوں۔ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ [4] اور اپنے لوگوں کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کے نام نہ دھرو۔

نجی زندگی کا تحفظ: انسان کے بنیادی حقوق میں سے اہم حق اس کی نجی زندگی کا تحفظ

---

[1] بیہقی، کتاب الاجارہ [2] النساء ۴: ۱۴۸ [3] حجرات ۴۹: ۱۱ [4] الحجرات ۴۹: ۱۱

ہے اس بارہ میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا[1] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوائے دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو۔

حصول علم کا حق علم ہی شرف انسانیت کا ذریعہ ہے اور علم کی وجہ سے آدم مسجود ملائکہ بنا۔ اسلام نے ہر انسان کو حصول علم کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ رسول کریم صلعم فرماتے ہیں طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم[2] علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ[3] کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ[4] جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت اسلام میں انسان صرف اپنے اعمال کا جواب دہ ہے دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی[5] اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

مذہبی دل آزاری سے تحفظ اسلام اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کے مذہبی پیشواؤں کو برا بھلا کہا جائے۔ اسلام ہر مذاہب کے پیشوا کی عزت کرنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ دوسروں کے بتوں کو بھی برا بھلا نہ کہو۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ[6] اور ان کو گالی نہ دو جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں

کمزوروں کا تحفظ اسلام نے معاشرہ کے کمزور طبقے عورت بچے بوڑھے بیمار اور عبادت گزار طبقے کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ اسلام سے قبل ہر ملک میں معاشرہ کے کمزور طبقے کی جو قابل رحم حالت تھی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ تہذیب جدید کے اس دور میں معاشرہ کا کمزور طبقہ جس طرح پامال ہو رہا ہے۔ وہ محتاج بیان

---

[1] النور ۲۴: ۲۷ [2] مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم [3] الزمر ۳۹: ۹
[4] العلق ۹۶: ۴، ۵ [5] الانعام ۶: ۱۶۴
[6] الانعام ۶: ۱۰۸

نہیں۔ اسلام نے صرف اپنے ملک کے کمزور طبقے کے حقوق کو ہی محفوظ نہیں کیا بلکہ برسرپیکار ملک کے کمزور طبقے کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔ رسول کریم صلعم نے برسرپیکار ملک کی عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے کی صریح الفاظ میں ممانعت فرما دی ہے۔

لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا ولا صغیرا ولا امرأة[1] بوڑھوں بچوں کم عمروں اور عورتوں کو قتل نہ کرو۔

خلفائے راشدین بھی جب دشمن کے مقابلہ کے لیے فوج روانہ کرتے تو ہدایت فرما دیتے کہ معاشرہ کے کمزور طبقے پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ حضرت ابوبکرؓ نے شام کی طرف فوج بھیجتے ہوئے سپہ سالار کو ہدایت فرمائی:۔

"تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لئے وقف کر دیا ہے ان کو چھوڑ دینا میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں۔ کسی عورت بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ پھلدار درخت نہ کاٹنا۔ آبادیوں کو ویران نہ کرنا۔ بکری اور اونٹ کو کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا۔ نخلستان کو نہ جلانا۔ مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور نامردی نہ دکھانا"[2]

اذیت رسانی سے تحفظ اسلام اذیت کو خواہ جسمانی ہو خواہ ذہنی اور قلبی جرم قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا[3] اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے قصور کیا ہو تو وہ بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ[4] وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دکھ دیتے ہیں پھر توبہ نہیں کرتے ان کے لیے دوزخ کا عذاب اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی دعاء المشرکین [2] تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۹۶
[3] الاحزاب ۳۳ : ۵۸
[4] البروج ۸۵ : ۱۰

آئینی حقوق

جان کی حفاظت دنیا میں امن کا قیام جان و مال اور آبرو کی حفاظت پر مبنی رہا ہے جب کبھی بھی ان تینوں امور سے کسی ایک امر کو خطرہ لاحق ہوا ہے تو خرمن امن تباہی و بربادی کی آگ سے بھسم ہو کر رہ گیا ہے۔ اسلام نے ان تینوں چیزوں کی حفاظت پر بہت زور دیا ہے۔ تاکہ دنیا کا امن برباد نہ ہو۔

اسلام نے کسی ایک جان کو ناحق تلف کرنے یا زمین میں فساد برپا کرنے کو قتلِ عام سے مماثلت دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا [1] جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے بدلہ کے یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا ہے۔ اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب کو زندہ رکھا۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا [2] اور اپنے لوگوں کو قتل نہ کرو بیشک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ [3] اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ

مال کی حفاظت مال و دولت زندگی کے قیام کا اہم ذریعہ ہے جب کبھی بھی کسی فرد قوم اور ملک کو اپنی دولت کا خطرہ محسوس ہوا ہے۔ فوراً حفاظت کے لیے میدان جنگ میں کود پڑی ہے۔ بڑی بڑی جنگوں کی وجہ ہی ناجائز استحصال دولت ہے۔ اسلام قیام امن کے پیش نظر حفاظت مال کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ [4] اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

اسلام نے ان تمام ناجائز ذرائع سے بھی منع کر دیا ہے جو دوسروں کے ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] المائدہ ۵ : ۳۲ [2] النساء ۴ : ۲۹ [3] بنی اسرائیل ۱۷ : ۳۳
[4] البقرہ ۲ : ۱۸۸

آبرو کی حفاظت عصمت اور پاک دامنی عورت کا بہترین زیور ہے۔ یہی زیور معاشرہ کو حسن بخشتا ہے اس وجہ سے اسلام نے تحفظ ناموس خواتین پر بہت زور دیا ہے ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا[1] اور زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کی بات ہے اور بری راہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے مشہور خطبہ میں جان و مال اور آبرو کی حرمت کے متعلق فرمایا۔ ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا[2] تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی حرمت رکھتی ہیں جیسی آج کے دن کی حرمت ہے۔

اخلاقی حقوق

اچھی گفتگو اچھی گفتگو کرنا اور اچھائی سے پیش آنا اور انسانیت کا فرض اولیں ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا[3] اور لوگوں کو اچھی بات کہو

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا[4] اور انہیں بھلی بات کہو۔

پُر از مکر اور تصنع آمیز گفتگو سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ[5] تصنع آمیز گفتگو سے پرہیز کرو۔

حسد و بغض سے پرہیز حسد اور بغض معاشرہ کی جڑوں کو اس طرح چٹ کر جاتا ہے جس طرح گھن لکڑی کو کھا جاتا ہے انہی برائیوں سے عداوت کی آگ بھڑکتی ہے۔ جو خرمن امن کو بھسم کر دیتی ہے اور رشتہ اخوت کو جلا دیتی ہے۔ اسلام نے ان دونوں برائیوں کو سختی سے منع کیا ہے۔ رسول کریم صلعم نے فرمایا: لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا[6] آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔

---

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۳۲ [2] بخاری کتاب الحج [3] البقرہ ۲: ۸۳
[4] النساء ۴: ۵ [5] الحج ۲۲: ۳۰ [6] بخاری۔

اُمّت

اُمّت کا مفہوم اُمّت کا لغوی معنی جماعت گروہ خاندان نسل اور طریقہ کے ہیں قرآن مجید میں آتا ہے ۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ یعنی گروہ کے لیے ایک وقت مقررہ ہے ۔

نبی کی جماعت : اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۔ اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو اس سے قبل بھی انبیا کو ان کی امتوں نے جھٹلایا ہے ۔

نبی کی ذات قرآن مجید میں نبی کی ذات بابرکات کو بھی اُمّت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے ۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً ۔ ابراہیم ایک امت تھے ۔

ملّتِ اسلامیہ قرآن مجید میں ملت اسلامیہ کے لیے بھی لفظ اُمّت کا استعمال ہُوا ہے ارشادِ الٰہی ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا اور ہم نے تمہیں ایک میانہ رو امّت بنایا ہے ۔

ملّت اسلامیہ کا ایک خاص گروہ ملت اسلامیہ کے ایک خاص گروہ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ارشادِ الٰہی ہے :۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ۔ اور تمہارے درمیان ایک خاص اُمّت ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے ۔ یہاں امت سے مراد واعظین اور مبلغین کی جماعت ہے ۔

قوم اور اُمّت میں فرق ایک اُمّت کے تمام لوگوں کے عقائد مشترک ہوتے ہیں جب کہ قوم کے افراد کے عقائد کا مشترک ہونا ضروری نہیں ۔

۱ ۔ اُمّت کے لیے اتحاد مکانی، اتحاد رنگ نسل اور اتحاد زبان کا ہونا ضروری نہیں جب کہ قوم کے لیے ان امور کا ہونا ضروری نہیں ہے ۔

۲ ۔ امت کا ایک فرد افریقہ میں بس رہا ہو ۔ دوسرا امریکہ میں تیسرا کسی اور دور دراز علاقہ میں یہ سب ایک ہی امت کے افراد کہلائیں گے ۔

۳۔ عقائد کے بدلنے سے ایک فردِ امّت سے نکل جاتا ہے جب کہ قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

امّتِ اسلامیہ کی شرائط رکنیت کعبی کے نزدیک امّت اسلامیہ میں ہر وہ شخص داخل ہے جو رسول کریم صلعم کی نبوت کا معترف ہو۔ اور ان کی تعلیمات کو سچا سمجھتا ہے۔ خواہ اس کے بعد وہ شخص کچھ بھی کہے۔ کرامیہ کے نزدیک امّت اسلام کی اصطلاح کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کلمہ پڑھتے ہیں۔ وہ اس پر خلوص قلب سے ایمان لائے ہوں یا نہیں۔ اہلِ حدیث کے ایک گروہ کے نزدیک امت اسلام کے نام کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو فرائض کی ادائیگی پر ایمان رکھتے ہیں یعنی قبلے کی طرف منہ کر کے دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتے ہیں۔ عبدالقاہر بغدادی کے نزدیک امّت اسلام کے نام کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو دنیا کو فانی سمجھتا ہو۔ خدا کو ایک اور ہمیشہ قائم رہنے والا جانتا ہو اس کو عادل سمجھتا ہو۔ اور مذہب تشبیہ کو رد کرتا ہو۔ خدا کی صفات کے انکار کی تردید کرتا ہو اور خدا کے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھتا ہو۔ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا نبی مانتا ہو۔ اور یہ کہ وہ تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اور اللہ کو اپنی شریعت کا حامی و ناصر جانتا ہو اور اس کی تعلیمات کے صحیح ہونے کا یقین رکھتا ہو۔ قرآن مجید کو شریعت کا ماخذ جانتا ہو۔ دن میں پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہو۔ زکوٰۃ دیتا ہو۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا ہو۔ کچھ شرائط پورا کرنے والے مخصوص لوگوں پر حج کرنا ضروری خیال کرتا ہو۔ جو شخص ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہو وہ امت اسلامیہ کا رکن ہے۔

بعض علماء اسلام نے امّت اسلامیہ کا رکن بننے کے لیے کلمہ شہادت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ قرار دیا ہے اور اس کے انکار سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ایک صحابی مقدادؓ ابن الاسود نے رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر میدان جنگ میں کسی کافر سے میرا مقابلہ ہو۔ اور وہ تلوار سے میرا ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پھر کسی درخت کی اوٹ میں پناہ لے کر کہہ دے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ تو کیا اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اسے مت مارو۔ صحابی نے عرض کیا کہ حضور اس نے پہلے میرا ہاتھ کاٹا پھر اسلام کا اظہار کیا۔ کیا اسے قتل نہ کروں۔ حضورؐ نے فرمایا، اسے قتل نہ کر اگر تو نے اسے قتل کیا۔ تو اس قتل سے پہلے جو تیری منزلت تھی

وہ اس کی ہو جائے گی اور اس کے (کفر کا) درجہ تجھے مل جائے گا۔ (مسلم)

حضرت اسامہؓ بن زید فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ کیا۔ ہم دشمن قبیلہ پر حملہ آور ہوئے میں ایک شخص کے سر پر پہنچا تو اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تاہم میں نے اسے برچھی مار دی لیکن میرے دل میں شبہ بیٹھ گیا میں نے رسول کریم صلعم سے اس کا ذکر کیا آنحضرت صلعم نے فرمایا کیا اس کے لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد تو نے اسے قتل کر دیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس نے محض خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا کہ اس کے دل سے آواز اٹھی تھی۔ نہیں آپ نے یہ فقرہ کئی بار دہرایا۔ میری یہ حالت ہو گئی کہ میں نے چاہا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ (مسلم)

نصب العین امت مسلمہ کا نصب العین اقامت دین ہے۔ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ [1] اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے ابرٰہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اقامت دین سے مراد دین پر کماحقہٗ عمل کرنا ہے۔

امت اسلامیہ کا شعار مسلمانوں کا شعار السلام علیکم ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا یعنی جو تم کو سلام کہے اس کو یہ مت کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

امت اسلامیہ کے خصوصی امتیازات

۱ **وحدت نسل انسانی** امت اسلامیہ تمام انسانوں کو ایک جوڑے کی اولاد سمجھتی ہے اور ان کے درمیان کسی قسم کی نسلی تفریق جائز قرار نہیں دیتی ارشاد الٰہی ہے یَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن

---

[1] شوریٰ ۴۲ : ۱۳

ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا [1] اے لوگو!
ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً [2]

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا۔ پھر ان دونوں سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد پھیلا دی۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا [3] انسان ایک ہی امت تھے۔ پھر الگ الگ ہو گئے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: اِنَّ العباد کلھم اخوۃ [4] انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا: ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد [5] لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ ایک ہے

2 **وحدتِ فکر** امت اسلامیہ کے افراد میں فکر کا اتحاد پایا جاتا ہے وہ ایک ہی خدا اور ایک کتاب اور ایک ہی رسول اور ایک مرکز (بیت اللہ) مانتے ہیں۔
قرآن مجید میں آتا ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا [6] سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور جدا نہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں حبل اللہ کے الفاظ سے مراد قرآن مجید ہے جو مسلمانوں کے اتحاد فکر کی کلید ہے۔

3 **عالمی اخوت** امت اسلامیہ کی اخوت عالمگیر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [7] تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔
رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ کونوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا [8] تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔
اللّٰھم ربنا ورب کل شیء ان اشھد ان العباد کلھم اخوۃ [9]

---

[1] الحجرات ۴۹: ۱۳ [2] النساء ۴: ۱ [3] یونس ۱۰: ۱۹ [4] احمد، ابوداؤد [5] مسند احمد [6] آل عمران ۳: ۱۰۲ [7] الحجرات ۴۹: ۱۰ [8] [9]

اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ بندے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

الخلق عیال اللہ[۱] ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے۔

4 **عالمگیر پیغام** امت اسلامیہ عالمگیر پیغام کی علمبردار ہے۔ طلوع اسلام سے قبل تمام امتیں قومی حیثیت رکھتی تھیں۔ کیونکہ ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف آیا تھا۔ رسول کریم صلعم کی بعثت دنیا کے تمام لوگوں کی طرف تھی اور ان کا پیغام اپنے اندر عالمگیریت کی شان رکھتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ[۲] اور ہم نے تم کو سارے لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا لیکن اس بات کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ایک دوسری آیت ہے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا[۳] کہہ اے لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: كَانَ كُلُّ نَبِيٍّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلٰى كُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ[۴] ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ اور سیاہ قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

5 **مساوات** امت مسلمہ میں قومی، نسلی، لسانی تفریق کا کوئی مقام نہیں بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى[۵]

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا ہے رسول کریم صلعم نے اس آیت کی تشریح حجۃ الوداع کے موقعہ پر کرتے ہوئے فرمایا۔ لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

6 **امت وسط** اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو امت وسط کے الفاظ سے اعزاز بخشتا ہے یعنی اعتدال پسند امت افراط اور تفریط سے پاک قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا[۶] اور ہم نے اسی طرح تم کو میانہ رو امت بنایا۔

---

[۱] بیہقی کتاب الایمان [۲] سبا ۳۴: ۲۸ [۳] اعراف ۷: ۱۵۸ [۴] مسلم باب المساجد [۵] الحجرات ۴۹: ۱۳ [۶] البقرہ ۲: ۱۴۳

خیرِ امت اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو خیرِ امت کا لقب دیا ہے۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ [1] تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہو۔ 7

آخری امت رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ انا اٰخر الانبیاء و انتم اٰخر الامم [2] میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ 8

شوریٰ پر عمل امت مسلمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے اصول شوریٰ پر عمل کرنے والی ہے۔ 9

قرآن مجید میں آتا ہے، وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ [3] مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ آپس میں باہمی مشاورت کرکے کاروبار چلائیں۔ اللہ تعالیٰ رسولِ کریم صلعم کو حکم دیتے ہیں وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ [4] اور ان سے کاموں میں مشورہ کیجیے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ ما شاور قوم الا ھُدوا [5] جس قوم نے باہمی مشورہ کیا وہ ہدایت پا گئی۔

رضائے الٰہی کا حصول امتِ مسلمہ کا ہر کام رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور دین کو دنیا پر مقدم رکھتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے عورتیں اور بیٹے اور ڈھیر در ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ اس دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے۔ کہہ کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں رہنے والے ہیں اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضامندی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے [6] 10

موت سے بے خوفی امتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ موت کا وقت متعین ہے لہٰذا اس سے ڈرنا کمزوری کی علامت ہے 11

خدا پرستی پر بنیاد امتِ مسلمہ کی بنا لا الٰہ الا اللہ ہے۔ کیونکہ خالص توحید ہی تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں امت مسلمہ کو بار بار خالص توحید پر قائم رہنے کی تعلیم دی ہے۔ 12

---

[1] آل عمران ۳ : ۱۱۰ [2] ابن ماجہ، حاکم [3] الشوریٰ ۴۲ : ۳۸ [4] آل عمران ۳ : ۱۵۸ [5] طبرانی۔ کنوز الحقائق [6] آل عمران ۳ : ۱۵

قرآن مجید میں آتا ہے: اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ[1] اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
ھُوَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ[2] وہ اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ[3] اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کیا
ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔
یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ[4] اے لوگو! اپنے رب کی
عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

اُمتِ مسلمہ کے فرائض

نیابتِ رسول: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب نبی کے فرائض امتِ مسلمہ کے سپرد ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: ھُوَ اجْتَبٰىکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ھُوَ سَمّٰىکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ[5] اس نے تم کو چن لیا ہے اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اس نے تمہارا نام پہلے سے اور قرآن میں بھی مسلم رکھا تاکہ رسول تمہارا اپنی رو ہو۔

اس آیت میں امتِ مسلمہ کو کارِ رسالت کے لیے نبی کا جانشین قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے امتِ مسلمہ پر وہ تمام فرائض عائد ہو جاتے ہیں جو نبی کریم صلعم نے سرانجام دیئے۔

تبلیغ دین: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دینِ حق کا پیغام دوسروں تک پہنچانا امتِ مسلمہ پر ایک فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی مسلمانوں کی ترقی اور عروج کی ضامن ہے۔ جب تک مسلمانوں نے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی وہ ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے۔ جب اس فرض کی ادائیگی کی طرف کم توجہی کر دی تو گھاٹے میں چلے گئے۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ[6]

---

[1] البقرہ ۲: ۲۵۵ [2] الحشر ۵۹: ۲۳ [3] بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳ [4] البقرہ ۲: ۲۲ [5] الحج ۲۲: ۷۸ [6] العصر ۱۰۳: ۱-۳

قسم ہے وقت کی کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔

اس مختصر سی سورت میں جن لوگوں کو خسران اور گھاٹے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے وہ چار صفات کے مالک ہیں۔

۱۔ وہ عقائد صحیح کے مالک ہوتے ہیں۔

۲۔ اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔

۳۔ ایک دوسرے کو دین حق پہنچاتے ہیں۔

۴۔ دین حق کے پہنچانے میں دنیا کی مشکلات کا سامنا کر کے صبر کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہوتے ہیں۔

اس سورۃ میں تواصوا بالحق کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کی صرف یہی خوبی نہیں ہے کہ وہ خود حق کے بلند مینار پر کھڑا ہو جائے بلکہ حقیقی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حق کی بلندی کی طرف لے جائے۔ حق دعوت اسلام کا نام ہے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں بلغوا عنی ولو آیۃ یعنی مجھ سے پیغام حق سن کر لوگوں تک پہنچاؤ۔ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

نضر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی لہ من سامع۔ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز اور کامیاب کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا دوسروں تک پہنچا دیا۔ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سننے والے سے جس کو حدیث پہنچائی گئی ہے۔ زیادہ محفوظ رکھنے والا ہو۔

لیبلغ العلم الشاھد الغائب (بخاری ۳: ۳۷) کہ حاضر ان لوگوں تک میری علمی باتوں کو پہنچا دے جو میری مجلس میں موجود نہیں ہو سکتے۔

دعوتِ خیر و معروف اور نہی منکر

امتِ مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی اور نیکی کی دعوت دے۔

ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [1] اور چاہیے

---

[1] آلِ عمران ۳: ۱۰۴

کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

مفلحون: (کامیابی پانے والے) کا لفظ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی صرف دعوت الی الخیر و المعروف اور نہی عن المنکر سے وابستہ ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ [1] تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو۔ اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔

ایک اور جگہ آتا ہے: يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ [2] وہ انہیں نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور بُرائیوں سے روکتے ہیں۔

نظامِ عدل کا قیام

امتِ مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنّت رسولؐ کی ہدایات اور احکام کی روشنی میں نظامِ عدل و انصاف قائم کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ [3] کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقوی سے قریب تر ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ [4] اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب ہدایت اور عدل و انصاف کے فرمان نازل کئے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

بین الاقوامی امن قائم کرنا

امتِ اسلامیہ کا یہ فرض ہے کہ دنیا میں امن قائم کرے اور بدامنی اور شر کو جڑ سے اکھاڑ دے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے امتِ مسلمہ کو پہلی یہ ہدایت دی ہے۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ [5] نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔ گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ دوسری ہدایت یہ دی ہے کہ اگر دو قوموں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دی جائے۔ اگر کوئی

---

[1] آل عمران ۳ : ۱۱۰ [2] الاعراف ۷ : ۱۵۷ [3] ۵ : ۹ [4] الحدید ۵۷ : ۲۵
[5] المائدہ ۵ : ۲

قوم صلح کی طرف مائل نہ ہو، دنیا کے امن کو برباد کرنے کے لیے تل جائے۔ تو پھر امتِ مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ ظالم قوم کے خلاف اٹھ کھڑی ہو اور امن کے مزاج کو درست کردے تاکہ دنیا میں امن ہو سکے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔[1]

اگر مومنوں میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرتی ہے تو اس سے جو زیادتی کرتی ہے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئیں۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں بین الاقوامی امن قائم کرنے کے لیے تین اصول مقرر کیے ہیں۔

۱۔ جب دو قومیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دینی چاہیے۔

۲۔ اگر کوئی قوم صلح پر رضامند نہ ہو۔ بلکہ زیادتی کا راستہ اختیار کرے اس قوم کے خلاف امتِ مسلمہ اٹھ کھڑی ہو اور ظالم قوم کو ظلم و عدوان سے روک دے۔

۳۔ جب ظالم قوم دوبارہ صلح پر رضامند ہو جائے تو عدل و انصاف کے ساتھ متحارب قوموں کے درمیان صلح کرا دی جائے۔

انفاق فی سبیل اللہ امتِ مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ خیر امت بننے کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔

ارشادِ الٰہی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ[2]

تم نیکی کے اس بلند مقام کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے انہیں اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو۔

---

[1] الحجرات ۴۹: ۹ [2] آل عمران ۳: ۹۲

مکتب

مکتب اس جگہ کا نام ہے جہاں لکھا پڑھا جاتا ہے اور عوام کو علم کے زیور سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ مکتب معاشرتی اداروں میں سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ معاشرے میں تعلیم و تربیت اور اصلاح اخلاق کا دارومدار مکتب پر ہے۔ ہر ترقی یافتہ قوم نے اپنی تعلیمی درس گاہوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کی ہے کہ مکتب کی بنیاد اشاعت علم پر ہے اس لیے سب سے پہلے اسلام میں علم کی اہمیت اور فضیلت کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

اسلام کی رو سے سب سے پہلا اور اول معلم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس نے آدمؑ کو اشیاء کا علم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا [1] اور آدمؑ کو سب کے نام سکھائے۔ اس علم کی وجہ سے آدمؑ مسجود ملائکہ بنا۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ [2] اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کی فرمانبرداری کرو تو انہوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے نہ کی۔

پھر علم کو پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مخلوق کی طرف بھیجنے شروع کیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو مظہر الوہیت اور تمام انبیاء علیہم السلام کے جمیع اوصاف کے جامع تھے، ان کی بعثت کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہوا فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ [3] یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔

صاحب علم آدمی کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ [4] کہہ کیا جاننے والے اور

---

[1] البقرہ ۲: ۳۱ [2] البقرہ ۲: ۳۴

[3] الجمعہ ۶۲: ۲

نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ [۱] اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائیں گے اور جنہیں علم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ [۲]

اللہ سے صرف اس کے علم والے بندے ڈرتے ہیں اللہ غالب بخشنے والا ہے۔

بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ [۳] بلکہ وہ ان لوگوں کے سینوں میں کھلی آیتیں ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [۴] تم علم والوں سے پوچھو اگر تم کو علم نہیں۔

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا [۵] کہہ اے میرے رب میرا علم بڑھا۔

احادیث نبوی

علماء پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں [۶]

پیغمبروں کے بعد علماء اور مجاہدین کا درجہ ہے [۷]

قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کا خون ایک ہی درجہ میں ہوں گے [۸]

اس مسلمان کی کوئی قدر و منزلت نہیں جو نہ استاذ ہے نہ طالب علم [۹]

بلا تاخیر ایک جاہل کو علم کی تلاش میں لگ جانا چاہیئے اور ایک عالم معتبر کو اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہیئے [۱۰]

تلاشِ علم ایسا ہی مقدس کام ہے جیسے عبادت اور اس کے حصول میں جو مصیبت اٹھائی جائے وہ جہاد ہے۔ [۱۱]

مہد سے لحد تک تلاشِ علم جاری رکھو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے [۱۲]

رسول کریم صلعم دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے ان دونوں مجلسوں یا جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا سے دعا کر رہی ہے

---

[۱] المجادلہ ۵۸: ۱۱ [۲] فاطر ۳۵: ۲۸ [۳] العنکبوت ۲۹: ۴۹ [۴] النحل ۱۶: ۴۳
[۵] طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴ [۶] احیاء [۷] احیاء [۸] صبح الاعشیٰ [۹] محاضرات الادباء [۱۰] الاحیاء [۱۱] کشف الظنون [۱۲] کشف الظنون

اور اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہے وہ چاہے ان کو دے چاہے نہ دے۔ مگر دوسری مجلس علماء کی ہے دین کی سمجھ حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو سکھا رہے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ کہہ کر آپ بھی اس مجلس میں بیٹھ گئے [1]

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے [2]

قیامت کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ علم اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائیگی [3]

اقوال

حضرت علیؓ نے کمیل کو نصیحت کی تھی۔ اے کمیل! علم دولت سے بڑھ کر ہے دولت کی حفاظت تو تمہیں کرنا پڑتی ہے۔ لیکن علم تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ دولت تو خرچ کرنے سے کم ہو جاتی ہے۔ لیکن علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے [4]

الاحناف کا قول ہے کہ ہر وہ عظمت اور بزرگی جسے علم کی پشت پناہی حاصل نہ ہو جلد غارت ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ذلت لے لیتی ہے [5]

نامعلوم عالم فرماتا ہے جس نے علم حاصل نہیں کیا اس نے کیا پایا جس نے علم حاصل کر لیا اس نے کیا کھویا" [6]

الخلیل بن احمد سے سوال کیا گیا دو علماء بہتر ہیں یا بادشاہ! انہوں نے جواب دیا علماء۔ پھر ان سے پوچھا گیا جب یہ بات ہے تو پھر یہ بتائیے کہ علماء بادشاہوں کے دروازوں پر کیوں جمع ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ علماء کے دروازوں پر جمع نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا۔ علماء جانتے ہیں کہ بادشاہوں کے متعلق ان کا کیا فرض کیا ہے [7]

حضرت عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا گیا کہ اگر تمہیں یہ معلوم ہو کہ کل تمہاری موت آنے والی ہے تو تم کیا کرو گے انہوں نے جواب دیا کہ میں مطالعہ میں مصروف ہو جاؤں گا [8]

مکتب کا آغاز اور ارتقاء

آغاز اسلام سے ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسلام ابتدائی چند صدیوں میں مدارس کے بجائے مساجد کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علماء کے مکانات

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم ص۳۶ [2] مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم ص۳ [3] بخاری ۳ : ۱۲ [4] الاحیاء عقد الفرید عیون الاخبار [5] محاضرات الادبار [6] الاحیار - [7] عقد الفرید، ادب الدنیا والدین [8] منہاج المتعلم

ہی درس گاہیں تھیں۔ اور یہیں سے عظیم مفسر، محدث، فقیہہ، مجتہد، ادباء، شعراء، فلاسفر اور مؤرخ پیدا ہوئے جن کے نام علمی دنیا میں درخشندہ ہیں۔

علمی حیثیت سے مشہور مساجد

علمی حیثیت سے چند ایک مساجد اسلامی دنیا میں بہت مشہور رہیں۔ ان کی تفصیلات درج کرتے ہیں۔

جامع المنصور ۱۴۵ھ میں جامع المنصور کی تعمیر شروع ہوئی۔ یہ مسجد اعلیٰ درجہ کا مدرسہ تھا۔ خطیب بغدادی نے حرم شریف میں جن تین باتوں کے لیے دعا مانگی تھی ان میں پہلی بات یہ تھی کہ انہیں اس مدرسہ میں پڑھانے کا موقع نصیب ہو[1]۔

الکسائی بھی اس مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ اور عموماً ان کے درس میں الفراء، الاحمر، ابن السعدان اور الاخفش شریک ہوا کرتے تھے[2]۔

اس مسجد میں ابو عمرو الزاہد (م ۳۴۵ھ) نے الیاقوت املا کروائی اور اس پر نظر ثانی کی گئی۔ اور مصنف نے اس مضمون پر محرم ۳۲۶ھ میں لیکچر شروع کئے[3]۔

جامع دمشق اس مسجد کی تعمیر الولید بن عبدالملک (م ۹۶ھ) نے کروائی۔ اور آٹھ سال میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد ایک تعلیمی گہوارہ تھا۔ ابن جبیر کا بیان ہے کہ اس مسجد میں درس کے متعدد حلقے قائم تھے۔ اور اساتذہ کے لیے معقول مشاہرے کے علاوہ خورد و نوش کا بھی انتظام تھا۔ مالکی طلبا جن میں اکثر مغربی تھے۔ مغربی گوشہ میں مالکی علماء سے سبق لیتے تھے ایک حلقہ کے لیے جن کے استاد ستون سے سہارا لگا کر سبق دیا کرتے تھے۔ بہت بڑا وقف تھا[4]۔ داخلی دروازہ باب البرید کے بائیں جانب ایک شافعی مدرسہ تھا جس کے وسط میں ایک حوض تھا[5]۔ طلبا شور و شغب سے بچ کر پرسکون گوشوں میں چلے جاتے اور وہاں مطالعہ میں مصروف رہتے تھے[6]۔ الخطیب بغدادی کا حلقہ درس بہت وسیع ہوتا تھا جہاں بے شمار سامعین ہوتے تھے[7]۔

---

[1] تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ڈاکٹر احمد شلبی ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ص ۴۸

[2] معجم الادباء جلد ۴ ص ۲۷۳ [3] الاغانی جلد ۳ صفحہ ۱۴۸

[4] الرحلۃ (ابن جبیر) صفحہ ۲۷۲ - [5] الرحلۃ (ابن جبیر) صفحہ ۲۷۶

[6] ایضاً صفحہ ۲۶۶ [7] معجم الادباء (یاقوت) جلد ۱ صفحہ ۲۰۰

جامع عمر اس مسجد کی تعمیر ۲۱ھ میں ہوئی۔ بعد ازاں کئی بار مرمت اور توسیع کی گئی اس میں چالیس حلقہ ہائے درس قائم تھے جو کبھی بند نہ ہوتے تھے[۱] کتب میں اس مسجد کے تقریباً آٹھ زاویوں کی تفصیلات موجود ہیں یہاں صرف تین زاویوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ زاویہ امام شافعیؒ جہاں امام صاحب خود درس دیا کرتے تھے۔ المقریزی کے زمانہ تک اس زاویہ میں چوٹی کے علمار دینیات اور فضلاء درس دیا کرتے تھے۔

۲۔ زاویہ مجدیہ میں قاضی القضاۃ وجیہہ الدین عبد الوہاب البہنی کا تقرر ہوا تھا" مقریزی کے زمانہ تک یہ عہدہ ایک نشان امتیاز تصور کیا جاتا تھا۔

۳۔ زاویہ صاحبیہ میں شافعی اور مالکی اساتذہ کا تقرر ہوا کرتا تھا[۲]

اس مسجد میں ادبی مجالس بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لکھا ہے کہ الطبری نے ۲۵۳ھ میں ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ جہاں انہوں نے الطرماح کا کلام ابوالحسن بن السراج کی درخواست پر سنانے کا اہتمام کیا تھا[۳]

کوفہ کی مسجد میں کمیت بن زید اور حماد الراویہ عموماً ایک ادبی حلقہ منعقد کیا کرتے تھے۔ جہاں یہ دونوں شاعر ادبی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے[۴] سعید بن المسیب مدینہ کی مسجد میں عربی شاعری پر بحث کیا کرتے تھے[۵] مسلم بن الولید اکثر مسجد بصرہ میں حلقہ قائم کر کے اپنا کلام سنایا کرتے تھے[۶]

ابن طولون کی مسجد میں تفسیر، حدیث، فقہ اور علم ہیئت پر تحقیقی کام ہوا کرتا تھا۔ عبد اللطیف بغدادی سے روایت ہے کہ میں جامع ازہر میں صبح و شام درس دیا کرتا تھا۔ اور دوپہر کو ایک عالم طب آتے جو طب پر درس دیا کرتے تھے[۷]

مکتب کا آغاز یورپین مؤرخین کی تحقیق ہے کہ سب سے پہلے مامون نے خراسان میں مدرسہ قائم کیا تھا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ مامون نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں ایک کالج بنوایا۔

---

[۱] الخطط (مقریزی) صفحہ ۲۰۶۔ [۲] ایضاً ۲۵۵-۲۵۶

[۳] ارشاد (یاقوت) جلد ۶ صفحہ ۴۳۲ [۴] الاغانی جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۳-۱۱۴

[۵] طبری جلد ۲ صفحہ ۱۲۶۶ [۶] الموشح (المرزبانی) صفحہ ۲۸۹-۲۹۰

[۷] ابن ابی اصیبعہ جلد ۲-۲۰۷

جس میں مختلف ممالک سے نہایت لائق استاد بلاکر مقرر کیے[1] اس اعتبار سے دوسری صدی سے مدارس کے قیام کا آغاز ہوگیا تھا۔ مگر عربی مصادر سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

عام مؤرخین مدارس کے قیام کا آغاز مدرسہ نظامیہ بغداد سے یعنی پانچویں صدی سے کرتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ چوتھی صدی میں نیشاپور میں متعدد مدارس قائم ہوچکے تھے سب سے پہلے سلطان محمود غزنوی کے بھائی امیر نصر بن سبکتگین نیشاپور میں مدرسہ بیہقیہ اور مدرسہ سعیدیہ قائم کیے[2] اسی زمانہ میں نیشاپور میں ایک مدرسہ ابوسعد اسمٰعیل بن علی واعظ استرآبادی نے قائم کیا۔ ایک مدرسہ امام ابواسحاق کے لیے کسی امیر نے بنوایا تھا[3] ایک مدرسہ اہل نیشاپور نے امام ابوبکر بن حسن المعروف بابن فورک (م۔ ۴۰۶ھ) کے لیے قائم کیا۔ جس میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی[4] حاکم بامر اللہ فاطمی نے ۴۰۰ھ میں قاہرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا[5] نظام الملک نے ایک مدرسہ نیشاپور میں قائم کیا جو مدرسہ نظامیہ نیشاپور کے نام سے مشہور تھا۔

ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک طوسی نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا مدرسہ کے ساتھ طلباء کے لیے دارالاقامۃ تعمیر کیا۔ سب طلباء کو وظیفے ملتے تھے۔ اس دور کے نامور علماء درس و تدریس کے لیے مقرر کیے گئے۔

نظامیہ بغداد کے علاوہ نظام الملک نے بلخ، ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ، مرو، موصل، آمل اور عراق کے تمام شہروں میں مدارس قائم کیے[6]

ابن اثیر کا بیان ہے کہ نظام الملک نے ممالک محروسہ کے تمام شہروں میں مدارس اور دارالعلوم قائم کیے۔ اور ان کے مصارف کے لیے بڑی بڑی رقمیں مقرر کی تھیں[7]۔ نظامیہ بغداد کے قیام کے بعد شہر بغداد میں مدارس اور دارالعلوم کی تعمیرات کا عام سلسلہ شروع ہوگیا۔ ابن جبیر اندلسی ۵۸۰ھ میں بغداد پہنچا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہاں تیس بڑے دارالعلوم ہیں جن میں سے ہر ایک عمارت بڑے بڑے محلات کو شرماتی ہے[8]۔ مستنصر باللہ (۶۲۳ - ۶۴۰ھ) نے ۶۲۵ھ میں دارالعلوم مستنصریہ کی بنیاد

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ارٹیکل المامون [2] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۵۱ [3] حسن المحا...

[4] ابن خلکان ج ۳ ص ۱۸۰ [5] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۳۹

[6] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۳۷ [7] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۶۲ [8] سفرنامہ ابن جبیر ص ۲۲۹

رکھی سات برس میں عمارت تعمیر ہو کر تیار ہوئی۔ مدرسہ کے مصارف کے لیے ایک بڑی جائیداد وقف تھی[1]

ابن واصل کا بیان ہے کہ روئے زمین پر اس سے بہتر مدرسہ نہ تھا۔ اور نہ کسی مدرسہ کا اتنا بڑا وقف تھا۔ اس میں چاروں مسالک کی تعلیم ہوتی تھی۔ مدرسہ کے متعلق ایک شفاخانہ، مطبخ، ٹھنڈے پانی کے لیے ایدارخانہ تھا طلبا کو چٹائیاں فرش، تیل، کاغذ قلم دوات مفت اور کھانے کے علاوہ ہر طالب علم کو ایک اشرفی ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مدرسہ سے متعلق ایک حمام بھی تھا[2]

فاطمی خلفار کے عہد میں صرف چند مدارس کے قیام کا پتہ چلتا ہے جامعہ ازہر انہی کی یادگار ہے۔

نورالدین محمود زنگی (۵۴۱ھ - ۵۶۹ھ) نے حلب، حماۃ، بعلبک میں بڑے بڑے مدارس قائم کیے۔ دمشق میں ایک عظیم الشان مدرسہ بنایا۔ دنیائے اسلام میں جو پہلا دارالحدیث قائم ہوا اس کے نام سے دارالحدیث النوریہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے پہلے خاص علم حدیث کے درس کے لیے کوئی مدرسہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ النوریۃ الکبریٰ کو ابوشامہ کے بیان کے مطابق نورالدین نے ۵۶۳ھ میں قائم کیا تھا۔

۶۹-۵۶۷ھ میں نورالدین کے کاتب عماد کے اہتمام سے مدرسہ "عمادیہ" قائم ہوا۔ سلطان صلاح الدین (م ۵۸۵ھ) اور اس کے متوسلین نے مصر، شام، فلسطین وغیرہ کے شہروں میں صدہا مدارس قائم کیے۔ اسکندریہ میں بھی بڑے بڑے مدارس قائم کیے۔ ابن جبیر نے سلطان کے عہد میں مصر اور شام کی سیاحت کی تھی۔ اسکندریہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ اس شہر کے مناقب اور مفاخر میں جس کا سہرا سلطان کے سر ہے۔ اس کے مدارس اور اقامت گاہیں ہیں جو اس نے طلبار اور صوفیار کے لیے بنوائیں۔ عہد ایوبی کے مشہور مدارس مصر میں الناصریہ ملحق جامع عتیق القمحیہ، السیوفیہ، دمشق میں الصلاحیہ، یروشلم میں الصلاحیہ تھے۔ متعدد مدارس ایوبی خواتین کی یادگار ہیں مصر میں مدرسہ قطبیہ ملک العادل کی لڑکی مونسہ خاتون نے قائم کیا۔ سلطان کی دوسری صنیفہ خاتون نے حلب میں مدرسہ فردوس کے نام سے قائم کیا۔ خاندان صلاحیہ کے بعد ۹۲۳ھ تک مصر و عرب پر اتراک و چراکسہ نے حکومت کی۔

---

[1] تاریخ الخلفار ص ۴۷۳ [2] تاریخ الخلفار ص ۳۶۵۔

اتراک نے ۷۸۳ھ تک حکومت کی پھر چراکسہ کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی۔ یہ دونوں خاندان زرخرید غلام تھے۔ جو ترقی کر کے منصب حکومت تک پہنچے تھے۔

ملک منصور قلاؤں (م ۶۸۹ھ) نے مدرسہ منصوریہ قائم کیا ناصر محمد ولد قلاؤں نے مدرسہ ناصریہ قائم کیا۔ جس میں چاروں مسالک کا درس ہوتا تھا۔

امیر فخر الدین زنجبیلی (۵۷۹ھ) نے مکہ معظمہ میں ایک مدرسہ بنوایا۔ خلیفہ المستغنی باللہ کی کنیز خاص طالب الزمان نے ۵۸۰ھ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں دس فقہائے شافعی مدرس تھے۔ ۶۴۱ھ میں ایک مدرسہ قائم ہوا جس کا بانی الملک المنصور عمر دبن علی والی یمن تھا۔ عبدالباسط نے جو سلطان ظاہر کی فوج کا ناظر تھا۔ مکہ میں عمدہ مدرسے بنوائے ملک اشرف قایتبائی نے جو خاندان چراکسہ سے تھا چاروں مذاہب کے لیے ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا۔ جس میں بہتر ۷۲ کمرے تھے ایک بیچ میں ایک وسیع کمرہ تھا۔

بنگال کے خود مختار حکمران سلطان غیاث الدین نے مکہ معظمہ میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے اپنے خادم یاقوت نامی کو مولانا حسن بن عجلان شریف مکہ کے پاس زر خطیر دے کر روانہ کیا۔ یاقوت نے باب امہانی کے قریب بارہ ہزار مثقال میں دو مکان خرید کر مدرسہ بنوایا۔ سلطان سلیمان نے ۹۲۶ھ میں چار بڑے بڑے مدرسے قائم کیے۔ تیونس میں ایک مدرسہ "جامع زیتون" کے نام سے قائم ہوا۔ یہ مدرسہ ساتویں صدی ہجری میں حکومت حفصیہ کے عہد میں افریقہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ حکومت ادریسیہ شمالی افریقہ میں ۱۶۹ھ سے ۳۰۵ھ تک قائم رہی مراکش کے شہر فاس میں قرویینی یونیورسٹی ۲۴۵ھ میں قائم ہوئی۔ اس یونیورسٹی کو ایک خاتون فاطمہ بنت محمد الفہری نے قائم کیا تھا۔

مغربی سوڈان میں ۱۲۴۰ء میں قبیلہ مذنگ نے سلطنت مالی کی بنیاد رکھی ٹمبکٹو اسلامی علوم کا مرکز تھا۔ اس شہر میں بہت بڑی یونیورسٹی قائم کی۔

تلمسان پرانے زمانے میں مغرب متوسطہ کا دارالحکومت تھا۔ یہاں مسجد سدی بومدین ۷۳۹ھ/۱۳۸۸ء میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کے اوقاف میں ایک مدرسہ تھا جو ۷۴۷ھ میں تعمیر ہوا پانچویں صدی کے شروع میں ابوجعفر طوسیؒ نے نجف میں ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی یہی درس گاہ آج کل "جامعہ نجف" کے نام سے مشہور ہے۔ مدرسہ سلیمیہ، مدرسہ خلیلی، مدرسہ بردجردی بھی مشہور ہیں ایک درس گاہ "جامعۃ النجف" ہے۔

جس کی خوبصورت عمارت کی تعمیر میں تین لاکھ دینار صرف ہوئے۔

ترکوں نے اپنے عہد عروج میں بے شمار مدارس قائم کیے۔ سب سے پہلے سلطان ارخان (۷۲۶ھ-۷۶۰ھ) نے ازنیق کا مدرسہ قائم کیا۔ سلطان محمد فاتح نے ۸۶۵ھ میں قسطنطنیہ میں ایک بڑی یونیورسٹی قائم کی۔ جس کے ماتحت آٹھ دارالعلوم تھے۔ سلطان نے ایک کالج مفتیوں اور قاضیوں کی فقہی تعلیم کے لیے قائم کیا۔

بقول ارکہاٹ "ترکی میں کوئی سلطان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے پیچھے ایک کالج نہ چھوڑا ہو۔ اس پر کچھ جائیداد نہ وقف کی ہو"

علامہ شبلی نے اپنے مضمون[1] مدرسے اور دارالعلوم میں ترکی حکومت کے بہت سے مدارس اور ان کے بانیوں کے نام لکھے ہیں ان میں سلاطین کے ساتھ امراء و خواتین کے نام بھی ہیں لئے ترکوں کی تعلیمی خدمات کا کمیسی اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

محمد ثانی کے پیش روؤں خصوصاً اورخان کو اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا۔ اس نے سلسلہ علماء قائم کیا۔ اور سلطنت کے مفتیوں اور تاجروں کی تعلیم و ترقی کا ضابطہ مرتب کیا۔ فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت پیدا کرنے اور اس کو قائم رکھنے کے لیے شجاعت اور فوجی قابلیت کے علاوہ کچھ اور بھی ضروری ہے محمد نے جو علوم میں خود بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظام درست رکھنے کے لیے قاضی کا احترام ضروری ہے۔ اور ان کا احترام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور معزز عہدوں پر مامور کیے جائیں۔ اور فکر معاش کی جانب سے ان کو مطمئن کر دیا جائے۔ محمد نے ابتدائی مدارس کے علاوہ جو مکتب کہے جاتے تھے اور ہر شہر کے ہر محلہ اور ترکی کے تمام دیہاتوں میں موجود ہیں بہت سے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے ان میں مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعات، تاریخ، زبان، فصاحت و بلاغت، اقلیدس ہیئت یہ ایک ایسا نصاب تعلیم تھا جس کا موازنہ یقیناً پندرہویں صدی کے پیرس اور آکسفورڈ کے نصاب تعلیم سے کیا جا سکتا ہے۔ جو طلبہ ان سب مضامین میں پوری دستگاہ حاصل کرتے تھے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مقالات شبلی ج ۳ مقالہ "مدرسے اور دارالعلوم"

ان کو دانشمند کا لقب دیا جاتا تھا۔ دانشمند بغیر مزید تعلیم حاصل کیے کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرس کا حق دار ہو سکتا تھا۔ لیکن اس صورت میں وہ علماء جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ اور اس کو تمام اعلیٰ تعلیمی عہدوں سے محروم ہو جانا پڑتا تھا۔ جماعت علماء کا رکن بننے کے لیے فقہ کے ایک طویل نصاب کو پورا کرنا ضروری تھا اور یکے بعد دیگرے مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے متعدد سندیں لینا پڑتی تھیں[۱]

لارپنٹ لکھتا ہے۔

"۱۷۶۵ء سلطان مصطفیٰ ثالث کے عہد حکومت میں صرف حدود قسطنطنیہ کے اندر دو سو چھ مدرسے تھے۔ اور انیسویں صدی کے وسط میں سلطان عبد المجید کے زمانہ میں یہ تعداد تین سو سے اوپر پہنچ گئی تھی۔ عبد المجید کے زمانہ میں ہر شہر میں کم سے کم ایک مدرسہ موجود تھا۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً ادرنہ بغداد اور قاہرہ میں چالیس اور پچاس پچاس مدرسے تھے[۲]

تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں ہر قسم کے مدارس جو قسطنطنیہ میں تھے۔ ان کی مجموعی تعداد پانچ سو تھی جن میں تیرہ بڑے بڑے کالج تھے کالجوں اور اسکولوں میں حسب ذیل زیادہ اہم تھے۔

۱۔ مکتب حربیہ شاہانہ اس کو سلطان محمود ثانی نے فرانس کے فوجی کالج کے نمونہ پر ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا۔

۲۔ مکتب سلطانی یہ کالج مکتب حربیہ کے سوا تمام کالجوں میں ممتاز تھا۔

۳۔ مکتب ملکیہ سول سروس کالج سلطان عبد الحمید خان ثانی کا قائم کردہ تھا۔

۴۔ مکتب الحقوق (قانونی کالج) اس میں حسب ذیل مضامین پڑھے جاتے تھے۔ فقہ، اصول فقہ، رومن لاء۔ قانون تجارت، اصول محاکمہ، تعزیرات، قانون بحری، سیاست مدن قوانین سلطنتہائے یورپ، مختصر طور پر قانون کی ایجاد کی تاریخ اور اس کی عہد بعہد ترقیاں۔

۵۔ مکتب الہندسہ، مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ رڑکی کالج کے مشابہ ہے۔ مدت تعلیم چھ برس تھی۔

۶۔ مکتب اللسان۔ اس میں جرمن، فرانسیسی، یونانی۔ ارمنی، لاطینی، اطالوی اور

---

[۱] تاریخ دولت عثمانیہ جلد اول ص ۱۰۱ [۲] لارپنٹ جلد ۲ ص ۱۴۳

روسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں ۔

۷۔ مکتب الصناعۃ (ٹکنیکل اسکول)، اس میں حدادی اور نجاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی ۔

۸۔ مکتب نواب ۔ اس کالج میں وہ طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے جو قاضی اور مفتی کے عہدوں کے امیدوار ہوتے تھے ۔

۹۔ مکتب بحریہ، اس میں جہاں رانی کی تعلیم ہوتی تھی ۔

۱۰۔ مکتب الزراعۃ ۱۸۵۱ء میں قسطنطنیہ کے قریب سان اسٹیفانو کے مقام پر قائم کیا گیا اور اس میں زراعت، نباتات اور جانوروں کے متعلق نظری اور عملی تعلیم دی جاتی تھی ۔

۱۱۔ مکتب طبیہ ایک ہسپتال اور حیوانات نباتات اور طبیعات کا ایک ادارہ بھی اس سے متعلق تھا ۔

۱۲۔ فوجی انجنیروں کے لیے ایک کالج سلطان سلیم ثالث نے قائم کیا ۔

۱۳۔ ایک ٹریننگ کالج اساتذہ کی تعلیم کے لیے بھی تھا[1]

شعبہ تعلیم و تدریس میں اہل سپین نے بہت ترقی کی ۔ اسی علمی ترقی کا ورثہ یورپ کو ملا ۔ جس کی برکت سے یورپ نے علوم و فنون میں ترقی کی ۔ چند مشہور جامعات اور مدارس کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

اسپین کے مشہور جامعات میں قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ اور مالقہ کے نام آتے ہیں ۔ جامعہ قرطبہ کا سنگ بنیاد عبدالرحمٰن الداخل نے رکھا تھا ۔ الحکم ثانی نے اس جامعہ کو بے نظیر اور لاثانی بنا دیا تھا ۔ بڑے بڑے علماء اس میں درس و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے ۔ اور باقاعدہ ان کی طرف سے قیمتی سائنسی، فنی اور تاریخی معلومات شائع ہوتی رہتی تھیں ۔ اشبیلیہ اور مالقہ کی جامعات دور امیہ میں قائم ہوئی تھیں ۔ اور ان کا عروج دور طوائف الملوکی میں ہوا ۔ غرناطہ کی جامعہ بنو نصر کے ساتویں بادشاہ ابوالحجاج یوسف کے زمانہ میں قائم ہوئی تھی ۔ لسان الدین ابن الخطیب نے اس جامعہ کو چار چاند لگائے ۔ ان کے علاوہ مرقسطہ اور بطلیوس کے مدارس بھی کافی شہرت یافتہ تھے ۔ طلیطلہ کی یونیورسٹی مسلمانان اسپین کی باقیات الصالحات کو محفوظ کرنے کا ایک اہم مرکز بن گئی تھی ۔ ایک مدرسہ

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے تاریخ دولت عثمانیہ مصنفہ ڈاکٹر محمد عزیر ج ۲ ص ۳۸۳-۴۰۱

"دارالشفقہ" یتیموں کے لیے مخصوص تھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا مصری نے ایک مدرسہ مصر میں قائم کیا۔ جس کا نام "مدرسہ مصطفیٰ کامل تھا۔ ۷ مارچ ۱۸۹۹ء میں اس درس گاہ کا افتتاح ہوا۔

امیر تیمور اور اس کے جانشینوں نے علم و ہنر کو ترقی دینے کے لیے مدارس قائم کئے۔ ہر مدرسہ میں علماء اور مدرسین مقرر کئے۔ وہ علوم دینیہ کا درس مسلمانوں کو دیتے تھے۔ امیر تیمور اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

"میں نے دین حق کے پھیلانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمام مسلمانوں کا ایک صدر مقرر کر دیا جو کہ ان سے اوقاف کی پابندی کراتا۔ متولیان مسجد اور مؤذن مقرر کرتا۔ قاضیوں، مفتیوں اور محتسبوں کا تعین کرتا اور علماء و مشائخ کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر کرتا۔ اس نے شہر میں مدارس کھولے جہاں قابل اور نامور اساتذہ مسلمانوں کو علوم دینیہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ہیرلڈلیم لکھتا ہے کہ

"شہر سمرقند تیمور کے ہاتھوں میں آکر ایشیا کا روم بن گیا۔ ارباب علم و فضل کے بڑے بڑے مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے"۔

سمرقند میں ایک قدیم مدرسہ "مدرسہ بی بی خانم" تھا جسے تیمور کی چینی بیوی نے تعمیر کرایا تھا تیمور کے بیٹے شاہ رخ اور اس کے پوتے الغ بیگ نے ہرات کو بھی علم و ہنر کا مرکز بنایا۔ یہاں بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ عثمانیہ بہت مشہور تھے۔

ترک ملوک اور امراء نے ترکستان کو اسلامی علوم کا مرکز بنا دیا۔ ترکستان کے شہر بخارا، سمرقند، مرو، ہرات، ترمذ، بلخ اور کاشغر اسلامی علوم کے سرچشمہ تھے۔ بخارا کے مدرسہ مزدہرہ میں پانچ ہزار کے قریب طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔

مدرسہ کوکلتاش (قائم شدہ ۱۴۶۷ء) میں ایک سو پچاس کمرے تھے۔ مدرسہ میرعرب قائم شدہ ۱۵۲۹ء) میں ایک سو کمرے تھے۔ بخارا کا یہ مدرسہ وسط ایشیا کے قدیم ترین مدرسوں میں ایک ہے۔ شیردار، مدرسہ طلاکاری، اور مدرسہ الغ بیگ قابل ذکر ہیں۔

جزیرہ جاوا میں مدارس کی تعداد۔ سر تھامس آرنلڈ اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھتا ہے ۱۸۸۳ء میں جزیرہ جاوا میں ۱۰۹۱۳ مدرسے تھے جن میں ۲۰۰۰۶۴ طالب علم دینیات پڑھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء سے تین سال کے عرصے میں مدارس اسلامیہ کی تعداد میں ۳۳ فیصد کا اضافہ ہوگیا۔ ۱۸۸۵ء میں ۱۶۷۶۰ مدرسے ہو گئے جن میں ۲۵۵۱۴۸ طلبا پڑھتے تھے

غزنوی خاندان نے علم وفن کی ترویج واشاعت کے لیے عالی شان درس گاہیں قائم کیں سبکتگین کے تیسرے بیٹے ابوالمظفر نصر نے نیشاپور میں مدرسہ سعیدیہ قائم کیا جس کو مورخین امہات المدارس میں شمار کرتے ہیں۔ نیشاپور کے باشندوں نے ایک مدرسہ "مدرسہ نصریہ" امام ابوبکر فورک (م ۴۰۶ھ) کے لیے قائم کیا۔

سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۰ھ (۱۰۱۹ء) میں اپنے دارالحکومت غزنین میں ایک عالی شان دارالعلوم قائم کیا جس میں اس دور کے مشہور علماء درس دیا کرتے تھے۔ محمود کے بیٹے شہاب الدین مسعود (۴۲۲ھ - ۴۳۲ھ) نے فرشتہ کے بیان کے مطابق تمام شہروں میں اس قدر مدارس اور مساجد تعمیر کرائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے قاصر تھے۔ روضۃ الصفا کا مصنف لکھتا ہے کہ مسعود نے ممالک محروسہ کے مختلف حصوں میں اس کثرت سے مساجد اور مدارس تعمیر کرائے کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔

ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ - ۴۹۲ھ) نے غزنین اور اطراف میں چار سو سے زیادہ مدارس ومساجد تعمیر کرائے۔ امین احمد رازی مولف ہفت اقلیم کے بیان کے مطابق غزنین میں مدرسوں اور مسجدوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی۔

غزنوی خاندان کے بعد غور خاندان کا عروج ہوا۔ سلطان محمد غوری نے صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی کے لیے ہرات میں جامع مسجد کے قریب مدرسہ بنوایا۔

برصغیر پاک وہند کے مدارس

سلطان شہاب الدین محمد غوری نے (۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء) میں اجمیر کی فتح کے بعد متعدد مدرسے قائم کیے۔ ناصر الدین قباچہ نے علامہ قطب الدین کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور مولانا اس کے شیخ المدرس مقرر ہوئے۔ قباچہ کے عہد میں اوچ تعلیم و تدریس کا بڑا مرکز تھا۔ مدرسہ گازرونی اور مدرسہ فیروزیہ قائم تھے۔

التمش نے دارالحکومت دہلی میں متعدد مدارس قائم کیے اور دہلی کا مشہور مدرسہ معزی اس کے عہد حکومت کی یادگار ہے۔ اس عہد میں ایک عظیم الشان مدرسہ کا پتہ چلتا ہے جس کا نام مدرسہ ناصریہ تھا۔

دہلی میں ایک اور مدرسہ علاؤ الدین خلجی کے مقبرے میں مسجد قوۃ الاسلام اور قطب صاحب کی لاٹ کے متصل واقع تھا ۷۵۳ھ میں فیروز شاہ نے فیروز آباد دلی میں مدرسہ فیروز شاہی قائم کیا۔ شیر شاہ سوری نے نارنول (ضلع پٹیالہ) میں ایک شاندار مدرسہ قائم کیا۔ جو "شیر شاہی مدرسہ" کے نام مشہور ہوا۔ اس مدرسہ کی تعمیر ۹۲۷ھ / ۱۵۲۰ء

میں ہوئی۔

ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے۔ جلال الدین اکبر نے اکبرآباد (آگرہ) میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ اس مدرسہ میں درس و تدریس کے لیے چلپی بیگ نامی ایک فاضل کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اکبر کی مرضعہ ماہم بیگم نے ۹۶۹ میں پرانے قلعہ کے پاس مغربی دروازے کے مقابل ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا جس کا نام خیر المنازل رکھا گیا فتح پور سیکری میں ایک دار العلوم قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں بہت سے جامعات تھے۔ گجرات میں ایک مدرسہ صادق خان نے تعمیر کرایا۔ اجمیر میں "مدرسہ معین الدین" کے نام سے تعمیر کرایا گیا۔ جہانگیر کے عہد میں بڑے بڑے علماء درس و تدریس کے کام میں مصروف تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں لاہور، احمد آباد، دہلی اور جونپور درس و تدریس کے اہم مرکز تھے۔ دہلی میں جامع مسجد کے جنوبی رخ پر شاہی مدرسہ تھا جس کا نام دار البقا تھا۔ اس مدرسہ کی بنا تخمیناً ۱۰۶۰ھ عہد شاہ جہانی ہے۔

اورنگ زیب نے جبری تعلیم کی۔ مسٹر گبن کے بیان کے مطابق اورنگ زیب نے اپنے حدود مملکت میں بے شمار دار العلوم اور مدارس قائم کیے۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں برصغیر پاک و ہند کی تعلیمی حالت کے متعلق کپتان الیگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔ "شہر ٹھٹھ (سندھ) علوم فقہ، فلسفہ، سیاست کے لیے مشہور ہے۔ ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لیے چار سو تعلیمی ادارے تھے۔"

قنوج میں ایک عالی شان دار العلوم تھا۔ جو فخر المرابع کہلاتا تھا۔ محمد ولی اللہ مصنف تاریخ فرخ آباد نے ایک ایک مدرسہ فرخ آباد میں تعمیر کرایا جس کا نام فخر المرابع یا مربع المفاخر تھا۔ دہلی میں ایک مدرسہ امیر غازی الدین خان فیروز جنگ نے اجمیری دروازہ کے قریب تعمیر کرایا۔ دہلی کا سب سے آخر الذکر مدرسہ شاہ عبد الرحیم صاحب دہلوی کا ہے یہی وہ مدرسہ ہے جس کے آغوش میں شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی، اسماعیل، شاہ اسحاق، شاہ عبد القادر وغیرہ نے علمی پرورش پائی۔

ملا قطب الدین شہید سہالوی کے نامور فرزند ملا نظام الدین نے فرنگی محل کو ہندوستان کا علمی مرجع بنایا۔ فرخ سیر کے عہد میں حاجی صبغت اللہ محدث نے ۱۱۲۸ھ میں مدرسہ قدیمہ قائم کیا۔ ملا قطب الدین گوپاموی میں حاجی صبغت اللہ نے خیرآباد میں

مولانا فضل حق نے سرہند میں مولانا عادل نے آگرہ میں شاہ محمد سلیمان نے تونسہ میں قاضی مبارک شارح مسلم نے دہلی میں مدرسے قائم کیے۔ اور مدتوں درس و تدریس میں مشغول رہے۔

لاہور میں ایک درس گاہ میاں وڈا (حافظ محمد اسماعیل) کی تھی۔ احمد آباد گجرات میں مولانا نورالدین نے عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ کے عہد میں حضرت شاہ فخرالدین دہلوی کا مدرسہ حقائق و معارف کی درسگاہ تھی۔

جب دہلی کی حکومت کمزور ہوگئی تو اکثر صوبوں کے گورنر اور امراء نے مرکزی حکومت سے علیحدہ ہوکر خودمختاری کا اعلان کردیا۔ برصغیر میں متعدد خودمختار سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ان سب خودمختار سلطنتوں نے علوم و فنون کی بہت خدمت کی۔

جب ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی متفرق ریاستیں انگریز کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے پامال ہوگئیں تو تب بھی علماء کرام نے علم کی شمع کو روشن رکھا۔ علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت کے لیے مدارس اور دارالعلوم کھولے۔ چند مشہور دارالعلوم کے نام حسب ذیل ہیں۔

دیوبند (سہارنپور) دیوبند کی ابتداء جنگ آزادی سے دس سال بعد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ہوئی۔ اس کے محرک مولوی فضل الرحمٰنؒ اور مولوی ذوالفقار علیؒ اور پہلے مدرس ملا محمد محمودؒ صاحب تھے۔ دیوبند کی تعلیم مسجد چھتہ میں شروع ہوئی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے شروع میں ہی اس ادارہ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ مولانا نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی دن رات کوششوں نے اس ادارہ کو بہت جلد بام عروج تک پہنچا دیا۔ آج دارالعلوم کے احاطہ میں کئی لاکھ کی عمارتیں ہیں دو تین سو بڑی درس گاہیں ہیں آٹھ ہوسٹل ہیں تقریباً چار سو حجرے ہیں اور ایک عظیم الشان لائبریری ہے۔

اس دارالعلوم کی عظمت کے متعلق علامہ رشید رضا نے فرمایا "اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہوکر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علوم اعلیٰ پیمانہ پر ہے۔" ؎١

ندوۃ العلماء: قدیم اور جدید علوم کو جمع کرنے کے لیے ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی اساس رکھی۔ اس خیال کے اصل محرک مولوی عبدالغفورؒ صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس کی تکمیل کرنے والے مولوی سید محمد علیؒ صاحب کانپوری تھے جو اس کے بانی اور ناظم اول تھے۔ مولانا شبلیؒ اور مولوی عبدالحق صاحب دہلوی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ سرسید

؎١ موج کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام صفحہ ۲۱۰

نے اس ادارہ کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ وہ مولوی محمد علیؒ صاحب ناظم ندوۃ العلماء کو لکھتے ہیں:

"ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے اس کو چلنے دینا چاہیے خدا اس کا نیک نتیجہ پیدا کرے۔ اگرچہ مجھ کو کچھ توقع نہیں کہ باہم علماء کا اتفاق ہو، الا کوشش ضرور ہو"۔ [1]

جامعہ ملیہ دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء مولانا محمد علی جوہر نے اپنے چند دوسرے رفقاء کے ساتھ مل کر رکھی ہے۔ یہی زمانہ تحریک خلافت اور عدم تعاون کا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ طلباء میں قومی خدمت اور قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس جذبہ کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ طلباء کو سادہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی جائے۔ تیسرا مقصد صنعت وحرفت کی تعلیم تھی۔ چوتھا مقصد تصنیف وتالیف تھا۔ چنانچہ دارالاشاعت جامعہ نے بہت عمدہ کتب شائع کی ہیں۔

پاکستان کے چند مشہور دارالعلوم

۱۔ جامعہ اشرفیہ۔ جامعہ قدیم کی بنیاد ۱۹۰۷ء/۱۳۲۵ھ نیلا گنبد لاہور میں رکھی گئی۔ جدید جامعہ کی عمارت مسلم ٹاؤن فیروز پور روڈ لاہور پر واقع ہے۔

۲۔ دارالعلوم حقانیہ: اکوڑہ خٹک تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور میں واقع ہے ۱۹۴۷ء میں بنیاد رکھی گئی۔

۳۔ مدرسہ خیر المدارس: اورنگ زیب روڈ ملتان پر واقع ہے ۱۹۴۷ء میں بنیاد رکھی گئی۔

۴۔ دارالعلوم جامعہ اشرفیہ: عیدگاہ روڈ پشاور پر واقع ہے ۱۹۵۲ء/۱۲۷۳ھ میں بنیاد رکھی گئی۔

۵۔ دارالعلوم سرحد بیرون آسیا گیٹ پشاور

۶۔ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ: بھیرہ ضلع سرگودھا میں واقع ہے۔ ۱۹۵۷ء/۱۳۷۴ھ میں بنیاد رکھی گئی۔

۷۔ دارالعلوم جامعہ نعیمیہ: محمد نگر علامہ اقبال روڈ لاہور پر واقع ہے۔ اس ادارے کے بانی مولانا محمد حسین نعیمی ہیں ۱۹۵۸ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔

۸۔ الجامعۃ الاسلامیہ: (اسلامی یونیورسٹی) بہاول پور میں واقع ہے۔ ۱۹۶۳ء/۱۳۸۳ھ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی گئی۔

---

[1] معارف نمبر ۱ جلد ۴۔

۹- دارالعلوم کراچی ۔ اس عالی شان تعلیمی ادارہ کے بانی مولانا محمد شفیع صاحب تھے ۔ دارالعلوم کی تاسیس نانک واڑہ (کورنگی) میں ۱۱ شوال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶ جون سنہ ۱۹۵۲ء کو رکھی گئی ۔

۱۰- مدرسہ عربیہ اسلامیہ بانی و مہتمم شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوری ہیں ۔ محرم ۱۳۷۴ھ مطابق اگست ۱۹۵۵ء کو نیوٹاؤن جمشید روڈ کراچی میں بنیاد رکھی ۔

دُنیائے اسلام کی مشہور یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے

نام یونیورسٹی	نام ملک
۱- جامعہ ازہر	متحدہ عرب جمہوریہ (قاہرہ)
۲- جامعہ اسلامیہ	سعودی عرب (مدینہ منورہ)
۳- شریعت کالج	سعودی عرب (مکہ معظمہ)
۴- کلیۃ الدراسات الاسلامیہ	عراق (بغداد)
۵- جامعہ القرویین	مراکش (فاس)
۶- جامعہ زیتونہ	تونس (تونس)
۷- جامعہ سنوسیہ اسلامیہ	لیبیا (البیضا)
۸- حوزۂ علمیہ	ایران (قم)
۹- شریعت کالج	شام (دمشق) بند کردی گئی
۱۰- جامعہ اسلامیہ	سوڈان (ام درمان) بند کردی گئی ۔

معاشرے کی اصلاح میں مکتب کے فرائض

علم کی اشاعت جیسا کہ پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے اسلامی نقطۂ نگاہ سے علم کا حصول اور اشاعت لازمی ہے۔ سب سے پہلے جو وحی رسول کریم صلعم پر نازل ہوئی وہ علم سے تعلق رکھتی ہے۔ رسول کریم صلعم نے علم کے پھیلانے کی طرف خاص توجہ دی آپ کی نظر میں علم اتنا ضروری تھا کہ جب جنگ بدر میں قیدی پکڑے گئے تو رسول کریم صلعم نے خواندہ قیدیوں پر رہائی کی یہ شرط عائد کر دی کہ وہ دس دس مسلمانوں کو پڑھائیں پھر آپ نے صحابہ کرام کو یہ تلقین کی کہ جو باتیں سنتے ہیں وہ دوسروں تک پہنچائیں پس علم کا حاصل کرنا اور اس کی اشاعت اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت ضروری ہے۔ مدارس اور مکاتیب علم کی اشاعت کا مرکز ہوتے تھے۔

اتحاد اسلام بنی نوع انسان کو اتحاد کی لڑی میں منسلک کرنے کے لیے آیا ہے۔ یہی وہ دین ہے جس نے یہ پیغام دیا ہے کہ تمام نسل انسانی ایک اصل سے ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے: یَاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ [1] اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا [2] تمام انسان ایک ہی امت تھے پھر الگ الگ ہو گئے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ [3] سب مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: ان العباد کلھم اخوۃ [4] انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

الاسلام احوج الی الجماعۃ [5] اسلام اجتماعی نظام چاہتا ہے۔

الجماعۃ رحمۃ والفرقۃ عذاب۔ جماعت پر رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

---

[1] النساء: ۱ [2] یونس ۱۰: ۱۹ [3] الحجرات ۴۹: ۱۰ [4] احمد ابوداؤد [5] کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔

مکتب رسول کریم صلعم کی تعلیم اتحاد کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین ذریعہ ہے جب طلباء مکتب میں جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں ان کے باہمی تعلقات بڑھتے ہیں تو ان میں اتحاد کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے جس کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔

مساوات اسلام نے مساوات بین الناس پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ [1] اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور اللہ خوب جانتا ہے اور خبردار ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول کریم صلعم نے اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا:

"لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کے سبب سے" [2]

مکاتیب مساوات کا سبق دیتے ہیں۔ غریب امیر سب ایک جگہ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ایک دوسرے سے برتری اور فضیلت کا جذبہ سرد ہو جاتا ہے۔

نظم و ضبط کی تربیت تمام مکاتیب کے قوانین و ضوابط ہوتے ہیں۔ جو طالب علم کسی مکتب میں داخل ہوگا۔ وہ ان قوانین کا جوا اپنی گردن پر رکھے گا۔ اور ان کے مطابق اپنی طالب علمی کا زمانہ گزارے گا جس سے طالب علم میں نظم و ضبط کی تربیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً وقت پر مکتب آنا۔ وقت کے مطابق اپنے اسباق پڑھنا۔ وقت پر کھیلنا۔ دوسروں کے لیے ایثار اور قربانی کرنا۔ استاد کی اطاعت کرنا۔ ساتھیوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا یہ سب امور مکاتیب سے سیکھے جاتے ہیں

اخلاق کی تربیت اخلاق اسلام کی تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم حصہ ہے۔ [3] رسول کریم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

---

[1] الحجرات: ۴۹: ۱۳ [2] مسند احمد

[3] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵

کہ میری بعثت ہی اس مقصد سے ہوئی ہے کہ مکارم اخلاق کی عمارت کو مکمل کروں۔

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا [۱] مومنوں میں سے ایمان کے لحاظ سے کامل وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

خِیَارُکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا [۲] تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ [۳] اور جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں وہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا [۴]

کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کیا اور ناکام ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی میل سے گندا کیا۔

مکتب طالب علم کو اخلاق اور آداب سکھانے کی جگہ ہے۔ استاد طالب علموں کو اخلاق سنوارنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ تاکہ طالب علم صحیح معنوں میں اچھا شہری بن سکے گویا مکاتیب اور مدارس اخلاق سنوارنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

اسلام رواداری کا مذہب ہے۔

مذہبی رواداری: ارشادِ الٰہی ہے: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ [۵] یعنی دین کے بارہ میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی ہے۔

اسلام ہر ایک سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہر مذہبی کتاب اور رسول پر ایمان لائے اور کسی کے درمیان تفریق نہ کرے

ارشادِ الٰہی ہے۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ [۶]۔

---

[۱] ترمذی [۲] بخاری [۳] بقرہ ۲: ۸۲ [۴] الشمس ۹۱: ۱۰ [۵] البقرہ ۲: ۲۵۶ [۶] آل عمران ۳: ۸۴

کہ ہم ایمان لائے اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

مکتب طلبار کو مذہبی رواداری کا سبق دیتا ہے۔ مختلف مذاہب اور فرقوں کے طالب علم۔ مکتب میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک استاد سے اکٹھے سبق لیتے ہیں اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے طلبار کا ایک جگہ بیٹھنا اور ایک ہی استاد سے سبق لینا ان کے مذہبی تعصب کو سرد کر دیتا ہے اور جذبہ رواداری کو ابھارتا ہے۔

جمہوری اقدار کی تربیت: جب ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ دوسروں سے مل کر رہنے اور کام کرنے کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ اچھے اور بروں سے برتاؤ کرنے کی تربیت پاتا ہے۔

روحانی تربیت مدارس صرف ذہنی اور اخلاقی اور جسمانی تربیت کا ہی مقام نہیں بلکہ روحانی تربیت کا بھی مہد ہیں۔ رسول کریم صلعم کے عہد مبارک میں صفہ مسجد نبوی کا مکتب ہی تھا۔ وہاں صرف دینی علم ہی نہیں پڑھایا جاتا تھا بلکہ روحانی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ اس مکتب کے فارغ التحصیل تھے۔

جسمانی تربیت کسی قوم کی ترقی اور اصلاح نوجوان کی جسمانی تربیت پر منحصر ہے۔ مکاتب اور مدارس جہاں طالب علموں کی ذہنی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے ہیں وہاں ان کی جسمانی تربیت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک طالب علم اخلاقی اور روحانی تربیت کے زیور سے آراستہ ہو کر مدرسہ سے فارغ ہوتا ہے۔ اور معاشرہ کا ایک اچھا شہری ثابت ہوتا ہے۔

معاشرہ میں اُستاد کا مقام

معلم اول اللہ تعالیٰ ہے جس نے آدم کو اسماء سکھلائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا[1] اور آدم کو سب نام سکھلائے۔ پھر انبیاء علیہم

[1] البقرہ ۲: ۳۱

السلام کو معلمین بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے نسلِ انسانی کو روحانی۔ معاشرتی۔ اخلاقی اور اقتصادی علوم سکھائے۔ حقیقت میں تہذیب انسانی کے بانی انبیاء علیہم السلام کا ہی گروہ ہے سب کے آخر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کی طرف بھیجا۔ اور ایک ایسا علم کا خزانہ دیا جو نہ پہلوں کو ملا تھا۔ اور نہ بعد میں کسی کو ملے گا۔ اور وہ کتاب لائے جو ہر قسم کے علوم سے بھری ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ [۱] وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے۔ اور انہیں حکمت سکھاتا ہے

اس آیت کریمہ میں يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معلم کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ جب قرآن مجید کی رو سے معلم اول اللہ تعالیٰ اور آخری معلم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ اسلامی معاشرہ میں معلم کا کیا مقام ہے۔ معلم ہی وہ ذات ہے جو علم کو ترویج دیتی ہے جاہلوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرتی ہے دلوں کو تاریک کوٹھڑیوں کو علم کی روشنی سے منور کرتی ہے اور علم کی روشنی میں ہی قوم ترقی کرتی ہے۔ گویا معلم کی ذات قوم کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ تاریخ بھی اس امر پر شاہد ہے کہ دنیا میں اسی قوم نے ترقی کی منازل طے کی ہیں جو علم کے زیور سے آراستہ تھی۔ عرب کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب قوم تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی تھی۔ تنزل کی وجوہ میں سے ایک وجہ امی ہونا ہے جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے جب اس امی قوم کے دل علم کے نور سے منور ہوئے تو یہ قوم نہایت ہی قلیل عرصہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی گئی۔ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

تاریخ سے یہ ظاہر ہے۔ ہر وہ قوم جو عروج کے آسمان پر نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں علم کی شمع تھی۔ اور یہ شمع معلمین کے ذریعہ روشن ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہر ترقی یافتہ قوم معلمین کو معاشرہ میں ایک بلند درجہ دیتی ہے۔

بعض علماء نے تو معلمین کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا ہے بے ادب طالب علم بے دین ہے جس نے شیطان کو اپنا رہنما بنا لیا ہے [۲]

---

[۱] الجمعہ ۶۲ : ۲ [۲] المشکوٰۃ۔ جنرل ایشیا مارچ ۱۹۸۰ء ص ۲۸۴

حضرت مصعب بن زبیر فرماتے ہیں

"لوگوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس میں بہترین بات منہ سے نکالتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے۔ اس میں سے بہترین چیز سیکھ لیتے ہیں۔ اور جو کچھ سنا ہے اس میں سے بہترین بات لکھ لیتے ہیں لہٰذا اگر تمہیں علم کی تلاش ہے تو اسے کسی کے ہونٹوں سے حاصل کرو۔ اور اس طرح تمہیں چیدہ اور برگزیدہ علم حاصل ہوگا [1]

امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

"جو شخص صرف کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہ ہوگا۔ جس کی اسے ضرورت ہے"۔ [2]

اخوان الصفا نے لکھا ہے۔

"ہر شخص کی قوت سے باہر ہے۔ کہ وہ صرف اپنی کوشش سے علم حاصل کرے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہے جو حصول علم، تعمیر سیرت اور اس کے عقائد و اعمال میں رہنما کا کام دے"۔ [3]

جب ہم مسلمانوں کی ترقی کے زمانہ کی حکومتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو یہ بات بڑی نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ ان حکومتوں نے اساتذہ کو معاشرہ میں ایک بلند مقام دیا تھا۔ مثال کے طور پر علی بن حسن الاحمر خلیفہ کے محل کے محافظوں میں شامل تھا۔ وہ صرف ایک کمرہ میں رہتا تھا۔ جس میں معمولی ساز و سامان تھا۔ جب الاحمر ہارون رشید کے لڑکے کا اتالیق مقرر ہوگیا تو اس کے بعد محمد بن الجہم ان کی زندگی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔ جب کبھی ہم الاحمر کے پاس جاتے تو ہمیں متعدد ملازمیں سے واسطہ پڑتا جو ہمیں اس حویلی میں لے جاتے ہیں۔ جو بادشاہوں کے محلات کے مانند ہوتی اور پھر الاحمر ہمارے پاس شاہی خلعت میں ملبوس آتا [4]

ہارون الرشید کی خدمت میں ایک مختصر رسالہ پیش کیا گیا۔ جس میں اس کے لیے وہ فرائض درج تھے۔ جو خلیفہ کی حیثیت سے سرانجام دینے تھے۔ اس میں اس موضوع سے متعلقہ چند سطور رقم کی جاتی ہیں۔

---

[1] محاضرات الابرار محی الدین عربی غیر مطبوعہ ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر احمد شبلی ص ۹۵ [2] تذکرہ السامع (ابن جماعہ ص ۸۷) [3] رسائل اخوان الصفا جلد ۴ ص ۱۸ [4] معجم الادباء (یاقوت) جلد ۵ ص ۱۱ ۔

"یہ بات گرہ میں باندھ رکھو کہ علماء کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک روشن چراغ یا تاریکی میں لٹکے ہوئے روشنی کے فانوس ۔ ان چراغوں سے جو روشنی سلطنت میں پیدا ہوتی ہے ۔ اس کا انحصار اس توجہ پر ہے جو تم ان پر مبذول کرو گے"[1]

کسی بڑے خلیفہ سے یہ سوال کیا گیا ۔

خدا نے دنیا اسلام میں تمہیں بہترین درجہ عطا کیا ہے ۔ کیا تمہیں اب بھی کسی چیز کی تمنا ہے ؟ خلیفہ نے جواب دیا ہاں ایک مقام ایسا ہے جو ان سب چیزوں سے بڑھ کر ہے ۔ جو مجھے حاصل ہیں اور جس کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی ۔ اور وہ یہ ہے ۔ کہ کسی عالم کی مسند پر بیٹھ کر لوگوں کو درس دیا جائے ۔ اور انہیں فیض پہنچایا جائے[2]

ایک موقع پر ہارون الرشید کو محمد بن الحسن اور ان کے سامعین کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوا ۔ سوائے محمد بن الحسن کے باقی تمام لوگ خلیفہ کو سلام کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے ۔ جب خلیفہ نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا ۔ چونکہ میرا تعلق علماء سے ہے لہٰذا نوکروں جیسے کام کرنے سے مجھے نفرت ہے[3]

الملک الافضل روزانہ بلاناغہ کتابیں خود لے کر محل شاہی سے نکلتا اور تاج الدین الکندی کے معمولی مکان پر جایا کرتا تھا بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ جو سبق پہلے سے جاری ہوتا اس میں دیر ہو جاتی ۔ اور ایسی صورت میں الملک الافضل کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا جب تک اس کی باری آتی[4] نورالدین کے حضور کوئی قابل مواخذہ فعل قطب الدین الشافعی سے منسوب کیا گیا ۔ نورالدین نے جواب دیا ۔ اگر یہ بات صحیح ہے ۔ تو اس کا علم و فضل اس کی تلافی کر دے گا[5]

اساتذہ کا کردار اور فرائض

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا ۔ جب تک

---

[1] ہارون الرشید کے لیے نصیحت غیر مطبوعہ استنبول ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ڈاکٹر احمد شلبی [2] معجم ابن حجر ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ [3] تذکرۃ السامع دا لمتکلم ص ۸۹ [4] المقصورۃ التاجیہ (دہمان) ص ۱۱ [5] مفرج الکروب (ابن واصل) غیر مطبوعہ کیمبرج ماخوذ از تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ۔

اس کے پیچھے قائد کے کردار کی قوت نہ ہو۔ اساتذہ صرف طلباء کو چند کتابوں کے پڑھانے پر مامور نہیں ہوتے بلکہ طلباء کے اندر ایک ذہنی اخلاقی روحانی انقلاب پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ انقلاب اس وقت تک رونما نہیں ہو سکتا۔ جب تک استاد اخلاق کے بلند مقام پر نہ کھڑا ہو۔ رسول کریم صلعم جب دنیا میں ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین پیدا کرنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ تو اپنے مخاطبین کے سامنے اپنا کردار پیش کیا۔ اور کسی مخالف نے آپ کے کردار پر انگلی نہ رکھی۔ اس بلند کردار کی وجہ سے ہی آپ عرب میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے۔

قرآن مجید میں یہ آیت لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ (تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تمہارا عمل نہیں ہے) اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیئے۔ اور ایک استاد کو یہ سبق دیتی ہے کہ وہ اخلاق حمیدہ سے متصف ہو۔

استاد کے فرائض

شفقت

استاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ شاگرد سے شفقت اور پیار سے پیش آئے۔ رسول کریم صلعم کا ارشاد ہے۔ انما انا لکم مثل الوالد للولد[1] میں تمہارے لیے ویسا ہی ہوں جیسے باپ اپنے بیٹے کے لیے۔ استاد کی شفقت ایسی ہی ہونی چاہیئے جیسا کہ باپ کی بیٹے کے ساتھ

اگر استاد کا دل شفقت اور محبت کے جذبہ سے عاری ہوگا تو شاگرد کا دل بھی اس کی طرف مائل نہیں ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شاگرد علم کی دولت سے محروم رہے گا۔

نئے سبق کی تیاری

استاد نے جو نیا سبق طلباء کو پڑھانا ہو وہ اچھی طرح تیار کر کے آئے۔ نئے سبق کا خاکہ ذہن میں ہو۔ اور سلیس رواں فصیح زبان میں پیش کرے۔ جب تک استاد نئے سبق کی تیاری گھر پر نہیں کرتا تو وہ اپنے علم کو بڑھا سکتا ہے اور نہ طالب علم میں ذوق اور شوق علم بڑھا سکتا ہے۔

وسعت مطالعہ

استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ مطالعہ سے اپنا علم بڑھاتا رہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلعم کو یہ دعا سکھائی ہے

---

[1] ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا اے اللہ میرے علم کو بڑھا۔ جب رسول کریم صلعم جیسا شخص جو اپنے علم اگلے اور پچھلے سب انسانوں سے افضل ہے علم کی بڑھوتی کے لیے ہر وقت دعا کرتا ہے۔ تو عام انسان کے لیے تو بدرجہ اتم ضروری ہے۔ کہ وہ ہر دم اپنے علم کو بڑھانے کی فکر کرے۔ علم دو طرح سے بڑھتا ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ سے۔ استاد کثرت سے مطالعہ کرے۔ اور سیر و سیاحت سے اپنے مشاہدات کو بڑھائے۔ ہر علم و فن میں پختگی اور مہارت صرف مطالعہ اور مشاہدہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک استاد اپنے علم و فن میں کامل نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ طالب علم کی علم کے میدان میں صحیح طور پر رہنمائی نہیں کر سکتا۔

حکمتِ تعلیم استاد اپنے شاگردوں کو ان کی قابلیت کے مطابق پڑھائے رسول کریم صلعم فرماتے ہیں۔ کلموا الناس علی قدر عقولھم یعنی لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات چیت کرو۔

جسمانی سزا سے احتراز شاگرد کو جسمانی سزا دینے سے حتی الامکان احتراز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جسمانی سزا نفرت اور بغض کا باعث بن جاتی ہے۔ جب شاگرد کے دل میں اساتذہ کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے۔ تو وہ استاد سے نور علم حاصل نہیں کر سکتا۔ استاد کا صرف یہ فرض ہے کہ اگر شاگرد سے کسی قسم کی غلطی سرزد ہو جائے تو وہ محبت اور مشفقانہ انداز میں شاگرد کی غلطی کی نشان دہی کر دے۔

جسمانی سزا سے طالب علم کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔ عزت نفس کچلی جاتی ہے۔ خودداری اور عزت نفس ہی انسان کی ذہنی اور اخلاقی استعدادوں کو جلا بخشتی ہے۔

جسمانی صحت کا خیال استاد کا یہ فرض ہے کہ شاگرد کی جسمانی صحت کا خیال رکھے کیونکہ صحت پر عقل اور ذہانت کا دارومدار ہے۔ اگر شاگرد کی صحت خراب ہوگی تو وہ محنت کرنے سے جی چرائے گا۔

نظم و ضبط کی پابندی نظم و ضبط کی پابندی استاد پر فرض ہے۔ اگر استاد نظم و ضبط قائم نہ رکھے گا تو شاگرد کی زندگی کبھی بھی نظم و ضبط کے تحت نہیں آسکتی۔ استاد نظم و ضبط کی پابندی کرے گا تب شاگرد بھی نظم و ضبط کا خیال رکھے گا۔

ایثار استاد کے اندر ایثار اور قربانی کا جذبہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے گزرے ہوئے مشہور اساتذہ کی زندگی ایثار اور قربانی کا نمونہ تھی۔

سادگی سادگی اور پاکیزگی انسان کا زیور ہے۔ جو آدمی اس زیور سے آراستہ ہوگا وہ قابل تکریم و تعظیم ہے۔ استاد کو سادہ زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ تصنع اور بناوٹ اس کے قریب تک پھٹکنی نہیں چاہیے۔ کیونکہ سادگی بیشمار خوبیوں اور اچھائیوں کو جنم دیتی ہے اور بیشمار برائیوں سے روکتی ہے۔ سادہ آدمی مخلص وفادار اور ہمدرد ہوگا اور تکبر اور ریاکاری سے دور رہے گا۔

ترویج علم رسول کریم صلعم کے نقش قدم پر چل کر ترویج علم میں کوشش کرے۔ اور کسی معاوضے کی امید نہ رکھے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ کہہ دو کہ ہم تم سے اس تعلیم کے لیے نہ تو بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ!

غور و فکر کرنے کی تلقین ذہنی استعدادیں غور و فکر سے ہی ترقی کرتی ہیں اس وجہ سے قرآن مجید نے انسان کو بار بار غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے اس لیے استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ شاگرد کو ہمیشہ غور و فکر کرنے کی تلقین کرتا رہے تاکہ طالب علم محض استاد کا ہی نقال بن کر نہ رہ جائے۔

شاگرد کے فرائض

برائیوں سے اجتناب برائی غیر طبعی فعل ہوتا ہے۔ ہر غیر طبعی فعل انسان کے دل اور عقل پر پردہ ڈالتا ہے۔ اور نور طبیعت کو بجھاتا ہے اس سے صرف ذہانت اور فطانت ہی مردہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کی اندرونی شخصیت ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ہر قسم کی برائی سے مجتنب رہنے کی تعلیم دی ہے۔ ایک طالب علم کا پہلا فرض یہ ہے۔ کہ وہ ہر قسم کی برائیوں سے احتراز کرے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ علم دل کی عبادت اور باطنی نماز کا نام ہے۔

استاد کا احترام طالب علم کو چاہیئے کہ استاد کے احترام اور وقار کو بلند رکھے۔ کبھی بھی گستاخی اور تکبر سے پیش نہ آئے۔ اگر استاد کا مقام معاشرہ میں بلند نہ ہوگا۔ اور لوگوں کی نظر میں گرا ہوگا۔ تو اس سے طالب علم کبھی بھی استفادہ

نہیں کر سکے گا۔ طبرانی۔ حاکم۔ بیہقی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کاتب وحی رسول زیدؓ بن ثابت کسی جنازے میں شریک ہوئے۔ نماز جنازہ کے بعد سواری پر سوار ہونے لگے۔ تو عبداللہؓ بن عباس نے رکاب تھام لی۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے فرمایا اے رسول اللہ کے چچازاد بھائی رکاب چھوڑ دیجیے۔ ابن عباسؓ بولے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ عالموں اور بڑوں کی تعظیم اسی طرح کریں۔ یہ سن کر حضرت زید بن ثابتؓ نے ابن عباس کا ہاتھ چوم لیا۔ اور فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رسول کریم صلعم کے گھر والوں کا احترام اس طرح کریں۔

ایک دفعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ طلباء کو پڑھا رہے تھے کہ ایک سقہ پاس سے گزرا تو امام صاحب کھڑے ہو گئے اور فرمایا یہ میرا استاد ہے۔ طلباء نے کہا یا حضرت! آپؒ استاد فرمایا! ہاں۔ طلباء نے کہا آپ نے اس سے کیا سیکھا تھا۔ فرمایا اس نے مجھے بتایا تھا کہ کتا کب جوان ہوتا ہے۔

استاد کی ہدایات پر چلنا طالب علم کو چاہیے کہ وہ استاد کی ہدایات پر اور رہنمائی کے مطابق علم سیکھے۔ جو استاد بتلائے وہ یاد کرے تاکہ اس کا ذہن شکوک شبہات کا شکار نہ ہو۔ کیونکہ استاد نے تمام مسائل پر غور و خوض کیا ہوتا ہے۔ اور مسائل کی صحت اور درستگی پر پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ طالب علم چوں کہ پختہ ذہن نہیں ہوتا۔ اور مسائل کے ہر پہلو پر غور و فکر بھی کیا ہوا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہ لازمی ہے کہ طالب علم استاد کی ہی ہدایات کے مطابق مطالعہ کرے۔

اطاعت فی المعروف طلباء کو استاد کی اطاعت فی المعروف کرنا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے۔ انا عبد من علّمنی حرفا۔ جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھایا ہے اس کا غلام ہوں۔

حصول علم میں انہماک علم حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ طالب علم تمام مشاغل سے توجہ ہٹا کر صرف علم کی طرف ہی توجہ رکھے۔ حضرت امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ جب تک تم سب کچھ علم کو نہ دے ڈالو۔ علم تمہیں اپنا کوئی حصہ بھی نہیں دے گا۔ منتشر افکار کی مثال اس پانی کی مانند ہے جسے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کچھ نالیاں سورج کی گرمی سے خشک ہو جائیں گی اور ہوا انہیں اڑا لے جائے گی۔ کچھ زمین میں جاذب ہو جائیں گی کچھ انسان اور حیوان پی لیں گے اور پانی ختم ہو جائے گا لیکن یہی نالیاں متحد رہیں تو نہریں بن جائیں اور ناپید نہ ہوتیں۔

طالب علم کی توجہ علم پر ہی مرتکز رہنی چاہیے تاکہ ذہنی انتشار کی وجہ سے

طالب علم کی استعدادیں اور قابلیتیں ضائع نہ ہوں ۔

بلند نظری علم ایک پاکیزہ مقصد اور مطہر چیز ہے اس وجہ سے اس کا حصول بھی بلند اور پاکیزہ مقصد کے لیے ہونا چاہیئے ۔ عموماً طلباء کے سامنے علم حاصل کرنے کا مقصد صرف مادی فوائد ہوتے ہیں ۔ حالانکہ یہ مقصد نہایت ہی پست ہے ۔ طالب علم کے پیش نظر یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ وہ علم کے نور سے ملک اور اسلام کی خدمت کرے گا اور علم کے خزانہ سے نسل انسانی کو فائدہ پہنچائے گا ۔

محنت دنیا میں کوئی چیز بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی ۔ اس وجہ سے علم کے حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو محنت کرنا ضروری ہے ۔ صحابہ کرام کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے وہ ایک ایک حدیث سننے کے لیے سینکڑوں میل کے سفر پیدل کرتے اسی طرح ہمارے ائمہ اور مشہور اساتذہ نے علم حاصل کیا ۔ علم کے جہاں جہاں مرکز ہوتے وہاں جاتے اور علم کی دولت جمع کرتے ۔

مال خرچ کرنا جہاں علم کے حصول کے لیے محنت ضروری ہے وہاں روپیہ پیسہ بھی خرچ کرنا پڑتا ہے ۔ خاص طور پر ہمارے اس دور میں بغیر روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے علم حاصل ہی نہیں ہو سکتا ۔ سکولوں اور کالجوں میں فیس ادا کرنا پڑتی ہے ۔ کتب خریدنا ہوتی ہیں اگر کوئی شخص مال کو علم سے زیادہ پسند کرتا ہے تو وہ کبھی بھی علم حاصل نہیں کر سکے گا علم تو وہ دولت ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے گھر کا سب کچھ اثاثہ لٹانا پڑتا ہے ۔

تکبر سے اجتناب طالب علم کو اپنے علم پر تکبر نہیں کرنا چاہیے ۔ جب کسی عالم کے دل میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے ۔ تو علم کا نور بجھنا شروع ہو جاتا ہے

کامل دسترس جب تک طالب علم علم کی کسی شاخ میں کامل دسترس حاصل نہیں کر لیتا اس وقت تک کسی دوسرے علم کی طرف توجہ نہ کرے ۔

زائد علم کا پڑھنا بعض علوم ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں ۔ اس وجہ سے کامل دسترس اور مہارت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان تمام علوم کو پڑھا جائے جن کا آپس میں گہرا تعلق ہے ۔ مثلاً علم تفسیر ہے اس کے لیے حدیث، عربی ادب، تاریخ سابقہ کتب سماوی کا علم ضروری ہے ۔

مسجد

امام راغب کے نزدیک مسجد جیم کے کسرہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں موضع السجود یعنی وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے جبین نیاز رکھی جائے۔ اس کی جمع مساجد ہے ابن الاعرابی کہتے ہیں مسجد بفتح جیم "محراب البیوت" کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے زجاج نے مسجد کے معنی یہ بیان کئے ہیں۔ کل موضع یعبد فیہ فھو مسجد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجدًا وطھورا۔ یعنی ہر وہ جگہ جہاں عبادت ہوتی ہے وہ مسجد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنائی گئی ہے۔

قرآن مجید میں مسجد کا لفظ عبادت گاہ کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا [1] اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے نہ ہٹاتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے۔ گرا دی جاتیں۔

اِنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا [2] اور مسجدیں اللہ کے لیے ہیں سو اللہ کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ مسجد کا لفظ یہودیوں کے ہاں بھی مستعمل تھا۔ قرآن مجید اور حدیث سے بھی یہ شہادت ملتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی [3] وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ جو یہودیوں کا قبلہ تھا۔

بخاری کی کتاب الصلوٰۃ میں حبشہ کے گرجا کے نام سے پکارا گیا ہے۔

---

[1] الحج ۲۲: ۴۰ [2] الجن ۷۲: ۱۹ [3] بنی اسرائیل ۱۷: ۱ [4] ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون یعنی میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

ابن خلدون نے اپنی مشہور تصنیف (مقدمہ میں) مسجد کو عام عبادت گاہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

مسجد کی اہمیت اسلام میں مسجد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جب آدم علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔ تو تخلیق نسل انسانی کے منشا کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسے گھر کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں اللہ کے بندے اس کی عبادت کریں۔[1] سو اس خواہش کی تکمیل کے لیے مکہ میں ایک گھر کی بنیاد ڈالی۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ[2] پہلا گھر عبادت کے لیے جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا یقیناً وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے۔

بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابوذر غفاریؓ نے رسول کریم صلعم سے سوال کیا یا رسول اللہ ای مسجد وضع فی الارض اول؟ یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر پہلی مسجد کون سی ہے تو آپ نے جواب دیا مسجد الحرام یعنی خانہ کعبہ۔

مرور زمانہ سے جب یہ عبادت گاہ پیوند خاک ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو دوبارہ آباد کرنے کا کام دو عظیم الشان نبیوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سپرد کیا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ[3] اور جب ابراہیم گھر کی بنیادیں اٹھاتا اور اسمٰعیل بھی اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما تو سننے والا جاننے والا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا

وَّطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ[4]

اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نسل انسانی کی تخلیق کے ساتھ ہی مسجد کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔

عہد نبوی میں پہلی مسجد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی مصائب اور تکالیف سے لبریز تھی۔ اس تاریک اور آفات سے

---

[1] مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱ : ۵۶) یعنی میں نے جن والنس کو صرف اپنی عبادت کو پیدا کیا۔

[2] آل عمران ۳ : ۹۶ [3] البقرہ ۲ : ۱۲۷ [4] الحج ۲۲ : ۲۶

پُرفضا میں باضابطہ مسجد کا تعمیر کرنا مشکل تھا۔ جہاں مسلمان باجماعت نماز ادا کرسکتے۔ اور تو اور مسلمانوں کے لیے بیت اللہ میں جاکر عبادت کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر کسی مسلمان نے بیت اللہ میں جاکر نماز ادا کرنے کی کوشش کی تو کفار اس پر امنڈ پڑتے تھے اور اس کو مار مار لہولہان کر دیتے تھے۔ ان مصائب کے پیش نظر رسول کریم صلعم کسی صحابی کے گھر جاتے تمام صحابہ وہاں جمع ہوجاتے اور نماز پڑھ لیتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قبل ان یبنی المسجد حیث ادرکتہ الصلوٰۃ [1]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بننے سے قبل جہاں وقت آتا تھا نماز پڑھ لیتے تھے۔

جب اللہ کے حکم سے مکہ چھوڑ کر رسول کریم صلعم مدینہ رخصت ہو گئے تو مدینہ سے باہر مقام قبا میں نزول فرمایا۔ یہاں سب سے پہلا کام جو آپ نے انجام دیا وہ عبادت الٰہی کے لیے مسجد کی تعمیر تھی خود بھی صحابہ کرام کے ساتھ کام کرتے پتھر اٹھاتے تو جسم زخمی ہوجاتا تو عقیدت مند آتے اور کہتے: فداک ابی وامی آپ چھوڑ دیں ہم خود اٹھالیں گے یہی وہ مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ذکر ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ [2]

یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے زیادہ لائق ہے کہ تو اس میں کھڑا ہو۔

جب قبا سے مدینہ میں تشریف لائے تو سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر تھی۔ رسول کریم صلعم کا یہ عمل کہ تمام دینی اور سیاسی امور سے قبل مساجد کی تعمیر کی مسجد کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ اہمیت مسجد کے مسلمانوں کی روحانی تمدنی معاشرتی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے ہے۔ مسلمانوں کی مسجدیں دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حیثیت سے ہی نہیں رکھتیں بلکہ انہیں اسلامی معاشرہ میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

مسجد مذہبی مرکز کی حیثیت سے

ہر مذہب کا مرکزی نقطہ عبادت الٰہی ہے۔ کوئی ایسا رسول مخلوق کی ہدایت کے لیے نہیں آیا جس نے عبادتِ الٰہی پر سب سے زیادہ زور نہ دیا ہو۔ قرآنی نقطہ نگاہ سے نسل انسانی کی پیدائش کی غرض و غایت ہی عبادت الٰہی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا

---

[1] ابن ماجہ ج ا صفحہ ۲۵ [2] التوبہ ۹: ۱۰۸

خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1] اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں ۔

انسان کا اللہ کی عبادت بجا لانا اس کے اپنے فائدہ کے لیے ہے کیونکہ وہ اپنے کمال صرف عبادت الٰہی سے ہی حاصل کر سکتا ہے اس وجہ سے ہر مذہب نے عبادت الٰہی کو مرکزی حیثیت دی ہے ۔ اسلام نے تمام روئے زمین کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ[2] اے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ان کو جو تم سے پہلے گزرے ہیں ۔

قرآن مجید انبیاء علیہم السلام کی رسالت کی اصل غرض ہی یہ بیان کرتا ہے۔ کہ وہ لوگوں کو عبادت الٰہی کی دعوت دیں ۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ[3]

اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ لیکن نماز باجماعت مسجد میں ادا کرنا عبادت کا اہم جزو ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے، وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ[4] اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

نماز جمعہ کے متعلق آتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ[5] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے بلایا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف جلدی آجاؤ اور کاروبار کو چھوڑ دو ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: صلوٰۃ الجماعة تفضل صلوٰۃ الفذ بسبع وعشرین درجة[6] باجماعت نماز اکیلے کی نماز سے ستائیس درجے زیادہ ثواب ہے ۔

فرمایا: "اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں اور جب لکڑیاں اکٹھی ہو جائیں تو نماز کے لیے اذان کا حکم دوں ۔ پھر کسی شخص کو یہ حکم دوں کہ لوگوں کو امامت

---

[1] الذاریات ۵۱ : ۵۶ [2] البقرہ ۲ : ۲۲ [3] النحل ۱۶ : ۳۶ -
[4] البقرہ ۲ : ۴۳ [5] الجمعہ ۶۲ : ۹ [6] بخاری ۱۰ : ۳۰

کرائے جو حاضر جماعت نہیں ہوئے ان کے گھروں کو آگ لگا دوں"۔
خدا کی قسم ان کا یہ حال ہے کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ موٹی ہڈی یا دو کھر ہی مل جائیں گے تو پھر ضرور عشاء میں بھی حاضر ہوں گے[1]
حضرت امام احمد بن حنبل لکھتے ہیں: اگر مسجد میں نماز باجماعت سے غیر حاضری گناہ کبیرہ نہ ہوتی تو ان کے گھروں کو جلانے کی دھمکی نہ فرماتے (کتاب الصلوٰۃ ص۲۱ امام احمد)۔
"جو شخص وضو کر کے اپنے گھر سے نکلے اور فرض ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف جائے۔ اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا کہ احرام باندھنے والے حج کرنے والے کو ملتا ہے۔ اور جو شخص چاشت کی نماز کے لیے گھر سے نکلا اور خالص نماز چاشت کی نیت سے مسجد میں گیا اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے برابر ہے۔ اور نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کر کے نماز پڑھنا اور اس کے درمیانی وقفہ میں بیہودہ گوئی نہ کرنا ایسا عمل ہے جو علیین میں لکھا جاتا ہے"۔[2]
ہر نماز سے قبل مؤذن بلند آواز سے اذان دیتا ہے جس سے اللہ کی توحید عظمت اور کبریائی سے فضا آسمانی گونج اٹھتی ہے۔ خدا کے بندے مؤذن کی آواز سن کر بارگاہ ایزدی میں پہنچ جاتے ہیں۔ امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔ ہر رکعت میں قرآن مجید کا کوئی حصہ پڑھا جاتا ہے۔ قیام رکوع سجود کے احکام الٰہی کی پابندی کے سبق کی تجدید کی جاتی ہے۔ جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو نمازی خدا کی کبریائی کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جب مسجد سے باہر جاتے ہیں تو دل پر سوائے اللہ کی عظمت اور جلال کے کسی کے نقش نہیں ہوتے دل میں ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا ایک مرکز ہے۔
احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ عہد نبوی میں اصحاب صفہ اور دیگر صحابہ حلقے باندھ کر تعلیم و ذکر میں مصروف رہتے تھے۔

مسجد سیاسی اور عمومی مرکز کی حیثیت سے اسلام سیاست کو دین کا ایک جزو قرار دیتا ہے۔ اور اس کے لیے ایک واضح تعلیم کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ تاکہ بنی نوع انسان اس تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیوی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

---

[1] بخاری باب وجوب صلوٰۃ الجماعۃ [2] مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد صفحہ ۶۷۔

رسول کریمؐ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؐ کے اور خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں مسجد کو سیاسی مرکز کی بھی حیثیت رہی ہے۔ تمام اہم اور ضروری قومی مسائل کا تصفیہ یہاں ہی کیا جاتا تھا۔ جب باہر سے وفود آتے تو ان کو مسجد میں اتارا جاتا تھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ عکل کی ایک جماعت رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ تو ان کو صفہ میں ٹھہرایا گیا[1] عیسائیوں کا وفد نجران اور طائف کے مشرکین کا وفد مسجد میں ہی آکر ٹھہرا تھا۔ اس غرض کے لیے مسجد میں خیمے نصب کئے گئے تھے۔ مسجد میں قیدیوں کو باندھا جاتا تھا حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے ایک رسالہ نجد کی طرف بھیجا تو وہ بنی حنیفہ کے ایک آدمی ثمامہ بن اثال کو قیدی بنا کر لائے تو اس کو مسجد کے ایک ستون سے باندھا[2]

ایک دفعہ ایک تہوار کے موقعہ پر رسول کریم صلعم نے بعض حبشیوں کو ڈھالوں اور نیزوں کے ساتھ مسجد میں کرتب دکھانے کی اجازت دی[3]

حضرت حسانؓ بن ثابت رسول کریم صلعم کی مدح میں اور مخالفین کی ہرزہ سرائی کے جواب میں اپنے قصائد مسجد میں ہی پڑھا کرتے تھے[4]

بعض اوقات لڑائی میں زخم خوردہ کسی صحابی کی تیمارداری اور عیادت کے لیے اس کا خیمہ مسجد میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً جب غزوۂ خندق میں ....[5] .... حضرت سعد بن معاذ کو مہلک زخم آئے تو ان کے لیے مسجد میں خیمہ نصب کر دیا گیا۔

مدینہ کے دفاع کے لیے باہر جانا ہوتا تو مجاہدین کا اکٹھ مسجد میں ہوتا۔ باہر سے مال آتا تو اس کو مسجد میں رکھا جاتا اور تقسیم کیا جاتا[6]

مقدمات کا فیصلہ اور ان کا اجرا مسجد سے ہی ہوتا بخاری کتاب الخصومات میں وہ تمام مقدمات مذکور ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلعم کی مجلس عدالت مسجد میں ہی منعقد ہوا کرتی تھی۔

خلفائے راشدین کے دور میں عدالت جنگی مجالس کا انعقاد اور میدان جنگ میں اسلامی فوج کی کامیابی کا اعلان مسجد میں ہوا کرتا تھا۔

خلفائے راشدین کے دور میں کسی اہم مسئلہ کے متعلق عوام کی رائے معلوم

---

[1] بخاری ۸: ۵۸ [2] بخاری ۸: ۷۶ [3] بخاری ۸: ۶۹ [4] باب الشعر فی المسجد
[5] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الخیمۃ فی المسجد [6] بخاری ۸: ۴۴

کرنا ہوتی تو اس کا اہتمام مسجد میں ہی کیا جاتا تھا۔

تمام خلفائے راشدین نے بیعت کے بعد اپنی حکومتی پالیسی کا اعلان مسجد میں ہی کیا۔ تمام فتاویٰ اور مقدمات کے فیصلے مسجد سے ہی جاری کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں عبداللہؓ بن مسعود کو کوفہ کا جج اور منتظم مالیات مقرر کیا گیا وہ مسجد میں ہی فیصلے کیا کرتے تھے۔

خلفائے راشدین کے دور کے بعد بھی مسجدیں سیاسی مرکز کی حیثیت رکھتی تھیں چنانچہ طبری میں لکھا ہے کہ ۱۲۳ھ میں مدینہ کے قاضی مسجد میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعقوبی کے قول کے مطابق بغداد میں مشرقی حصے کا قاضی مسجد میں فیصلے کیا کرتا تھا۔ دولت فاطمیہ میں جامع عمرو کی شمالی ملحقہ عمارت قاضی کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ شیراز میں اسے جس عدالت میں پیش ہونا پڑا اس کا انعقاد مسجد میں تھا۔

اس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد مسلمانوں کے لیے سیاسی اور عمومی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

In general The Mosque and particularly the Minber was the place where official proclamation were made. Of course as early as the time of proppet. Although the Mosque lost its old political importance in later history. It has never quite lost its characrer as the assembly or occasions of public importance." [1]

رسول کریم صلعم کے ابتدائی زمانہ ہی سے مساجد بالعموم اور منبر بالخصوص وہ جگہیں تھیں جہاں سے سرکاری اعلان ہوا کرتے تھے۔ گو مسجد بعد کے زمانہ میں اپنی قدیم سیاسی اہمیت کھو بیٹھی تاہم عوامی اہمیت کے مواقع پر مسجد میں اجتماع ہونا کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مسجد مسلم قوم کا ثقافتی اور تعلیمی مرکز

مسجد ثقافتی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت سے

ہے۔ مسلمانوں کی قومی زندگی کے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام "مسجد"

متعلق تمام امور کی تعلیم مسجد میں دی جاتی ہے۔ خطبہ جمعہ تو ایک باقاعدہ ہفتہ وار لیکچر ہے جس میں امام مسلمانوں کو ہر قسم کی امور کے متعلق آگاہ کرتا رہتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی آخری بیماری کے دوران مسجد میں تشریف لائے اور اپنا آخری خطبہ دیا۔

عہد نبوی میں مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام مسجد میں تھا۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک صفہ (چبوترہ) تھا۔ جہاں ان کی رہائش کا انتظام تھا۔ بعض اوقات متعلمین کی تعداد چار سو تک پہنچ جاتی تھی۔ انہی میں سے تبلیغ کے لیے باہر مبلغ بھیجے جاتے تھے۔ چند مشہور مساجد کا ذکر کرتے ہیں جہاں آب علم سے دل و دماغ کی خشک کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔

جامع المنصور بنائے بغداد کے بعد ۱۴۵ھ میں قصر الذہب اور جامع المنصور کی تعمیر شروع ہوئی تھی[1]۔ اس منصوبہ پر اٹھارہ کروڑ دینار صرف ہوئے[2]۔ یہ مسجد تمام اہل علم کا مرکز تھی۔ خطیب بغدادی نے حرم شریف میں جن تین باتوں کے لیے دعا کی تھی ان میں سے پہلی بات یہ تھی کہ انہیں اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا موقع نصیب ہو۔ الکسائی بھی اس مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔

جامع دمشق اس مسجد کو الولید بن عبد الملک نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ مسجد طلباء کے لیے مرجع خاص تھی۔ ابن جبیر کا بیان ہے کہ اس مسجد میں درس و تدریس کے متعدد حلقے تھے۔

جامع عمر اس مسجد کی تعمیر ۲۱ھ میں ہوئی اس مسجد میں کوئی چالیس حلقے تھے اس مسجد میں آٹھ زاویے تھے ان میں سے ایک زاویے میں حضرت امام شافعیؒ خود درس دیا کرتے تھے۔ زاویہ مجدیہ میں قاضی القضاۃ وجیہ الدین عبد الوہاب کی تقرری ہوئی اور وہ اپنے علمی جواہر پاروں سے طلبا کو مالا مال کیا کرتے تھے۔ زاویہ صاحبیہ میں شافعی اور مالکی اساتذہ کا تقرر ہوا کرتا تھا۔

ابن طولون کی مسجد میں تفسیر حدیث فقہ اور علم ہیئت پڑھایا جاتا تھا۔ مدرسہ نظامیہ جامع نیشاپور اور جامع ازہر سب مسجدوں میں قائم تھے بڑی بڑی مساجد کے ساتھ اوقاف تھے جن کی آمد سے معلمین اور طلباء کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے لائبریریوں کا انتظام بھی مسجد کے ساتھ ہوتا تھا۔

---

[1] معجم البلدان (یاقوت) جلد ۲ صفحہ ۳۲۳ [2] معجم البلدان (یاقوت) جلد ۲ صفحہ ۳۳۵

چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار رقمطراز ہے۔[1]

We can therefore say definitely that Mosque were from the begining through centuries educational institution. The learned men occasionaly used to live in Mosques. The Mosques therefore, corresponded to Church, Town Hall. and School and other sometime Hostels.

لہٰذا ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مساجد ابتدا ہی سے صدیوں تک تعلیمی ادارے رہی ہیں۔ علماء فضلاء بالعموم مساجد میں رہائش پذیر ہوا کرتے تھے اور مساجد سے گرجوں ٹاؤن ہال مدرسوں اور بعض اوقات اقامت گاہوں کا سا کام لیا جاتا رہا ہے۔

مسجد کے آداب

۱ **پاک نیت** اسلام میں ہر عمل کا ثواب پاک نیت پر مبنی ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مسجد کی طرف جانے والا تمام دنیوی علائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ کی خاطر جائے۔ دل محبتِ الٰہی سے معمور ہو۔ اس کے پیش نظر ہو کہ وہ ایک بلند و برتر ہستی کے سامنے جا رہا ہے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذٰلک انہ اذا توضا فاحسن الوضوء ثم خرج الی المسجد لا یخرجہ الا الصلوٰۃ[2] اور ثواب اس وقت ملے گا جب نمازی اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد کے لیے نکلے اور فقط نماز کے لیے ہی نکل رہا ہو۔

ارشادِ الٰہی ہے: وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا[3]

اور کہ مسجد اللہ کے لیے ہیں سو اللہ کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

یہ حدیث اور آیت کریمہ ظاہر کرتی ہے کہ مسجد کی طرف صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر نکلنا چاہیے اور مسجد کی طرف جاتے ہوئے انسان کا دل ہر قسم کے معبودان باطلہ سے منزہ ہو

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام "مسجد" [2] بخاری جلد ا صفحہ ۶۹ [3] الجن ۷۲: ۱۸۔

2 **جسمانی طہارت**

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ روح اور جسم میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اگر روح غمگین ہو تو انسان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اور اگر روح خوش ہو تو انسان کا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ اسلام نے اس گہرے تعلق کی بناء پر یہ حکم دیا ہے کہ جب مسجد کی طرف روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لیے نکلا جائے تو جسم کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک کر لینا چاہیے۔

ارشاد الٰہی ہے یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ [1] اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ اور ناپاکی سے دور رہ

جسمانی طہارت کی پہلی صورت وضو ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ [2] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھو لیا کرو۔

رسول کریم صلعم نے فرمایا: مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ [3] جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی پاکیزگی ہے۔

لَا تُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ [4]

پاکیزگی کے بغیر نماز قبول نہیں کی جائے گی۔ خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

3 **اچھی ہیئت میں آئے**

مسجد کی طرف جانے سے قبل اپنی ہیئت اور لباس کو اچھا کر لینا چاہیے۔ لباس دھلا ہوا ہو۔ بال وغیرہ بکھرے ہوئے نہ ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ سر پر ٹوپی وغیرہ ہو۔ اگر ہو سکے تو خوشبو وغیرہ بھی لگا لینی چاہیئے تاکہ دوسرے ساتھیوں کو پسینہ کی بدبو سے تکلیف نہ ہو۔

ارشاد ربانی ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ [5]

اے بنی آدم! ہر سجدے کے وقت اپنی زینت کو لے لیا کرو۔

اس آیت سے فقہا اور مفسرین نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسجد میں جانے سے پہلے

---

[1] المدثر ۷۴ : ۱-۵ [2] المائدہ ۵ : ۶ [3] مشکوٰۃ، احمد بن حنبل [4] مسلم، مشکوٰۃ المصابیح [5] الاعراف ۷ : ۳۱

حتی الوسع ہیئت اچھی ہو۔

۴ **وقار اور اطمینان سے آئے** مسجد کی طرف جاتے ہوئے وقار اور اطمینان سے جانا چاہیئے۔ راستہ میں چلتے ہوئے لہو ولعب اور ہنسی مخول کی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے

ارشاد نبوی ہے۔ واتوھا وعلیکم السکینۃ فما ادرکتم فصلوا[1] یعنی نماز کے لیے اس طرح آؤ کہ تم پر سکینت اور وقار ہو جو پالو پڑھ لو۔

۵ **دُعا پڑھنا** مسجد میں دایاں پاؤں رکھتے ہوئے یہ دعا پڑھی جائے۔ ارشاد نبوی ہے۔ اذا دخل احدکم المسجد فلیقل اللھم افتح لی ابواب رحمتک واذا خرج فلیقل اللھم انی اسئلک من فضلک[2]۔ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو یہ دعا کرنی چاہیئے اے اللہ اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول۔ اور جب مسجد سے باہر نکلے تو یہ دعا کرے اے اللہ! میں تجھ سے تیرا فضل چاہتا ہوں۔

۶ **دنیا کی باتوں سے پرہیز:** مسجد میں دنیا کی باتوں سے اجتناب کرنا اور ذکر الٰہی کے پانی سے دل کی خشک کھیتی کو سیراب کرنا چاہیئے۔

ارشاد الٰہی ہے وَ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا[3] یقیناً مسجدیں اللہ کی ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔

دوسری جگہ آتا ہے: فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ[4] نور ان گھروں میں ہے جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تناشد الاشعار فی المسجد وعن البیع والاشتراء فیہ وان یتحلق الناس یوم الجمعۃ قبل الصلوٰۃ فی المسجد[5] رسول کریم صلعم نے مسجد میں اشعار پڑھنے اور خرید و فروخت کرنے سے منع فرمایا۔ اور اس بات سے بھی

---

[1] مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ [2] مشکوٰۃ المصابیح باب المساجد ومواضع الصلوٰۃ صـ ۶۸ [3] الجن ۷۲ : ۱۸ [4] نور ۲۴ : ۳۶ [5] مشکوٰۃ باب المساجد۔

کہ جمعہ کے دن لوگ نماز سے پہلے حلقہ باندھ کر بیٹھیں۔

7 **لڑائی جھگڑے سے ممانعت** لڑائی جھگڑے سے اسلام تو ویسے ہی روکتا ہے۔ مگر مسجد میں لڑائی جھگڑے کی قباحت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ مسجد مساوات اور اخوت کا عملی ثبوت ہے۔ جہاں امیر و غریب، شاہ و گدا سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی نیازمندی کا سبق دہراتے ہوتے ہیں۔ اس اخوت کے گھر میں لڑنا تو کجا کھلا ہتھیار لے کر چلنا ممنوع ہے۔

ارشاد نبوی ہے۔ خصال لا تنبغی فی المسجد لا یتخذ طریقاً ولا یشہر فیہ سلاح ولا یقبض فیہ بقوس ولا ینشر فیہ نبل ولا یمر فیہ بلحم نیّ ولا یضرب فیہ حد ولا یقتص فیہ من احد ولا یتخذ سوقاً[1] چند باتیں ایسی ہیں جن کو مسجدوں میں کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کو نہ راستہ بنایا جائے نہ اس میں ہتھیار تیز کئے جاتے ہیں نہ کمان پکڑی جائے نہ تیر پھیلائے جائیں نہ کچا گوشت لے کر گزرا جائے۔ نہ حد ماری جائے۔ نہ قصاص لیا جائے اور نہ اسے بازار بنایا جائے۔ ایک حدیث میں ہے۔ جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشرائکم وبیعکم وخصوماتکم ورفع اصواتکم واقامۃ حدودکم وسل سیوفکم[2] اپنی مسجدوں کو الگ رکھو اپنے بچوں سے اپنے پاگلوں سے خرید و فروخت سے جھگڑوں سے شور و غل سے اقامت حدود سے اور تلوار کے سونتنے سے۔ مذکورہ احادیث میں حدود کے اجراء اور قصاص لینے سے بھی روکا گیا ہے۔

8 **مسجد کی صفائی** صفائی اور نفاست کا غیر شعوری طور پر باطن پر اثر پڑتا ہے اگر کسی انسان نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ ماحول پاک ہو تو اس کا دل مسرت اور انبساط سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اگر ماحول گندہ ہو تو دل میں انقباض پیدا ہوتا ہے۔ اس طبعی خصلت کی وجہ سے اسلام نے مساجد کو ہر گند سے پاک صاف رکھنے کا حکم دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ[3] اور ہم نے

---

[1] ابن ماجہ باب ما یکرہ فی المساجد [2] ابن ماجہ باب ما یکرہ فی المساجد۔

[3] البقرہ ۲ : ۱۲۵

نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البزاق فی المسجد خطیئۃ وکفارتھا دفنھا[1] مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اس کو دفن کرنا ہے۔

فرمایا: وجدت فی مساوی اعمالھا النخاعۃ تکون فی المسجد لا تدفن[2] میں نے اپنی امت کے برے اعمال میں سے مسجد میں تھوکنا پایا جس کو دفن نہ کیا گیا ہو۔

عرضت علی اجور امتی حتی القذاۃ یخرجھا الرجل من المسجد[3] مجھ پر میری امت کے اجر پیش کیے گئے یہاں تک کہ وہ کوڑا بھی جو کسی نے مسجد سے باہر پھینکا ہو۔

حضرت سائب فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے قوم کی امامت کی۔ اتفاق سے اس نے قبلہ کی جانب تھوک دیا جسے رسول کریمؐ نے خود دیکھ لیا آپ کو یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی آپ نے سختی سے فرمایا کہ اس کو اب امامت نہ کرنے دینا چنانچہ اس کو لوگوں نے دوبارہ امامت نہ کرنے دی۔ اس کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جو کچھ سنا تھا بیان کیا۔ آپ نے اس کی باتیں سن کر فرمایا ہاں یہ درست ہے کہ میں نے روکا ہے اس لیے کہ تم نے مسجد میں تھوک کر اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دی[4]

۹ **تزئین سے ممانعت** اسلام سادگی کو پسند کرتا ہے کیونکہ سادگی قوت عمل اور قوت کارکردگی کو بڑھاتی ہے قوم کی اقتصادی حالت کو بہتر بناتی ہے جب کوئی قوم بناؤ سنگھار اور فیشن کی دلدل میں پھنستی ہے۔ تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ تزئین اور بناؤ سنگھار سے انسان کی قوت عملیہ ختم ہو جاتی ہے۔ بیکار رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اخراجات فضول خرچی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عہد نبوی میں جو مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ وہ سادگی کا بہترین نمونہ تھیں۔ دور فاروقی

---

[1] بخاری ۸: ۳۷ [2] فتح الباری ج ۱ صفحہ ۳۴۵ [3] مشکوٰۃ عن الترمذی و ابی داؤد ج ۱ صفحہ ۶۹ [4] مشکوٰۃ باب المساجد

یہاں سادگی رہی آپ نے رنگ سازی اور فضول تزئین سے سختی سے روکا۔ بخاری میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسجد بنانے کا حکم دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ میں لوگوں کو بارش سے بچانا چاہتا ہوں خبردار مسجد سرخ اور زرد نہ بنائی جائے جس سے لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔

دورِ عثمانؓ میں مساجد کی عمارت پختہ کر دی گئیں۔ لیکن بیل بوٹے اور رنگ سازی نہ تھی۔ رسول کریم صلعم نے واضح طور پر تزئین مسجد سے روکا ہے: ما امرت بتشیید المساجد قال ابن عباس لتزخرفنها کما زخرفت الیهود والنصاری[1] مساجد کو چونا گچ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ ابن عباسؓ نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ تم ان مسجدوں کو یہود و نصاری کی طرح زینت دو گے۔ رسول کریم صلعم نے بیجا تزئین مسجد کو مسلمانوں کی تباہی کی علامت قرار دیا ہے۔

فرمایا: لا تقوم الساعة حتی یتباهی الناس فی المساجد[2] مسلمانوں کی تباہی کی گھڑی اس وقت آئے گی جب لوگ مسجدوں کے بنانے میں تفاخر کرنے لگیں گے

فرمایا: ما ساء عمل قوم قط الا زخرفوا مساجدهم[3] جب کسی قوم کے اعمال بگڑتے ہیں تو وہ اپنی مسجدوں کو مزین کرتی ہے۔

مسجد امن اور اخوت کی جگہ ہے یہاں لڑائی جھگڑا کرنا

10 لڑنے جھگڑنے کی ممانعت ممنوع ہے

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ[4] اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے پاس لڑائی نہ کرو جب تک وہ لوگ وہاں تم سے نہ لڑیں

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا[5] جو وہاں (مسجد) داخل ہو امن والا ہو گیا۔

11 مسجد کو آباد کرنا

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ[6] اللہ کی مسجدیں صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور نماز کو قائم کی۔ اور زکوٰۃ

---

[1] ابوداؤد باب بناء المسجد [2] ابوداؤد باب بناء المسجد [3] ابن ماجہ باب تشیید المساجد [4] البقرہ ۲: ۱۹۱ [5] آل عمران ۳: ۹۷
[6] التوبۃ ۹: ۱۸

دی اور اللہ کے سوائے کسی کا خوف نہ کیا سو امید ہے کہ یہ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

مسجد کو آباد کرنے سے مراد وہاں عبادت الٰہی کرنا ہے۔

مسجد کے معاشرتی اثرات

مسجد مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے مسجد کے اہم اثرات حسب ذیل ہیں۔

۱ **اخوت و مساوات** اخوت اور مساوات اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لیے ایک لازمی عنصر ہے۔ اسلام نے اسی وجہ سے اس عنصر کو بہت اہمیت دی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً [۱]

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ تمام روئے زمین کے بسنے والے ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً [۲] سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا [۳] اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [۴] مومن بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا [۵] تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ اَنِّیْ اَشْهَدُ اَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ [۶]

اے ہمارے اور ہر چیز کی پرورش کرنے والے میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب

---

[۱] النساء ۴: ۱ [۲] البقرہ ۲: ۲۱۳ [۳] یونس ۱۰: ۱۹ [۴] الحجرات ۴۹: ۱۰ [۵] بخاری [۶] احمد، ابوداؤد

آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر مشہور خطبہ میں فرمایا۔

"لوگو! جان لو کہ تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے"[1]

اس اعلان نے حسب نسب، رنگ و نسل، آقا و غلام، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ کے سارے امتیازات اور تفریقات ختم کر کے انسانیت کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ہے وہ اسلامی اخوت و مساوات کی پاکیزہ تعلیم۔ اس تعلیم کا عملی سبق مسجد میں پانچ دفعہ دہرایا جاتا ہے۔ جب مؤذن کی اذان پر سب لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں اور ایک امام کے پیچھے بلا تفریق و امتیاز کے ایک صف میں کھڑے ہو کر رب العالمین کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

مسز سروجنی نائیڈو رقمطراز ہے۔

"اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے جمہوریت کا درس دیا اور اس پر عمل بھی کیا جب مینارہ مسجد سے اذان گونجتی ہے اور پرستاران حق مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ تو دن میں پانچ بار جمہوریت اسلام اپنی عملی صورت میں جلوہ گر نظر آتی ہے شاہ اور دہقان دوش بدوش سر بسجود ہوتے اور پکار پکار کر اللہ اکبر کہتے ہیں میں اسلام کی اس ناقابل تقسیم وحدت و یگانگت سے بارہا متاثر ہوئی وہ وحدت جو واقعی انسان کو بھائی بھائی بنا دیتی ہے۔ لندن میں دیکھو وہاں مصری بھی ہیں حبشی بھی ہندی بھی ہیں اور ترک بھی لیکن کسی کا وطن مصر ہوا تو کیا ہند ہوا تو کیا وہ سب ایک دوسرے کو اپنا بھائی تصور کرتے ہیں"[2]

باہمی تعاون

ہمارا یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ معاشرہ باہمی تعاون کے بغیر فروغ حاصل نہیں کر سکتا۔ ابتدائے زمانہ سے لے کر آج تک تمام مفکرین نے معاشرہ کی بہبود کے لیے باہمی تعاون کو بہت اہمیت دی ہے۔

افلاطون کا بھی یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنے معاشرے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا لہٰذا انسانوں کے لیے یہ ضروری ہے وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ابن خلدون

---

[1] مسند احمد [2] اسلام اور پیغمبر اسلام غیروں کی نظر میں مؤلفہ خلیفہ عبدالرحمٰن صفحہ ۲۰، ۲۱

نے بھی لکھا ہے کہ تجربہ انسان کو اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ اور مدافعت کے لیے دوسروں سے مل جل کر رہے [۱]

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ نسلی تسلسل کے لیے مرد اور عورت کی مصاحبت ناگزیر ہے اور انسانی خاندان باہمی تعاون اور اختلاف کی تحریکات کے ذریعہ ہی جو یکساں قدیم ہیں نشوو نما پا کر قبائل اور اقوام کی صورت اختیار کرتا ہے [۲]

قرآن مجید میں آتا ہے وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [۳] اور نیکی اور تقوٰی پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

ہجرت کے بعد رسول کریم صلعم مدینہ تشریف لے آئے تو سب سے پہلے اسلامی معاشرہ کو مستحکم اور مربوط بنانے کے لیے صحابہ میں مواخات قائم کی تاکہ مسلمان اشتراک اور تعاون کے مضبوط رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا" مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ نہایت خوش اسلوبی سے ایک دوسرے کی اعانت کریں تاکہ یہ نہ ہو کہ ان میں سے کوئی فدیہ یا قصاص ادا کرنے کی سکت نہ رکھنے کے باعث خود کو بے یارو مددگار پائے خدا ترس مسلمان ہر اس شخص کے خلاف ہوں گے جو سرکشی کا راستہ اختیار کرے گا یا مسلمانوں کے مابین بے انصافی گناہ دشمنی یا بدعنوانی پھیلانے کے درپے ہوگا ہر شخص کا ہاتھ اس کے خلاف اٹھے گا خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ کوئی مومن کسی مومن کے خلاف کسی کافر کی حمایت نہیں کرے گا۔ غیر مسلموں کو چھوڑ کر مسلمان ایک دوسرے کے دوست ہیں۔۔۔ مسلمانوں کا امن مکمل اور مشترک ہوگا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ خدا کی راہ میں ایک دوسرے کے بہے ہوئے خون کا بدلہ لیں [۴]

مسجد مسلمانوں کو باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا سبق دیتی ہے۔ مسجد میں ہر روز آنے والے نمازی ایک دوسرے کے واقف کار اور شناسا ہو جاتے ہیں انہیں ایک دوسرے کی ضروریات اور احتیاجات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپیل کی جاتی ہے۔ اور باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کیا جا سکتا ہے باجماعت نماز پڑھنے کی ایک بڑی غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کا باہمی

---

[۱] ابن خلدون المقدمہ جلد دوم صفحہ ۳۷۱ [۲] Human Society in Ethics and Politics نیویارک ۱۹۵۵ صفحہ ۱۸۴

[۳] المائدہ ۵ : ۲ [۴] ابن ہشام سیرت النبی قاہرہ جلد ۲ صفحہ ۱۴۷-۱۵۰

ربط بڑھے اور باہمی تعاون سے ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔

اتحاد فرد اور معاشرہ کا رشتہ ایسے ہی ہے جیسے ایک عمارت کا اینٹوں کے ساتھ جب اینٹیں قاعدہ اور ترتیب سے نقشہ کے مطابق رکھ دی جاتی ہیں تو عمارت بن جاتی ہے ہر ایک اینٹ دوسری اینٹ کے لیے سہارے کا موجب بنتی ہے یہی حال معاشرہ کا ہے اگر معاشرہ کے افراد اتحاد کی سلک میں منسلک ہیں تو معاشرہ کی اساس مستحکم اور غیر متزلزل ہے اس لیے اسلام نے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے اور تفرقہ سے بچنے کے لیے بار بار حکم دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا[1] اور سب کے سب اللہ کی رسی کو پکڑے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔

رسول کریم صلعم نے فرمایا: علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ[2] جماعت کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہو اور تفرقہ سے بچو۔

من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ۔ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہو تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا۔[3]

من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃ جاھلیۃ جو کوئی امام کی اطاعت سے کنارہ کش ہوا اور جماعت سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

اس تعلیم کی عملی درسگاہ مسجد ہے جب نمازی مقررہ وقت پر فرض نمازوں کی ادائیگی کے لیے ایک امام کے پیچھے قبلہ رو ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں تو وہ گویا عملی صورت میں اتحاد کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں۔

رسول کریم صلعم نے اتحاد کی اس عملی صورت کے اظہار کے وقت صفوں کی ناہمواری کو برداشت نہیں کیا۔ کیوں کہ صفوں کی ناہمواری تشتت اور افتراق پر دلالت کرتی ہے۔

فرمایا: عباد اللہ لتسون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم[4] اے اللہ کے بندو! یا تم اپنی صفوں کو سیدھا ہموار رکھو پھر اللہ تمہارے اندر مخالفت ڈال دے گا۔

---

[1] آل عمران ۳: ۱۰۳ [2] ترمذی۔ [3] مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ [4] مسلم ج ۱ صفحہ ۱۸۲۔

استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم[1] برابر کھڑے ہو جاؤ۔ اختلاف نہ ہو اس کا اثر تمہارے دلوں پر پڑے گا۔

4 **اخلاق کی درستی** مسجد اخلاق کو درست کرنے کے لیے بہترین مکتب ہے۔ انسان اس وقت گناہوں کی آلودگیوں سے بچتا ہے جب اس کے دل میں اللہ کی معرفت ہوتی ہے۔ جتنی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی انسان برائیوں سے دور رہے گا۔ اللہ کی معرفت نماز سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نماز کو برائیوں سے بچنے کی کنجی قرار دیا ہے فرمایا: إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ[2] نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

5 **فرض شناسی** مسجد انسان کو فرض شناسی کا سبق دیتی ہے فرض شناسی سے ہی قوت عملیہ ترقی کرتی ہے جب مؤذن مسجد منار پر کھڑا ہو کر اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا ہے تو ہر مسلمان پر فرض عائد ہو جاتا ہے کہ تمام کاموں کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں حاضر ہو جائے حاضری کے لیے چند قیود بھی عائد کر دی ہیں کہ پہلے منہ ہاتھ پاؤں دھوئے جس کو اسلامی اصطلاح میں وضو کہتے ہیں۔ پھر پاک کپڑے پہن کر مسجد میں حاضر ہو جائے اور امام کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جس طرح سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا کرنے کے لیے دن رات میں کئی دفعہ بگل بجا کر مقررہ جگہ پر اکٹھا کیا جاتا ہے ان سے پریڈ کرائی جاتی ہے۔ یہ صرف فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ایک سطحی بین شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اجتماعی پریڈ کا جنگ سے کیا تعلق لیکن تجربہ اور مشاہدہ نے یہ بات بیقین تک پہنچا دی ہے کہ سپاہیوں کی اجتماعی پریڈ لڑائی کی تیاری کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے اطاعت اور فرض شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

6 **اطاعت امیر** اطاعت امیر کے تصور کے بغیر معاشرہ کا تصور ہی ادھورا ہے معاشرہ کے استحکام کے لیے اطاعت امیر نہایت ضروری ہے۔ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنا اطاعت امیر کے سبق کو دہراتا ہے اسلام نے اطاعت امیر پر بہت زور دیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

---

[1] مسلم ج۱ صفحہ ۱۸۱۔ [2] العنکبوت ۴۵

وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ؕ[1] اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔

رسول کریم صلعم نے فرمایا: اسمعوا واطیعوا وان استعمل حبشی کان رأسہ زبیبۃ[2] سنو اور اطاعت کرو اگر تم پر ایک حبشی غلام امیر بنایا جائے۔ جس کا سر کشمش کے دانہ کی طرح ہو۔

7 **صحت** معاشرہ کی ترقی اور بہبود کے لیے افراد کا صحت مند ہونا بہت ضروری ہے صحت صرف ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنے اور دفاع کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ روحانی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے یہی وجہ ہے نماز کی ادائیگی سے پہلے جسم اعضاء اور جگہ کی پاکیزگی ضروری ہے۔ نماز سے پہلے وضو ضروری قرار دیا گیا جس سے ہاتھ پاؤں منہ ناک کی صفائی ہو جاتی ہے۔ یہی اعضاء کھلے رہتے ہیں۔

8 **مرکز سے وابستگی** جس معاشرہ کا ایک مرکز نہ ہو وہ معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں تمام حکومتوں کا اپنا اپنا ایک مرکز رہا ہے۔ اگر کسی صوبے نے مرکز سے علیحدگی اختیار کرنا چاہی تو فوراً مرکزی حکومت نے اس کو باغی سمجھ کر اس پر چڑھائی کر دی۔ مرکز اور دوسرے صوبوں کی مثال ایک جسم کی طرح ہے۔ صوبے اعضاء ہیں اور دل مرکز تمام اعضاؤں سے ہی تازہ خون لیتے ہیں۔ ان میں زندگی کے آثار باقی رہتے ہیں۔ مسجد اسلامی معاشرہ کو ایک مرکز سے وابستہ رہنے کی تعلیم دیتی ہے

9 **وقت کی پابندی** مسجد میں پانچ وقت کی حاضری انسان کو وقت کی پابندی کا عادی بنا دیتی ہے ایک ہی آدمی کی ذات کو فائدہ نہیں دیتی بلکہ تمام معاشرے پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے تنزل اور پستی کا ایک بڑا سبب عدم پابندی وقت ہے۔ کھانے میں سونے میں کام کرنے میں آرام کرنے میں پابندی وقت کا خیال نہیں رکھتے۔ جس وجہ سے مسلمانوں کی زندگی میں ضبط اور نظم نہیں ہے۔ مسجد مسلمانوں کو وقت کی پابندی کا سبق دیتی ہے جس سے اسلامی معاشرہ ایک نظم اور ضبط کی لڑی میں منسلک ہو جاتا ہے۔

10 **مسجد کا رخ** قرآن مجید کی رو سے کعبۃ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ[3]

---

[1] نساء ۴: ۵۹ [2] بخاری ۱۰: ۵۴ [3] آل عمران ۳: ۹۵

پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے۔

کعبہ کی اس فضیلت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ ان کی عبادت گاہوں کا رخ کعبہ کی طرف ہونا چاہیے اس بارے میں سب سے پہلا حکم یہ نازل ہوا: وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى [۱] اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن بنایا اور ابراہیم کے مقام کو قبلہ نماز بناؤ۔

پھر یہ حکم نازل ہوا: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ [۲] اور جہاں سے تو نکلے اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دے اور جہاں کہیں تم ہو اپنے مونہوں کو اس طرف پھیر دو۔

تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے لیے قبلہ مقرر کرنے میں ایک بڑی حکمت اتحاد بین المسلمین ہے۔ اسی لیے رسول کریم صلعم نے فرمایا۔ لا تکفروا اھل القبلۃ [۳] اہل قبلہ کو کافر مت کہو۔

۱۱ **مسجد اسلام کی نظر میں** چوں کہ مسجد کا اثر مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اسلامی ثقافت کا مظہر ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں بندہ اپنی بندگی اور نیازمندی کا اظہار کرتا ہے اس وجہ سے اسلام میں مسجد کی بہت قدر و منزلت ہے۔ اس خاص مقام کا بلند رتبہ تو اس وقت ہی ظاہر ہو جاتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی جانب کرتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا [۴] اور کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں سو اللہ کے ساتھ اور کسی کو نہ پکارو۔

اسلام میں مسجد کی اس قدر عظمت ہے جو شخص لوگوں کو مسجد سے روکتا ہے وہ اللہ کے ہاں مجرم اور معتوب قرار پاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ [۵] اور اس شخص سے بڑا کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا ہے

---

[۱] البقرہ ۲: ۱۲۵ [۲] البقرہ ۲: ۱۵۰ [۳] نہایہ [۴] الجن ۷۲: ۱۸ [۵] البقرہ ۲: ۱۱۴

کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے ان کو مناسب نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔[۱]

قرآن مجید مسجد کی اہمیت اس رنگ میں بھی ظاہر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مقدس گھروں کی حفاظت خود کرتا ہے جو قوم ان مقدس جگہوں کو برباد کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برباد کر دیتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا[۱]

اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹاتا رہتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرادی جاتیں۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب مسجد حرام کو ابرہہ بادشاہ نے تباہ و برباد کرنے کے لیے حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اور اس کے تمام لشکر کو لقمۂ اجل بنا دیا جس کا ذکر سورۂ فیل میں آتا ہے۔

احادیث نبوی میں کثرت سے فضائل مسجد بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ اللہ کے یہاں شہروں میں محبوب ترین مسجدیں ہیں اور مبغوض ترین بازار[۲]

جو شخص صبح و شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمانی کا کھانا تیار کرتا ہے جو جنت میں صبح و شام پیش کی جائے گی۔[۳]

فرمایا: بشر المشائين فى الظلم الى المساجد بالنور التام يوم القيامة[۴] تاریکی میں مسجد جانے والوں کو نور کامل کی خوشخبری دو جو قیامت کے دن حاصل ہوگی۔

المساجد بيوت الله وقد ضمن الله لمن كانت المساجد بيته بالروح والراحة والجواز على الصراط الى الجنة[۵]

---

[۱] الحج ۲۲: ۴۰ [۲] مسلم باب فضل المساجد ج ۱ صفحہ ۲۳۶ [۳] مشکوٰۃ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ عن البخاری و مسلم [۴] مشکوٰۃ باب المساجد [۵] کنز العمال ج ۴ صفحہ ۲۱۴

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں اور یہ جس کا گھر ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مہربانی اکرام اور پل صراط سے گزار کر جنت میں پہنچانے کی ضمانت لی ہے۔ فرمایا۔ من بنی مسجدا یبتغی بہ وجہ اللہ بنی اللہ لہ مثلہ فی الجنۃ [1] جو شخص اللہ کی رضا کے حصول کے لیے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ اس کی مانند جنت میں اس کا گھر بنائے گا۔

مسجد کی عظمت شان یہ بھی ہے کہ رسول کریم صلعم جب کبھی سفر سے واپس لوٹتے تو پہلے مسجد جاتے دو رکعت نماز ادا کرتے وہاں لوگوں سے مل کر گھر تشریف لے جاتے تھے [2]

12 **مسجد کا انتظام** مسجد کے شعبہ انتظام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اول ظاہری دیکھ بھال۔ دوم امامت۔

ظاہری دیکھ بھال سے مراد مسجد کی صفائی اور مرمت ہے خانہ خدا کی شانِ فضیلت کے پیش نظر صفائی اور مرمت بہت ہی ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ [3] اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں سجدہ کرنے والوں کے لیے رسول کریم صلعم نے مسجد کی صفائی پر بہت زور دیا ہے رسول کریم صلعم کے عہد مبارک میں مسجد کی صفائی کے لیے ایک جاروب کش تھا۔ اس کا انتقال ہو گیا جس کی اطلاع رسول کریم صلعم کو نہ دی گئی۔ دوسرے دن جب اس کی وفات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا مجھے خبر کیوں نہیں دی پھر فرمایا اس کی قبر کہاں ہے۔ چنانچہ اس کی قبر پر گئے اور دعائے مغفرت کی۔

13 **صفائی کا معاوضہ** رسول کریم صلعم نے مسجد کی صفائی کے اجر عظیم کے متعلق فرمایا من اخرج اذی من المسجد بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ [4] یعنی جو شخص مسجد سے گندگی نکالے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

مسجد کی صفائی اور مرمت کے لیے ایک مستقل فنڈ ہونا چاہیئے۔ تاکہ جو مسجد کی صفائی کے لیے خادم رکھا جائے اس کو گزارہ دیا جا سکے۔ فنڈ کی دو صورتیں ہیں یا تو حکومت

---

[1] بخاری ۸: ۶۵ [2] مسلم باب استحباب الرکعتین فی المسجد لمن قدم من سفرہ ج ۱ صفحہ ۲۴۸
[3] البقرہ ۲: ۱۲۵ [4] ابن ماجہ باب تطہیر المساجد۔

اپنے خزانہ سے رقم دے۔ یا مسجد کے اوقاف ہوں۔ جن کی آمدنی سے تمام اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ ابتدائی عہد اسلام سے شاہی مسجدوں کی دیکھ بھال حکومتوں کے سپرد رہی ہے۔ اب بھی اسلامی ممالک میں جو شاہی مساجد ہیں ان کی دیکھ بھال حکومتوں کے سپرد ہے۔

جن مساجد کے اوقاف ہوں ان کی آمدنی کا حساب کتاب رکھنے کے لیے دیانتدار آدمیوں کا ایک بورڈ ہونا چاہیے فتح القدیر کشوری میں لکھا ہے متولی کے لیے جائز ہے کہ بوقت ضرورت مسجد کی صفائی اور روشنی کے لیے ملازم رکھے مگر مشاہرہ مناسب اور دستور کے مطابق مقرر کرے گا[1]

دوسرا اہم شعبہ امامت کا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور بعد کے ایک طویل عرصہ میں امامت کے لیے بہترین آدمی مقرر کیے جاتے رہے تھے۔ امام بخاری رح نے اپنی کتاب میں ایک عنوان باندھا ہے: اهل العلم والفضل احق بالامامة[2] وہ جو صاحب علم اور صاحب فضل ہیں وہ امامت نماز کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

مدینہ کی مرکزی مسجد میں رسول کریم صلعم خود امامت کراتے تھے محلوں کی دوسری مساجد میں ان صحابہ کو امام مقرر کیا تھا جو اہل علم اور بہترین خوبیوں کے مالک تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو آپ نے حضرت ابوبکر رض کو امام مقرر کیا۔ ابوداؤد نے رسول کریم صلعم کی وہ احادیث بیان کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامت اس شخص کا حق ہے جو سب سے زیادہ قرآن مجید جاننے والا ہو۔ خلفائے راشدین کے عہد میں خلفاء خود امامت کراتے تھے۔ باہر کے صوبوں میں جو گورنر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کو یہ ہدایت ہوتی تھی کہ وہ جامع مسجد میں امامت کرایا کریں ایک مدت تک روحانی قیادت اور دنیوی قیادت کے دونوں عہدے ایک ہی شخص میں جمع ہے۔

---

[1] ج ۲ صفحہ ۸۰۰ [2] بخاری کتاب الاذان

منڈی

عام اصطلاح میں منڈی سے مراد وہ جگہ لی جاتی ہے جہاں اشیا کی خرید و فروخت ہوتی ہو مثلاً سبزی منڈی۔ غلہ منڈی، گوشت کی منڈی اور فروٹ مارکیٹ وغیرہ لیکن معاشیات میں منڈی بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ منڈی سے مراد کوئی خاص علاقہ نہیں جہاں اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہو بلکہ اس سے وہ تمام علاقہ مراد ہے جہاں اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے فروختکار اور خریدار آپس میں براہِ راست یا بالواسطہ رابطہ قائم کر کے قیمت کے تعین کے لیے مقابلہ کر سکیں۔ اگر مقابلہ مکمل ہو تو شے کی ایک وقت میں ایک سی ہی قیمت رائج ہو گی مگر جب مقابلہ غیر مکمل ہو تو ایک شے کی کئی قیمتیں رائج ہو سکتی ہیں۔ اس طرح ہر گاہک سے اس کی مالی استطاعت کے مطابق قیمت وصول کی جاتی ہے۔

معاشی منڈی جغرافیائی قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ فروخت کنندہ اور خریدار کا دائرہ عمل ایک شہر تک بھی محدود ہو سکتا ہے اور تمام دنیا بھی اس کے زیر اثر آ سکتی ہے پروفیسر کوانٹ کے الفاظ میں منڈی سے مراد کوئی خاص علاقہ نہیں جہاں اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہو بلکہ اس سے مراد عام علاقہ ہے۔ جس میں فروختکار اور خریدار کسی شے کی قیمت کے تعین کے لیے آپس میں مل سکیں۔ رابطہ براہِ راست ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور بالواسطہ دلالوں کے ذریعہ بھی۔ منڈی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی عمارت میں محدود ہو یا چند گز رقبے تک محدود ہو۔ اگر دور دراز مقامات پہ بیٹھے ہوئے کاروباری افراد براہ راست یا بالواسطہ رابطہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں تو ایسا تمام علاقہ منڈی کے زمرے میں آجاتا ہے۔ منڈی خواہ چند گز رقبے تک محدود ہو یا ہزاروں میل رقبے میں پھیلی ہوئی سب سے ضروری چیز خریدار اور فروخت کار کے درمیان رابطہ ہے جو خواہ براہ راست ہو یا بالواسطہ۔

منڈی کے لوازمات کسی شے کا وجود منڈی کی سب سے پہلی اور اہم شرط ہے جس کے بغیر منڈی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ شے ایسی ہو جسے دیکھا یا چھوا جا سکے۔ جو افادہ کمیابی اور انتقال پذیری

کے عناصر کی حامل ہو۔ ان تینوں عناصر میں کمیابی بنیادی شرط ہے جو شے کو معاشی شے بنا کر منڈی میں اسے بیچی یا خریدی جانے کے قابل بناتی ہے۔ مثلاً چاول گندم، کپڑا، کھانڈ وغیرہ۔ ان کا مادی وجود بھی ہے اور ان میں افادہ۔ کمیابی اور انتقال پذیری کے بنیادی عناصر بھی موجود ہیں۔ شے کے مادی اور حقیقی وجود کا ضروری لین دین کے وقت منڈی میں ہونا ضروری شرط نہیں البتہ خریدار کے ذہن میں شے کے متعلق بالکل واضح تصور کی موجودگی ضروری شرط ہے۔ تھوک منڈیوں میں اشیاء دکانوں پر موجود نہیں ہوتیں۔ البتہ ان کے نمونے ضرور موجود ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر خریدار مال کی کوالٹی کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ جب کہ عموماً مال گودام میں ہوتا ہے۔ آج کل بہت سی اشیاء ٹریڈ مارکوں سے بھی فروخت ہوتی ہیں ایسی صورت میں شے کو دیکھنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مثلاً لپٹن چائے ٹریٹ بلیڈ وغیرہ جن کے ٹریڈ مارک سے ہی ان اشیاء کا تصور فوراً ذہن میں آجاتا ہے جن اشیاء کا مادی وجود نہ ہو ان کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً خیالات اور تصورات کا کوئی مادی وجود نہیں لہٰذا ان کی خرید و فروخت بھی نہیں ہوتی۔ بافراط اشیاء کی بھی منڈی نہیں ہوتی اگرچہ ان میں افادہ پایا جاتا ہے اور اکثر حالتوں میں وہ ہماری بقا کے لیے ناگزیر بھی ہوتی ہیں مثلاً سورج کی روشنی اور تمازت ہوا۔ دریا کا پانی، سمندر کا نمک، ریگستان میں ریت، جنگل میں لکڑی وغیرہ۔ ان اشیاء میں کمیابی کا بنیادی عنصر نہیں پایا جاتا لہٰذا بارش کے پانی۔ ہوا، روشنی وغیرہ کی منڈی نہیں ہوتی۔ جب تک لکڑی جنگل میں پائی جائے اس کی نہ کوئی قیمت ہوگی اور نہ ہی منڈی مگر جب لکڑہارا اسے کاٹ کر شہر میں لے آتا ہے تو وہ کمیاب ہو جاتی ہے اور اس کمیابی کی وجہ سے اس کی منڈی بھی معرض وجود میں آجاتی ہے اور قیمت بھی پڑتی ہے۔ گویا منڈی کی بنیادی شرط کمیاب اشیاء کا وجود ہے۔ منڈی اور قیمت کا بھی آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

خریدار اور فروخت کنندگان کا وجود منڈی کا دوسرا اہم ترین جزو ہے۔ اگر شے تو موجود ہو مگر فروخت کار اور خریدار کا وجود ناپید ہو تو تب بھی منڈی معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ کوئی فرد تو اشیاء کی فروختگی کے لیے منڈی میں موجود ہو جو کاروباری اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شے کا لین دین کرے۔ فروختکار کے ساتھ خریدار کا ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ خریدار کے بغیر منڈی میں اکیلے فروختکار کی موجودگی بے معنی بن جاتی ہے۔ دونوں فریق شے کا لین دین کرتے وقت دیانت داری خلوص اور

کاروباری اصولوں کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں - اسلامی نقطہ نگاہ سے فروختکار پر واجب ہے کہ وہ شے کی کوالٹی کے متعلق صحیح صحیح معلومات خریدار کے گوش گزار کرے شے کے کسی بھی نقص کو نہ چھپائے اگر شے میں کوئی نقص پڑ گیا ہو تو اسے چھپانے کی بجائے خریدار کو سودا طے کرنے سے پہلے آگاہ کر دیا جائے - اسلامی تاریخ میں ہمیں کاروباری دیانت کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں - سودا طے ہوتے وقت فروخت کار خریدار کو مال میں موجود نقص کے متعلق آگاہ کرنا بھول گیا یا دانستہ چھپا گیا - بعد میں جب فروختکار کو یاد آیا یا ضمیر کی خلش نے اس کے احساس کو بیدار کیا تو وہ میلوں خریدار کے پیچھے مارا مارا پھرا - پھر کبھی تو غیر مسلم مسلم تاجر کی دیانت داری کو دیکھ کر اسلام لے آیا اور کبھی اس کی کایا ہی پلٹ گئی - انڈونیشیا کے باشندے دیانت دار مسلم تاجروں کے ذریعے ہی حلقہ بگوش اسلام ہوئے - عمدہ شے میں گھٹیا شے کی ملاوٹ اسلامی نقطہ نگاہ سے حرام تو ہے ہی مگر کاروباری اصولوں کے مطابق بھی یہ ناقابل معافی جرم ہے - ایک مرتبہ رسول کریم بازار میں ایک غلہ کی دکان کے پاس سے گزر رہے تھے کہ آپ رک گئے اپنا دست مبارک غلے کے ڈھیر میں ڈالا - نیچے سے گیلا غلہ نکلا جب کہ ڈھیر کے اوپر خشک غلہ تھا - آپ نے اس بددیانتی کو سخت ناپسند فرمایا اور پھر ایک موقعہ پر فرمایا کہ دیانت دار تاجر روز محشر صدیقوں میں اٹھائے جائیں گے - اس طرح فروخت کنندگان پر اسلامی اور کاروباری اصولوں کے مطابق یہ جائز نہیں کہ وہ مال کو کھلے بازار سے گوداموں میں منتقل کر کے اس کی چور بازاری شروع کر دیں اور اس طرح اس مصنوعی قلت سے عوام الناس کا خون چوسیں - حضرت عمرؓ نے ایسے تاجروں کے خلاف عملی اقدام کر کے ثابت کیا کہ اسلام ایسے افراد کے وجود کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا جو محض دولت کی ہوس کی خاطر سے عوام الناس کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے ناقابل معافی جرم کے مرتکب ہوں - اسلام خریدار اور فروخت کار کے درمیان آزاد اور کھلے مقابلہ کی نہ صرف اجازت دیتا ہے - بلکہ اس کی تاکید اور حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے - اسلام میں اجارہ داریوں کی کوئی گنجائش نہیں خواہ وہ خریدار کی جانب سے ہوں یا فروخت کار کی طرف سے - اجارہ داری اگرچہ آج کے دور کی سرمایہ دارانہ معیشت کا خاصہ ہے مگر سراہا ایسے اس معیشت میں بھی نہیں جاتا اس کے اثرات کو زائل یا دائرہ عمل کو محدود کرنے کی کوشش ہر جگہ ہو رہی ہے - اسلام کے چودہ سو سال پہلے اصول معیشت پر وقت نے کوئی اثر نہیں ڈالا اور دنیا کے تمام ممالک اسلامی اصولوں کو اپنے اپنے نظام معیشت میں جگہ دے رہے ہیں - اسلام نہ تو دلالوں کو سراہتا ہے اور نہ ہی سٹہ بازی کو

کاروباری لین دین براہِ راست ہو تو احسن ہے۔

کیونکہ براہِ راست لین دین سے بہت سی قباحتیں دور ہو جاتی ہیں۔ براہ راست لین دین کے علاوہ سودا بازی میں سٹہ بازی کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ مستقبل کا کاروبار حال میں نہیں ہونا چاہیے حال کا کاروبار حال میں اور مستقبل کا مستقبل میں ہی ہونا چاہیے کیونکہ سٹہ بازی میں جوئے کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے اسلامی نقطہ نگاہ سے نہ صرف اسے ناپسند کیا گیا ہے بلکہ اسے حرام بھی قرار دیا گیا ہے۔

شے کے مادی وجود خریدار اور فروخت کار کی موجودگی اور ان کے درمیان رابطہ کے علاوہ جگہ کا وجود بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جگہ نہ صرف اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے ضروری ہے بلکہ اشیاء کے پیدا کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ مصنوعات کو جمع کرنے کے لیے گوداموں کی تعمیر کے لیے بھی جگہ کا وجود ناگزیر ہے۔

منڈی کی اقسام

منڈی کی تقسیم مندرجہ ذیل چار طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔

ا۔ منڈی بلحاظ وقت   ب۔ منڈی بلحاظ محل وقوع

ج۔ منڈی بلحاظ اشیاء   د۔ منڈی بلحاظ مقابلہ

منڈی بلحاظ وقت

۱۔ یومیہ منڈی

۲۔ قلیل المیعاد منڈی ۔ ۳۔ طویل المیعاد منڈی۔

۱۔ یومیہ منڈی: ایسی منڈی میں عموماً ضیاع پذیر اشیاء برائے فروخت لائی جاتی ہیں۔ ان اشیاء کا ذخیرہ کرنا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ یہ چوبیس یا اڑتالیس گھنٹے کے بعد گل سڑ جاتی ہیں۔ مثلاً دودھ، پھل، سبزی، گوشت، مچھلی وغیرہ منڈی میں ایسی اشیاء کی ایک قلیل مقدار ہی فروخت کے لیے لائی جاتی ہے۔ تاکہ سب کی سب پیش کردہ رسد اسی روز ہی فروخت ہو جائے۔ ایسی اشیاء کی رسد عموماً غیر لچکدار ہوتی ہے یعنی ان اشیاء کی پیداوار میں فی الفور اضافہ ممکن نہیں ہوتا۔ اگر کسی روز شہر میں کسی خاص تقریب کی وجہ سے دودھ کی طلب بڑھ جائے تو بھینس بڑھتی ہوئی طلب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے زیادہ دودھ نہیں دیں گی۔ چوں کہ رسد میں فی الفور اضافہ ممکن نہیں ہوتا لہٰذا طلب میں اضافہ کی وجہ سے ایسی اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب طلب سکڑ جائے

تو قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دکاندار انہیں گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے بعض اوقات مصارف سے بھی کم قیمت پر فروخت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

۲ - **قلیل المیعاد منڈی :** ایسی منڈی میں فروخت ہونے والی اشیاء کی رسد کو قلیل عرصہ کے لیے ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر طلب میں اضافہ ہو جائے تو قیمت بھی بڑھ جاتی ہے طلب میں اضافہ سے رسد کی ایک معمولی مقدار میں اضافہ ہی ممکن ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں منڈی میں اشیاء کی قیمت پر طلب کا اثر غالب ہوتا ہے۔

۳ - **طویل عرصہ کی منڈی :** عرصہ طویل میں کاروبار میں توسیع کی وجہ سے رسد میں اضافہ ممکن ہوتا ہے اس لیے اگر طلب میں اضافہ ہو جائے تو رسد میں بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے ایسی منڈی میں قیمت کا تعین شے کی طلب اور رسد کی باہمی مطابقت سے ہوتا ہے ایسے عرصہ میں شے کی قیمت پر رسد نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ طلب کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے رسد میں کمی بیشی کی جاتی ہے۔

منڈی بلحاظ محل وقوع

(۱) مقامی منڈی (۲) ملکی منڈی (۳) بین الاقوامی منڈی

۱ - **مقامی منڈی :** اگر کوئی شے کسی مخصوص علاقے میں بنائی جائے اور اس کے گرد و نواح میں ہی فروخت ہو جائے تو ایسی شے کی منڈی کی حیثیت مقامی بن جاتی ہے ایسی منڈی میں عموماً ضیاع پذیر اشیاء مثلاً دودھ۔ گوشت، سبزیاں وغیرہ ہی برائے فروخت لائی جاتی ہیں جن کو دور دراز کے مقامات تک بھیجنا سہل نہیں ہوتا۔ ایسی اشیاء کی منڈی بھی مقامی نوعیت کی ہوتی ہے۔ جن کا تعلق کسی علاقے کے رسم و رواج اور ذوق و پسند سے ہو مثلاً سندھی ٹوپیاں اور واسکٹ پشاوری چپل، بہاولپوری ظروف ملتان کے اونٹ کی کھال کی مصنوعات وغیرہ، زیادہ حجم یا جسامت مگر کم مالیت کی حامل اشیاء مثلاً اینٹیں۔ ریت۔ بھوسہ وغیرہ اور موسموں کے زیر اثر پیدا ہونے والی اشیاء مثلاً برف اور آئس کریم وغیرہ کی منڈی بھی مقامی نوعیت کی ہوتی ہے۔

۲ - **ملکی منڈی :** اگر کسی شے کی خرید و فروخت ملک کے تمام حصوں میں ہوتی

ہو تو اس شے کی منڈی ملکی یا قومی منڈی کہلاتی ہے۔ مکمل مقابلہ کے حالات میں آمدورفت کے اخراجات اور مقامی ٹیکسوں کے علاوہ ان کی قیمت ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ ایسی منڈی پائیدار اشیاء پر مشتمل ہوتی ہے۔ ملک گیر طلب کے علاوہ وہ اشیاء معیاری بھی ہوتی ہیں۔ قومی منڈی کی وسعت اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرتی ہے۔

۳- **بین الاقوامی منڈی :** جن اشیاء کی خرید و فروخت دنیا کے تمام ممالک میں ہوتی ہے ان کی منڈی عالمی منڈی کہلاتی ہے ایسی منڈی میں مقابلہ کی نوعیت عالمی ہوتی ہے۔ اشیاء پائیدار ہوتی ہیں اور ان کی طلب بھی عالمی نوعیت کی ہوتی ہے۔ مثلاً سونا چاندی وغیرہ۔ اعلیٰ اور منظم حمل و نقل اور رسل و رسائل کی سہولتیں عالمی منڈی کو وسیع کرتی ہیں عالمی تجارت کی بدولت پسماندہ ممالک کو اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کا موقع ملتا ہے۔ عالمی منڈیاں تخصیص کار اور تقسیم کار کی بدولت معرض وجود میں آتی ہیں۔ ان سے پیدائش دولت وسیع ہوتی ہے۔ مادی وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں جس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور بیروزگاری کی لعنت سے نجات پانے کی امید ہوتی ہے۔ ملک اور عوام خوشحال اور ترقی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ محنت اور سرمایہ کے استعمال میں بچت ہوتی ہے جنہیں مفید تر کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ ناگہانی حالات مثلاً قحط وسیلاب آفات سماوی کا مقابلہ عالمی تجارت کی بدولت ہی کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور کے قحط کا خاتمہ یمن اور دیگر بلاد اسلامیہ سے آنے والے تجارتی قافلوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ عالمی تجارت اشیاء کی قیمتوں کو مستحکم کرتی ہے مثلاً اگر ہماری پٹ سن برآمد نہ ہو تو اس کی قیمتیں مصارف پیدائش سے بھی نیچے گر سکتی ہیں جس سے غریب کاشتکاروں کو بے حد نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ایسی تجارت کی بدولت عالمی مقابلہ سے اجارہ داریوں کو ختم کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف ممالک تجارتی تعلقات میں منسلک ہو جاتے ہیں فاضل پیداوار کو عالمی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا ہے۔ ملکی اور عالمی معیشت معاشی بحران سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ عالمی تجارت عالمی امن کو مستحکم کرنے میں بھی مدد دیتی ہے تہذیبی اور ثقافتی ترقی ہوتی ہے نظریات کے تبادلہ سے ربط و تعلق پیدا ہوتا ہے۔

منڈی بلحاظ جنس (۱) عام منڈی (۲) مخصوص منڈی (۳) نمونے کی منڈی (۴) درجہ بندی کی منڈی ۔

۱۔ **عام منڈی:** اس قسم کی منڈی میں ہر قسم کی اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہے ۔ صارفین گردو نواح سے آکر فروخت کی اشیاء خرید کر لے جاتے ہیں ایسی منڈی میں عموماً اشیائے صارفین پرچون نرخوں پر فروخت ہوتی ہیں

۲۔ **مخصوص منڈی:** ایسی منڈی میں عموماً ایک جنس یا اس کے متشابہ اشیاء ہی فروخت ہوتی ہیں یہاں اشیاء کی خرید و فروخت عموماً تھوک نرخ پر ہوتی ہے ۔ مثلاً کلاتھ مارکیٹ، سبزی منڈی، فروٹ مارکیٹ اور غلہ منڈی وغیرہ۔ مخصوص منڈی کے لیے ضروری ہے کہ اشیاء کی پیدائش وسیع پیمانے پر ہو اور نقل و حمل کے ذرائع ترقی یافتہ ہوں

۳۔ **نمونے کی منڈی:** ایسی منڈی میں اشیاء کی خرید و فروخت ان کے نمونوں سے طے پاتی ہے ۔ لہٰذا ایسی منڈی صرف ان اشیاء پر مشتمل ہو سکتی ہے جن کے نمونے تیار کئے جا سکیں ۔ ایسی منڈی عموماً مصنوعات پر مشتمل ہوتی ہے مگر دورِ جدید میں سائنسی تحقیق اور مشینی کاشت عمدہ بیجوں اور کیمیائی کھاد کے استعمال نے زرعی اجناس کے نمونے تیار کرنا بھی ممکن بنا دیا ہے پاکستان میں گندم، چاول کپاس، پٹ سن وغیرہ کے نمونے تیار ہوتے ہیں ۔

۴۔ **درجہ بندی کی منڈی:** سائنسی تحقیق و تجربات نے ہر شے کی درجہ بندی کو بھی سہل بنا دیا ہے جس سے اس کی خرید و فروخت میں آسانی ہو جاتی ہے ۔ اس طرح نمونے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی مثلاً گندم اور چاول کے کئی درجے ہیں ۔ باسمتی چاول کا نام سنتے ہی خریدار کے ذہن میں ایک خاص قسم کا چاول آجاتا ہے اور بغیر دیکھے وہ لین دین کر لیتا ہے ۔

منڈی بلحاظ مقابلہ (۱) مکمل منڈی (۲) نامکمل منڈی (۳) اجارہ دارانہ منڈی ۔

۱۔ **مکمل منڈی:** اگر کسی شے کی تمام اکائیاں اپنے معیار کے لحاظ سے یکساں ہوں اور ان کی خریدار و فروخت کرنے والے افراد کی تعداد اس قدر زیادہ ہو کر ان میں سے کوئی بھی اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے شے کی قیمت پر اثر انداز نہ ہو سکے تو اس کی منڈی خالص منڈی کہلاتی ہے مگر ان دو لوازمات کے علاوہ اگر کسی صنعت میں نئے کاروبار شروع کرنے یا پرانا کاروبار بند کرنے پر کوئی پابندی نہ ہو اشیاء

پیدا کرنے والے عاملین کی رسد لچکدار اور وہ مکمل طور پر حرکت پذیر ہوں۔ خریدار اور فروختکار کو منڈی کے حالات سے مکمل آگاہی ہو وہ ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست یا بالواسطہ طور پر تجارتی رشتے ناطے میں منسلک ہوں اور منڈی میں کسی شے کی ایک وقت میں ایک ہی قیمت رائج ہو تو ایسی منڈی مکمل منڈی کہلاتی

ب: **نامکمل منڈی**: نامکمل منڈی میں کسی شے کی تمام اکائیاں اپنے معیار کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں۔ خریدار یا فروختکار بھی تعداد میں چند ایک ہوتے ہیں جس سے اقلیت میں ہونے والے فریق کو قیمت پر اثرانداز ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ کاروبار کی ابتدا یا اختتام پر پابندیوں کے علاوہ عاملین پیدائش میں نہ تو لچک پائی جاتی ہے اور نہ ہی حرکت پذیری و خریدار اور فروختکار میں نہ تو رابطہ ہے اور نہ ہی انہیں منڈی کے حالات سے مکمل واقفیت اس طرح کی منڈی میں کسی ایک شے کی ایک قیمت بھی رائج نہیں ہوتی۔ کبھی تو گاہک سے شے کی قیمت اس کی معاشی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق وصول کی جاتی ہے اور کبھی منڈی کے محل وقوع کے مطابق۔ مثلاً آپ کار، یا سکوٹر پر دیدہ زیب لباس میں ملبوس جس سے آپ کی امارت ٹپکتی ہو۔ کوئی شے خریدنے جائیں تو وہ دکاندار آپ سے زیادہ قیمت مانگے گا مگر جب عام سادہ لباس میں ملبوس پیدل چلے جائیں تو وہی دکاندار اسی شے کی کم قیمت کا مطالبہ کرے گا۔ منڈی کے کسی مخصوص حصے میں جہاں معاشی طور پر آسودہ افراد خرید و فروخت کے لیے جائیں وہاں قیمت منڈی کے دیگر حصوں کی نسبت زیادہ وصول کی جاتی ہے۔ مثلاً جو تا کشمیری بازار میں انارکلی اور مال کی نسبت سستا ملنے کی بڑی وجہ کشمیری بازار کا محل وقوع ہے کچھ لوگ ہمیشہ اپنی مخصوص دکانوں سے اشیاء خریدتے ہیں۔ اس کی وجہ بعض اوقات تو دکاندار کی خوش خلقی اور حسن سلوک ہوتا ہے بعض اوقات گھر کا قرب اور بعض اوقات اشیاء ادھار لینا ہوتی ہیں امتیازی قیمتوں کی وصولی ایک ہی شے کا ڈیزائن پیکنگ یا رنگ تبدیل کرنے سے بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً لیور برادرز نے ایک ہی صابن کے لکس اور کسوتا نام رکھ کر ان کا رنگ اور پیکنگ بھی تبدیل کر دیا جس سے ان کی علیحدہ علیحدہ قیمتیں رکھنا آسان اور ممکن ہو گیا۔ دنیا کی اکثر منڈیاں نامکمل ہیں اس وجہ سے شے کی قیمت کے تعین کے معاملے میں خاصی کھینچا تانی ہوتی ہے۔

ج۔ **اجارہ دارانہ منڈی**: ایسی منڈی میں شے کا فروخت کار یا تو ایک فرد

فرم یا ادارہ ہوتا ہے۔ شے کا کوئی قریبی نعم البدل نہیں ہوتا اجارہ داری قدرتی اسباب کی بنا پر بھی ہو سکتی ہے اور قانونی طور پر بھی جیسے پاکستان کو پٹ سن، چین کو قدرتی ریشم، انڈونیشیا کو ربڑ، جنوبی افریقہ کو ہیروں اور سوئٹزرلینڈ کو گھڑیاں بنانے میں قدرتی اجارہ داری حاصل ہے۔ سٹیٹ بنک کو کرنسی کے اجرا اور زرمبادلہ کے لین دین کے لیے قانونی اجارہ داری حاصل ہے۔ اجارہ داری میں اجارہ دار صارفین سے مکمل مقابلے کی نسبت زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ اسے رسد پر کنٹرول کرنے اور قیمت کا تعین کرنے کا اختیار ہوتا ہے مگر وہ ان دونوں اختیارات کو بیک وقت استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر وہ رسد متعین کرے تو اسے وہی قیمت قبول کرنا پڑتی ہے جس پر صارفین اس کی پیدا کردہ اشیاء کو خریدنے پر آمادہ ہوں اس کے برعکس اگر وہ قیمت متعین کرے تو اسے اتنی مقدار میں ہی رسد فراہم کرنا پڑتی ہے جو اس کی مقرر کردہ قیمت پر صارفین خریدنے کے لیے تیار ہوں۔ اجارہ داری میں بھی اجارہ دار مختلف گاہکوں سے ایک ہی شے کی مختلف قیمتیں وصول کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

منڈی کی وسعت: منڈی کی وسعت سے مراد شے کی خرید و فروخت کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ بعض اشیاء کی خرید و فروخت محدود پیمانے پر ہوتی ہے۔ اور بعض کی وسیع پیمانے پر۔ کچھ اشیاء مقامی طور پر پیدا ہوتی ہیں اور ان کی فروخت بھی مقامی طور پر ہی ہو جاتی ہے۔ ایسی اشیاء کی منڈی بھی محدود ہوتی ہے لیکن بعض اشیاء پیدا تو کسی ایک مقام پر ہوتی ہیں۔ مگر ان کی فروخت دور دراز مقامات پر اور بعض اوقات ممالک غیر میں بھی ہوتی ہے۔ ایسی اشیاء کی منڈی وسیع ہوتی ہے۔ منڈی کے محدود اور وسیع ہونے کا انحصار کئی عناصر پر ہوتا ہے۔

جن اشیاء کی خصوصیات نمونوں یا درجوں کے ذریعے آسانی سے بیان کی جا سکیں اور خریدار انہیں آسانی سے سمجھ یا شناخت کر سکیں۔ ان کی منڈی وسیع ہوتی ہے جیسے سونا چاندی سرکاری تمسکات و کفالتیں، حصص، صنعتی مصنوعات مشینیں وغیرہ۔ ایسی اشیاء کا لین دین ڈاک و تار یا ٹیلی فون کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔ سبزیوں خام زرعی اجناس وغیرہ کی درجہ بندی کا میں نسبتاً کافی مشکلات حائل ہیں لہٰذا ان کی منڈی نسبتاً محدود ہوتی ہے اول الذکر اشیاء کی منڈی عالمی منڈی بھی بن سکتی ہے۔ جب کہ موخر الذکر اشیاء کی منڈی مقامی یا قومی نوعیت کی ہوتی ہے۔ زرعی اجناس میں کچھ اشیاء مثلاً

کپاس، پٹ سن، چائے اور تمباکو وغیرہ کی درجہ بندی بہتر طریقہ کاشت عمدہ بیج اور کیمیائی کھاد کی بدولت ہو چکی ہے لہٰذا ان کی منڈی وسیع ہے۔

پائیدار اشیاء جن کا ذخیرہ کیا جا سکے اور جلد ضائع نہ ہو جائیں ان کی منڈی بھی وسیع ہوتی ہے جب کہ ضیاع پذیر اشیاء مثلاً سبزیاں، گوشت، دودھ، مچھلی، پھل وغیرہ کی منڈی محدود ہوتی ہے۔ یہ مقامی طور پر پیدا کی جاتی ہیں۔ مقامی طور پر مصرف میں آ جاتی ہیں۔ خام اور زرعی اجناس کی منڈی صنعتی مصنوعات، سونا چاندی اور تمسکات و کفالتوں کی منڈی کی نسبت محدود ہوتی ہے۔

جدید دور میں منڈی کی وسعت ذرائع حمل و نقل یعنی ریلوں سڑکوں، آبی شاہراہوں اور فضائیہ، رسل و رسائل، یعنی ڈاک و تار، ٹیلیفون وغیرہ کی ترقی کی مرہون منت ہے۔ ان ذرائع کی ترقی نے منڈیوں کو وسیع کر دیا ہے۔ اشیاء کو دور دراز مقامات تک پہنچانا ممکن ہو گیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں منڈیوں کی وسعت کی سب سے بڑی وجہ ذرائع نقل و حمل و رسل و رسائل کی اعلیٰ کارکردگی ہے۔ وہاں خریدار اور فروخت کار ہزاروں میل دور بیٹھے ٹیلیفون کے ذریعے ہی لین دین کر لیتے ہیں جس سے منڈی کو وسیع کرنے میں مدد ملتی ہے جب کہ پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں ان ذرائع کے ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے منڈی محدود ہے۔

دور جدید میں بینک ملکی اور بین الاقوامی تجارت کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف تاجروں کی کاروباری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مالیات فراہم کرتے ہیں بلکہ عالمی وصولیوں، ادائیگیوں اور انتقالیوں میں بے بہا خدمات سرانجام دیتے ہیں جس سے منڈی کی وسعت کو بہت تقویت ملتی ہے۔ جن ممالک میں بنکوں کی شاخیں کثرت سے ہوں۔ وہاں منڈی وسعت اختیار کر جاتی ہے۔

عمدہ نظام زر کا منڈی کی وسعت میں کردار کچھ اہم نہیں۔ عمدہ باقاعدہ اور منظم نظام زر اشیاء کے تبادلوں اور انتقالیوں میں مد ثابت ہوتا ہے اگر زر کی قوت خرید مستحکم اور اس کی اندرونی اور بیرونی قدر میں پائیداری پائی جائے تو لوگ اطمینان سے تجارت میں سرمایہ کاری کریں گے۔ جس سے منڈی کو وسعت اختیار کرنے میں مدد ملے گی مگر جب زر کی قدر میں ثبات نہ ہو اور زر کی قدر سرعت سے کم و بیش ہو تو عوام کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ کاروبار کا دائرہ محدود ہو جائے

گا اور اس کے ساتھ منڈی بھی محدود ہو جائے گی۔

جس شے کی طلب وسیع اور عالمگیر ہو اس پر شخصی پسند، علاقائی تمدن اور موسمی تغیرات کا اثر نہ ہو اس کی منڈی وسیع ہوتی ہے مثلاً سونے چاندی، حصص اور تمسکات وکفالتوں پر شخصی پسند کا کوئی اثر نہیں لہٰذا ان کی منڈی وسیع ہے مگر سندھی ٹوپیاں، پشاوری چپل، بہاولپوری ظروف پر علاقائی تمدن کا اثر غالب ہے برف سرد مشروبات اور آئس کریم پر موسمی اثرات کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ مقامی طور پر بن کر دہیں بک جاتی ہیں۔ اسی طرح جو اشیاء وسیع پیمانے پر پیدا کی جائیں ان کی فروخت کے لیے تاجر کو تگ و دو کرنا پڑتی ہے جس سے منڈی کی وسعت میں بہت مدد ملتی ہے۔ وسیع پیمانے پر پیدا ہونے والی اشیاء پیچیدہ تقسیم کار کے اصول پر مبنی ہوتی ہیں۔ مشینوں کا استعمال عام ہوتا ہے لہٰذا اشیاء کو فروخت کرنے کے لیے نشر و اشاعت کا بھی سہارا لیا جاتا ہے جو منڈی کو وسیع کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ باٹا شو کمپنی مشینوں کی مدد سے وسیع پیمانے پر جوتے تیار کرتی ہے لہٰذا وہ اپنی مصنوعات کی نشر و اشاعت کے لیے بذریعہ اخبارات، ریڈیو، سینما سکرین اور ٹیلی ویژن پر ایک معقول رقم خرچ کرتی ہے جس سے باٹا کے جوتوں کی طلب پر خاصا اثر پڑتا ہے شے کی جسامت، حجم اور قدر و قیمت بھی اس کی منڈی کو محدود یا وسیع کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً سونا چاندی اور کفالتوں کی منڈی کی وسعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا حجم اور جسامت تو کم ہوتا ہے مگر قدر و قیمت بہت زیادہ جب کہ اینٹوں بھوسہ اور ریت کا حجم زیادہ ہوتا ہے مگر قدر و قیمت کم لہٰذا ان کی منڈی بھی محدود ہوتی ہے۔

اگر لوگوں کی جان و مال محفوظ ہو۔ ملک اندرونی انتشار اور خلفشار اور بیرونی حملوں سے محفوظ ہو تو لوگ وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کریں گے جس سے پیمانہ پیدائش وسیع ہو کر منڈی کو بھی وسعت بخشے گا۔ اور منڈی وسیع ہو کر عالمی منڈی بھی بن سکے گی مگر جنگ و جدل، اندرونی خلفشار اور سیاسی ابتری میں تجارتی رشتے ناطے بہت کمزور پڑ جاتے ہیں۔ طلب محدود ہو جاتی ہے۔ پیمانہ پیدائش بھی سکڑ جاتا ہے اور رسد بھی گھٹ جاتی ہے جس سے منڈی محدود ہو جائے گی اگر حکومت آزاد تجارتی پالیسی پر عمل پیرا ہو تو اس سے بھی منڈی کو وسیع کرنے میں مدد ملے گی۔ اشیاء کی درآمد اور برآمد پر کوئی پابندی نہیں ہو گی لیکن جب درآمد و برآمد پر مصنوعی

رکاوٹیں مثلاً لائسنس، کوٹہ، تاوان، زرمبادلہ پر کنٹرول عائد کر دی جائیں تو تجارت سکڑنے کے ساتھ منڈی بھی سکڑ جائے گی۔

منڈی کی اہمیت ارتقا اور اس کے اثرات: ابتدائی زمانہ میں جب انسان نے اکٹھے مل جل کر رہنا نہیں سیکھا تھا اور وہ غاروں میں زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ بھوک لگنے پر کسی پھلدار درخت سے پھل توڑ کر کھا لیے۔ درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ لیا اور اسے گرمی اور سردی کے اثرات سے محفوظ کر لیا۔ رہائش کے لیے قدرتی طور پر غاریں موجود تھیں جنہیں تلاش کر کے ان پر قبضہ جما لیا۔ بس یہ تین ہی اس کی ضروریاتِ زندگی تھیں ایسی محدود ضروریات کے ہوتے ہوئے منڈی کی نہ تو ضرورت ہی تھی اور نہ ہی اس کا وجود تھا لیکن جوں جوں انسان کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوئیں اور عقل و دانائی کے جوہر افشا ہوئے اس نے نہ صرف مل جل کر رہنا سیکھا بلکہ ایک دوسرے کے تعاون اور اشتراک کے برکات سے بھی آشنا ہوئے یہ تعاون اور اشتراک پہلے تو کنبے تک محدود تھا۔ جس سے کنبے کے افراد اپنی ضرورت کی تقریباً سب ہی چیزیں خود پیدا کر لیتے تھے اور انہیں دوسرے اشخاص کی پیدا کردہ اشیاء کے ساتھ تبادلہ کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اس تعاون اور اشتراک سے جب تقسیم کار کی بنیاد پڑی تو نہ صرف اشیاء نسبتاً بڑے پیمانے پر پیدا ہونا شروع ہوئیں بلکہ ان کے تبادلہ کی بھی ضرورت پیش آئی کیونکہ تقسیم عمل کی وجہ سے ہر شخص نے اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق کسی ایک کام کو اپنا کر اس میں مہارت حاصل کر لی اور اس کے لیے اپنی ضرورت کی ہر شے پیدا کرنا ناممکن ہو گیا۔ ابتدائی دور میں چونکہ زر کا کوئی منظم نظام نہیں تھا لہٰذا زر کے بدلے اشیاء کے لین دین کی داغ بیل ڈالی گئی جسے بارٹر سسٹم کہتے ہیں لیکن احتیاجات کی دوگونہ عدم مطابقت، معیارِ قدر کی عدم موجودگی، ناقابل تقسیم اشیاء کی موجودگی مستقبل کی ادائیگیوں میں عملی مشکلات، دولت کی نقل پذیری کی دقتوں اور دولت کے ذخیرہ کے فقدان کی وجہ سے اس نظام کو جلد ترک کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور پھر ضرورت ایجاد کی ماں ہے کے مصداق انسان ان مشکلات کے پیش نظر کسی ایسی شے کی تلاش میں سرگرداں نظر آیا جو آلہ مبادلہ کا کام دے اور قدر کا پیمانہ بھی۔ اس کی کوششیں بار آور ہوئیں اور اس نے ایک آلہ مبادلہ اور پیمانہ قدر تلاش کر لیا جسے زر کہتے ہیں زر کی دریافت نے نہ صرف منڈی کی بنیاد کو مستحکم کیا بلکہ اس کی وسعت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

منڈی کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے یہ ایک مرکز ہے جہاں صارفین اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تقریباً ہر وقت موجود ہوتے ہیں جو اسے کئی مشکلات اور پریشانیوں سے نجات دلاتا ہے۔ گوشت کی ضرورت ہو تو آپ گوشت والے کی دکان پر جائیں گے اشیائے خوردنی کی خرید کے لیے غلہ منڈی کا رخ کریں گے اور سبزی خریدنا ہو تو سبزی منڈی جائیں گے۔

اس مرکز پر مختلف قسم کے افراد جمع ہوتے ہیں ہر فرد کی پسند اور ناپسند مختلف ہے اسی لیے ہر شخص کے لین دین کا طریقہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ ان اختلافات کے باوجود ہر فرد کو ایک دائرہ میں رکھنے والے کچھ کاروباری اصول ہوتے ہیں جس سے کسی فرد کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ کسی کے جذبات مجروح نہیں ہوتے۔ کسی کی پسند اور ناپسند کو گزند نہیں پہنچتی۔ یہ کاروباری اصول ایمانداری دیانت اور باہمی احترام و رواداری پر قائم ہیں۔ لوٹ کھسوٹ بددیانتی اور اصل کے دھوکہ میں نقلی مال دینے کا رجحان اس قدر خطرناک اور مہلک ہے کہ اس نے نہ صرف کاروبار کو تباہ و برباد کیا بلکہ قوموں کی رسوائی اور تباہی کا موجب بھی بنا۔ اسلام کے پھیلانے میں صوفیائے کرام کے علاوہ دیانت دار تاجروں کے کردار کی اہمیت کو کسی طرح بھی کم نہیں کہا جا سکتا۔ انڈونیشیا میں تو خاص طور پر دین کو پھیلانے میں تاجروں کا بہت اہم حصہ ہے انگریز تاجر کی دیانت داری ہمارے لیے اب مثالی حیثیت اختیار کر گئی ہے جبکہ خود اسلامی تاجروں کی دیانت اور رواداری کبھی مثالی ہوا کرتی تھی وگر ہم چونکہ مذہب سے کوسوں دور ہوتے گئے اس لیے ہم نے ان سنہری اصول کو بھی فراموش کر دیا۔ جو سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائے تھے تقسیم ملک سے پہلے ہندو تاجر بھی بہت حد تک ان کاروباری اصولوں پر کاربند تھا۔ اسی لیے خود مسلمان تاجر سے سودا سلف خریدنے کی بجائے ہندو تاجر سے خریدنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اگر منڈی میں تاجر دیانت داری سے تجارت کریں اور صحیح صحیح مال خریداروں کے سپرد کریں اور جائز منافع کمائیں۔ ذخیرہ اندوزی چور بازاری اور ملاوٹ جیسے تباہ کن اور ناقابل معافی جرائم کے مرتکب نہ ہوں۔ گاہک کو ادا شدہ قیمت کے مطابق اشیا دی جائیں تو اس سے خود تاجر کی عملی زندگی میں ایک حیرت انگیز اخلاقی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

منڈی جہاں افراد کی اخلاقی تربیت کر کے انہیں راست گوئی، سچائی، دیانتداری اور اخوت کی تلقین کرتی ہے وہاں اس کے ساتھ لوگوں میں باہمی اعتماد و تعاون

کا بیج بھی بوتی ہے۔ معاشرتی تعلقات استوار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر عمر بھر اکٹھے کاروبار کرنے سے تاجروں میں ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ کاروباری تاجرانہ تعلقات تک پھیلتے ہیں اور انہیں رشتہ اخوت میں منسلک کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف منڈی میں اگر صارفین کو ان کی زر کی شکل میں ادا شدہ قیمت کے برابر اشیاء کی شکل میں افادہ مل جائے تو ان کا فروختکاروں پر نہ صرف اعتماد بحال رہتا ہے بلکہ انہیں اپنی صرف ادا شدہ رقم سے زیادہ سے زیادہ تسکین بھی مل جاتی ہے اور ان کا احساس محرومی ختم ہو جاتا ہے۔

دیانت دار تاجر کے ہاتھوں صارف کبھی محروم اور مایوس نہیں ہوتا لیکن جس منڈی کی بنیاد ہی دھاندلی اور لوٹ کھسوٹ پر ہو تو اس میں صارف سب سے زیادہ مظلوم ہوا کرتا ہے۔ بددیانت تاجر صارف کا مال تو لوٹتا ہی ہے اس کے ساتھ وہ ملاوٹ شدہ اور گھٹیا اشیاء فراہم کر کے اس کی صحت اور زندگی کے ساتھ بھی کھیلتا ہے۔

صارف کے ساتھ انصاف صرف منظم منڈی میں ہی ہو سکتا ہے جس کے تاجر انتظامیہ کی کڑی نگرانی میں تجارت کرتے ہیں۔ منڈی کے کارندوں کو بددیانتی کی جرأت نہیں ہوتی۔ باٹ سرکاری مہر شدہ استعمال ہوتے ہیں۔ کسی تاجر کو خریدار پر کسی قسم کی زیادتی کرنے کی نہ ہمت ہوتی ہے اور نہ ہی اجازت۔ خریداروں سے مال کے دام ان کی ظاہری حیثیت کے مطابق وصول نہیں کیے جاتے۔ سب کے لیے شے کے ایک ہی دام ہوتے ہیں اور شے بھی ملاوٹ سے پاک۔ مگر ایسی منڈیوں کے قیام و دوام کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے ذہنوں کو بھی پاک اور صاف کرنا ہوگا اور تاجر کے ذہن سے ہوس زر کو ختم کرنا ہوگا۔ سرورِ کائناتؐ کا فرمان ہے کہ دیانت دار تاجر آخرت میں شہداء اور صدیقوں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔

منڈی کا تقدس مسلم ہے اور یہ عبادت گاہ سے کم نہیں بشرطیکہ تاجر کاروباری اصولوں اور دیانت داری کے تحت نیک نیتی سے کاروبار کرے۔ گاہک کی عزت و تکریم سے اس کا اپنا وقار بڑھتا ہے گاہک سے خوش خلقی اس کے اپنے کردار اور شخصیت کو ابھارتی ہے جس سے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے اور منڈی میں وسعت آتی ہے۔

منڈی دیانت داری کی تربیت گاہ ہے۔ یہ افراد کی اخلاقی تربیت کے علاوہ ان میں اخوت بھائی چارہ اور باہمی ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے۔ باہمی میل جول سے ذہنی نشوونما ہوتی ہے۔ خیالات بلند ہوتے ہیں۔ تہذیب اور تمدن اور ثقافت میں

ترقی ہوتی ہے۔ دوسرے علاقوں کے اہم رسم ورواج سے آگاہی ہوتی ہے۔ کیونکہ منڈی میں ہر مقام کا فرد لین دین کے لیے آتا ہے۔ دوسروں کے جذبات اور احساسات کو سمجھنے اور ان کے احترام کی ضرورت کا پتہ چلتا ہے مگر منڈی کی یہ جامع صفات اور ان کے مثبت اثرات معاشرہ پر اسی وقت عیاں ہو سکتے ہیں جب اس کی بنیاد باہمی اعتماد، اخوت اور دیانت داری پر استوار کی گئی ہو۔ ان حالات میں معاشرہ ذخیرہ اندوزی ملاوٹ، چور بازار اور لوٹ کھسوٹ جیسی لعنتوں سے پاک ہو جائے گا ورنہ بد دیانتی اور دولت کی حرص وہوس قومی دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کر کے معاشی ناہمواریاں پیدا کرے گی جس سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعتی کشمکش معاشرہ کو لے ڈوبے گی۔ قومی اقتصادی ترقی کا دارومدار کسی طرف تو کلیتہً منڈی اور اس کی وسعت پر ہے جس سے مادی۔ مالی اور انسانی وسائل کو بروئے کار لا کر قومی دولت پیدا کی جاتی ہے معاشی خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ بیروزگاری کا انسداد ہوتا ہے اور معیار زندگی بلند ہوتا ہے اور دوسری طرف منڈی کے اثرات معاشرہ کے اوپر اس قدر گہرے ہیں کہ اس سے لوگوں میں اخوت، باہمی اعتماد اور دیانت داری جیسے جوہر پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی بنیادی صفات ہیں اور تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی ترقی کی راہیں بھی ہموار ہوتی ہیں۔

ریاست

ریاست کو انسانی معاشرت میں بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ معاشرتی زندگی کا تحفظ، نظم و نسق اور امن و سلامتی کا دارومدار ریاست پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے معاشرتی زندگی کا آغاز ہوا ہے قیادت اور اقتدار کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا ہے۔ اسی لیے علماء عمرانیات نے ریاست کو معاشرے کا اہم ادارہ قرار دیا ہے۔ اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ریاست پر مفصل گفتگو کی جائے

ریاست کیا ہے :-

وہ ارفع معاشرتی ادارہ جو انسان کے تمدنی امور کو قانون کی رُو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے۔

انگریزی میں ریاست کے لیے لفظ اسٹیٹ .State استعمال کرتے ہیں جو .Status سے ماخوذ ہے۔ قدیم ماہرین سیاست نے مملکت کی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے۔ ارسطو کہتا ہے۔

"مملکت خاندان اور دیہاتوں کی اس تنظیم کا نام ہے جس کا مقصد مکمل اور آزاد زندگی کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔"

بلنشلی .Bluntshli یہ تعریف کرتا ہے:-

"مملکت لوگوں کی وہ سیاسی منظم جماعت ہے جو کسی مقام پہ رہتی ہو۔"

ڈاکٹر ووڈرو ولسن Wood Row Wilson کے قول کے مطابق "ریاست سے افراد کا کسی مخصوص علاقہ کے اندر قانون کی خاطر منظم ہونا ہے۔"

برجس کہتا ہے:

"مملکت انسانوں کی اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں سیاسی تنظیم موجود ہو۔"

ہالینڈ کہتا ہے:

"مملکت انسانوں کے اس وسیع جماعت کو کہتے ہیں جو عموماً ایک خاص حصہ پر آباد ہو اور جن میں اکثریت کی رائے مخالف طبقہ کی رائے پر فوقیت رکھے۔"

گارنر نے زیادہ وضاحت کے ساتھ تعریف کی ہے۔

"مملکت کم یا زیادہ افراد کی وہ سیاسی جماعت ہے جو دائمی طور پر کسی خاص خطہ زمین پر قابض اور تمام خارجی اثرات سے آزاد ہو۔ جس کی ایک منظم حکومت ہو، اور جس کی لوگ اطاعت کرتے ہوں۔"

گلکرائسٹ کہتا ہے:

"ریاست علم سیاست کا ایک تخیل اور اخلاقی حقیقت ہے جس کا وجود ایسی جگہ پایا جاتا ہے جہاں اشخاص کی ایک تعداد جو معین قطعہ ارض میں رہتی ہو۔ ایک ایسی حکومت کے تحت متحد ہو جو داخلی معاملات میں ان کے اقتدار اعلیٰ کے ظہور کا ذریعہ ہو اور خارجہ معاملات میں دوسری حکومتوں سے آزاد ہو۔"

لاسکی کہتا ہے:

"ایک علاقائی معاشرہ جو حکومت اور رعایا میں بٹا ہوا ہو اور اپنے طبعی مخصوص رقبہ کے اندر تمام دوسرے اداروں پر برتری کا دعویدار ہو۔"

اسلامی نقطہ نگاہ سے مملکت کی تعریف یہ ہے:

"مملکت State وہ بلند ترین معاشرتی ادارہ جو انسانوں کے دینی اور دنیاوی معاملات کو اسلامی دستور کی رو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے۔"

مملکت کے کم از کم اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

۱۔ آبادی ۲۔ علاقہ
۳۔ تنظیمی ڈھانچہ ۴۔ حکومت
۵۔ دستور ۶۔ اقتدارِ اعلیٰ

۱۔ **آبادی**: آبادی مملکت کے وجود کے لیے نہایت ضروری ہے بغیر آبادی کے مملکت کا تصور ہی ناممکن ہے کیونکہ مملکت نام ہے اس بلند ترین معاشرتی ادارے کا جو انسان کی تمدنی زندگی کے معاملات کو قانون کی رو سے سرانجام دیتا ہو۔

۲۔ **علاقہ**: ریاست کا دوسرا جزو علاقہ ہے آبادی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مخصوص علاقے میں آباد ہوں۔ جس کا مناسب حدود اربعہ ہو۔

۳۔ **تنظیمی ڈھانچہ**: ریاست کا تیسرا جزو تنظیمی ڈھانچہ ہے جو معاشرے کے تمام طبقات اور اداروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۴۔ **حکومت**: ریاست کا چوتھا جزو حکومت ہے۔ حکومت اس مشینری کا نام ہے جو ریاست کے فیصلوں کو نافذ کرتی ہے اور امن و امان قائم کرتی ہے۔

۵۔ **دستور**۔ ریاست کا پانچواں جزو دستور ہے۔ دستور اس مجموعہ ضوابط کا نام ہے۔ جس میں مملکت کے نظام۔ تقسیم اختیارات اور مختلف حکومتوں کے باہمی تعلقات سے اصولی بحث ہوتی ہے۔

۶۔ **اقتدار اعلیٰ**: اقتدار کا چھٹا جزو اقتدار اعلیٰ ہے۔ اقتدار اعلیٰ سے وہ بالا طاقت مراد ہے جو مملکت کی حدود کے اندر سب انجمنوں پر فائق ہوتی ہے۔

اقتدار اعلیٰ کے متعلق سیاسی نظریات اور اسلامی نظریات کا اختلاف ہے۔ سیاسی نظریات کی رُو سے اقتدار اعلیٰ یا تو فرد واحد کے ہاتھ میں ہوگا یا چند افراد کے ہاتھ میں یا عوام کے ہاتھ میں یا چرچ کے ہاتھ میں۔ لیکن اسلام کی رو سے اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہے کوئی دوسرا بندہ دوسرے بندے پر حکومت نہیں کر سکتا ارشاد الٰہی ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ [1] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔

عہد حاضر کا ایک فرانسیسی ماہر سیاسیات ڈی ٹوکویل انسانوں کی حاکمیت کے رد میں اور خدا کی حاکمیت کے حق میں لکھتا ہے:

"مطلق اقتدار فی الواقع ایک بہت بڑی چیز ہے اور خطرناک بھی، کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اقتدار مطلق کو دور اندیشی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اقتدار مطلق کا مرجع صرف خدائے واحد کی ذات ہے کیوں کہ اس کے اقتدار کی کارفرمائی کے پہلو بہ پہلو اس کی حکمت اور اس کا عدل بھی کارفرما ہے لیکن دنیا کے اندر کوئی ایسا معتبر اور قابل اطاعت اقتدار نہیں پایا جاتا جس کے احکام کو میں ہر ہر معاملے میں غیر مشروط

---

[1] یوسف ۱۲: ۴۰

طور پر قبول کرتا جاؤں جب میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ کسی ملک کو یا کسی حکومت کو خواہ وہ شخصی ہو یا ڈیموکریٹک یا بادشاہت ہو یا ری پبلک ہو اقتدار مطلق سونپ دیا گیا ہے تو مجھے اسی وقت انتشار وانارکی کے بیج نظر آنے لگتے ہیں اور میں فوراً ایک ایسی ریاست کی تلاش کرنے لگتا ہوں۔ جو میری حقیقی آرزو پوری کرے ؎

مملکت کے ابتدائی نظریات

مملکت کا آغاز کس طرح ہوا، منتشر افراد نے کس طرح سوچا کہ انہیں مل جل کر ایک مملکت قائم کرنی چاہیئے ؟ اس سوال کے جوابات مغربی مفکرین سیاست نے دیئے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔ نظریہ تخلیق ربانی Divine Theory. سیاسی زندگی کے ابتدائی ادوار میں پروہتوں Priests. کو ایک خاص مقام حاصل تھا وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تصور کیے جاتے تھے ہر شخص ان سے خوف کھاتا تھا اور ان کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان پروہتوں نے یہ سمجھ لیا کہ انہیں دوسرے لوگوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

قدیم زمانہ میں مذہب اور حکومت دو علیحدہ چیزیں نہیں تھیں۔ مشرق کی تمام شہنشاہتیں اسی عقیدہ کا نتیجہ تھیں۔ عوام کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ تھا کہ بادشاہ کو اختیارات دیوتاؤں کی طرف سے ودیعت کیے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا اقتدار کا سرچشمہ نہیں بلکہ وہ حکومت کے انتظام و انصرام میں بھی شریک ہے۔ اہل یونان اور اہل روما نے یہ اعلان کیا کہ مملکت ایک انسانی تنظیم تو ہے لیکن بلاواسطہ وہ ربانی Divine بھی ہے۔

اس نظریہ کی رو سے مملکت انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ خدا کی بنائی ہوئی ہے اس کے قیام سے انسان کا کوئی تعلق نہیں اس کا آغاز اللہ کی مرضی سے ہوا ہے۔ ....

.... اسی وجہ سے سیاسی اقتدار کا سرچشمہ اس کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ایک اپنا نائب مقرر کرتا ہے اور بندوں کی حکومت اس کو سونپ دی جاتی ہے۔ بادشاہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ عوام کے سامنے نہیں اس کا ہر حکم قانون ہے کوئی شخص اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اگر کوئی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ گویا خدا کے احکام کو توڑ رہا ہے اور وہ خدا کا باغی ہوگا۔ انگلستان

کے اسٹیورڈ خاندان کے پہلے بادشاہ جیمس اول نے اس نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

"جس طرح خدا کے افعال پر نقطہ چینی کرنا غیر مذہبیت اور الحاد ہے اسی طرح رعایا کو بادشاہ کے حرکات و سکنات پر تنازع پیدا کرنا قابلِ تحقیر ہے "

یہ نظریہ اسلام کی سیاسی تعلیم کے سراسر مخالف ہے ۔ اسلام صرف اللہ ہی کو تمام طاقتوں اور اختیارات کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور اسی کی حاکمیت کا قائل ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے :
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [1] حکم دینے کا اختیار اللہ کو ہی حاصل ہے جو امارت کے منصب پر متمکن ہوگا ۔ وہ صرف اللہ کے قانون کے تابع ہوگا ۔ اگر وہ قوانین الٰہی سے سرِمو انحراف کرے تو عوام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ امیر کو معزول کردیں ۔ ارشادِ الٰہی ہے : اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ [2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں بیان فرمایا : فان انا احسنت فاعینونی وان انا زغتُ فقوّمونی ۔ پس اگر میں نیکی کی زندگی اختیار کروں تو میری مدد کرو اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کردو ۔

۲ ۔ نظریہ قوت : Force Theory اس نظریہ کی رو سے مملکت کا آغاز فتوحات کی بنا پر ہوا ۔ وہ اس طرح کہ کسی قوی اور مضبوط سردار نے دوسروں کو زیر کرلیا اور ان پر اپنی فرمانروائی قائم کرلی ۔ پھر ان کی مدد سے ارد گرد کے قبائل اور اقوام کو زیر کرنا شروع کردیا ۔ جب اس کی قوت بڑھ گئی تو اس نے اپنی حکومت کا اعلان کردیا ۔ یہ اصول ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے ۔ آج بھی یہی ہے اور آج سے ہزاروں سال پہلے بھی یہی تھا ۔ قوی کمزور پر غالب آجاتا ہے ۔ قوی حاکم بن کر اور کمزور مغلوب ہو کر زندگی بسر کرتا ہے ۔ اس نظریہ کی رو سے قوت ہی حق کی دلیل ہے ۔

پلوٹارک نے (سوانح کیملوس باب ۱۷) میں برینوس شاہ گال کی زبان سے یہ نظریہ بیان کیا ہے :

"تمام قوانین میں سب سے قدیم تر قانون وہ ہے جو قوی کو کمزور پر حکمران بناتا ہے "

تنقید :

۱ ۔ اسلام قوت کے بل بوتے پر دوسروں کو زیر کرنے کا حامی نہیں ۔ اسلام صرف دفاع کے لیے قوت استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے ۔ ارشادِ الٰہی ہے :
وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (بقرہ)
اور اللہ کے راستہ میں جنگ کرو صرف ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں ۔

---

[1] یوسف : ۱۲ : ۴۰ [2] المجادلہ : ۵۸ : ۲۰

دوسری جگہ آتا ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ۔
ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ اُن پر ظلم کیا گیا۔

۲۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مملکت کا آغاز صرف فتوحات پر مبنی ہے بلکہ قوت کے پہلو بہ پہلو اور بھی بہت سی قوتوں نے مملکت کے ڈھانچے کو جنم دیا۔

۳۔ یہ نظریہ ذاتی آزادی اور قانون کی نفی کرتا ہے۔

۴۔ جبر و قوت کا اصول انسانی سوسائٹی کے لیے غیر موزوں ہے۔

نظریہ معاہدہ عمرانی Social Contract Theory یہ نظریہ بے حد مقبول ہے اس نظریہ کی رو سے ایک سوسائٹی کے افراد باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم سب مل کر ایک اجتماعی نظام قائم کریں۔ جس میں افراد کے مسائل اور حقوق اور مملکت کے فرائض اور حقوق مقرر کر دیے جائیں۔

اس نظریہ کا قدیم مسکن یونان تھا لیکن اسے اٹھارہویں صدی میں یورپ میں ہابز Hobbes لاک Locke اور روسیو Rousseau نے خاص طور پر پھیلایا اس نظریہ پر جمہوریت کی بنیاد ہے یعنی لوگوں کی حکومت باہمی رضامندی سے۔

تنقید:

محاسن: اس نظریہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مملکت انسانوں کی کوشش کا ثمرہ ہے۔ رائے عامہ سے بنائی جاتی ہے اور کسی ایک شخص کو لوگوں پر حکومت کا حق نہیں اگر رئیس مملکت لوگوں کے مفاد کے خلاف کام کرے تو اس کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

نقائص:

۱۔ اس نظریہ کی رو سے مملکت ایک مصنوعی چیز ہوتی ہے اور مملکت اور عوام کا تعلق عارضی ہوتا ہے۔ لیکن قدیم سے سیاسی مفکرین یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ عوام اور مملکت میں ایک گہرا رشتہ ہے اور ہمیشہ ہے۔

۲۔ اول تو تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ بات ثابت نہیں کہ لوگوں نے کبھی مملکت بنانے کے لیے معاہدہ کیا تھا اگر مان بھی لیا جائے تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ معاہدہ کرنے والوں کی اولاد بھی اس معاہدہ کی پابند رہے گی اور ان تمام شرائط کو مان لے گی جن کے تحت وہ معاہدہ ہوا تھا۔

مادری نظریہ: Matriarchal Theory بعض قبائل میں مرد کی جگہ بزرگ عورت کو اختیارات دیے جاتے تھے اور اس کو قبیلہ کا سربراہ تسلیم کر لیا جاتا تھا اور اس کے فیصلوں

ء الحج ۲۲: ۳۹

اور احکام کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا۔

تنقید: یہ نظریہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے اسلام مرد کو نگران اعلیٰ مقرر کرتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ یعنی مرد عورتوں کے نگرانِ اعلیٰ ہیں۔

عورت کی جسمانی ساخت بھی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ حکومت کرنے کی اہل نہیں ہے۔

نظریہ پدر سری: Patriarchal Theory اس نظریہ کی رُو سے مملکت کی ابتدا خاندان کے بزرگ فرد کے اختیارات سے ہوئی ہے ہر خاندان میں ایک بزرگ ہوتا ہے جس کے احکام کے مطابق کے تمام افراد اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور اس کے ہر حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں جب مختلف خاندان ایک قبیلہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اس قبیلہ کا انتظام کے لیے ایک شخص کو بزرگ تسلیم کر لیا جاتا تھا وہ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ جب قبائل میں باقاعدہ تنظیم آگئی تو انہوں نے دوسرے قبائل پر حملہ کر کے مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مملکت کی بنیاد پڑ گئی۔ ارسطو سے لے کر انیسویں صدی تک علما نے سیاست کی ایک نہ ایک جماعت نے اس نظریہ کی تائید کی ہے۔

مملکت کی تدریجی ترقی: Evolution of Theory ارسطو اپنی کتاب "سیاسیات" میں لکھتا ہے۔" مملکت ایک سیاسی ادارہ ہے۔ انسان فطری طور پر ایک سیاسی حیوان ہے"

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان طبعی طور پر مدنی الطبع ہے۔ اور وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسی قوتیں ودیعت کر رکھی ہیں کہ وہ باہمی تعلقات کو منظم کرے۔ اس فطری اہلیت کی بنا پر تنظیم کی ابتدا ہوئی۔ جس نے رفتہ رفتہ مملکت کی شکل اختیار کر لی۔ مملکت کی ابتداد مختلف اثرات کے تحت ہوتی ہے مثلاً معاشی ضروریات امن، جان، مال اور عزت کی حفاظت وغیرہ۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کی وجہ سے مملکت کا آغاز ہوا۔

مملکت کی اقسام

جس طرح مملکت کو وجود میں آنے کے لحاظ سے مختلف نظریوں کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مملکت کو اختیارات اور اسالیب کے لحاظ سے مختلف انواع میں تقسیم کیا جاتا ہے یونانِ قدیم میں ارسطو نے حکومت کی تقسیم تین طرح سے کی ہے۔

۱۔ ایک شخص کی حکومت (بادشاہت)
۲۔ چند افراد کی حکومت (اشرافیہ)
۳۔ بہت سے افراد کی حکومت (دستوریہ حکومت)

اب ہم ان اقسام کی مختصر تشریح کرتے ہیں:

ارسطو ایسی ریاست کو جس کا حکمران فردِ واحد ہو۔ جو عوام کی بہبودی اور فلاح کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ملوکیہ Monarchy کا نام دیتا ہے۔ جب بادشاہ عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے محض ذاتی اغراض کے لیے حکومت کرتا ہے تو ایسی ریاست کو ارسطو جابرانہ حکومت Tyranny کا نام دیتا ہے۔

جب بادشاہ کے ظلم و ستم بڑھ جاتے ہیں اور عوام عدل و انصاف سے محروم ہو جاتے ہیں، تو معاشرہ سے چند افراد عوام کی بھلائی اور عدل و انصاف کا ترازو قائم کرنے کے لیے اُٹھتے ہیں اور جابر بادشاہ کی حکومت کو ختم کر دیتے ہیں اور اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ ارسطو اس ریاست کو اشرافیہ Aristocracy کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کچھ عرصے بعد اچھے حکمرانوں کی جگہ دولت مند افراد نظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لیتے ہیں، وہ دولت مند حکمران خود غرضانہ اغراض کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ارسطو ریاست کو عدیہ Oligarchy کہتا ہے

جب دولت مند حکمران افراد کے ظلم انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو عوام ان کی حکومت کو ختم کر دیتے ہیں وہ آئین کے مطابق حکومت چلاتے ہیں۔ ارسطو ایسی حکومت کو دستوریہ Polity کہتا ہے

ارسطو اس طرزِ حکومت کو مثالی حکومت کہتا ہے۔

جب کثیر التعداد افراد آئین کو چھوڑ کر اپنی خود غرضانہ اغراض کے لیے حکومت کرنا شروع کر دیں تو مملکت مخرب ہو کر عمومیہ Mixed State بن جاتی ہے۔

نقشہ

حاکموں کی تعداد	عمدہ مملکت	خراب مملکت
فردِ واحد کی حکومت	بادشاہت	جابرانہ حکومت
چند افراد کی حکومت	اشرافیہ	عدیہ
بہت سے لوگوں کی حکومت	دستوریہ	عمومیہ

میکاویلی کی تقسیم: میکیاویلی ارسطو کی تقسیم مملکت کو تسلیم کرتا ہے۔ البتہ ایک نوع

ا اضافہ کرتا ہے جسے وہ "مرکب حکومت" Democracy قرار دیتا ہے۔

جین بوداں Jean Bodin ارسطو کی طرح حاکموں کی تعداد کے لحاظ سے مملکت کی تین بیان کرتا ہے۔

بادشاہت : Monarchy جس کی تین قسمیں ہیں :

ا- استبدادی : Despotism جس میں رعایا کو غلام تصور کیا جاتا ہے

ب- شاہی : Royal Monarchy جس میں بادشاہ قانون کی پابندی کرتا ہے اور رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے۔

ج قہرمانیت : Tyranny جس میں بادشاہ قانون کی کوئی پرواہ نہیں کرتا عوام پر ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں

۱- امرا کی حکومت : Aristocracy

۲- جمہوریت : Democracy عوام کی حکومت

بلنچلی Bluntschli کی تقسیم

جرمن سیاست دان بلنچلی اس پر چوتھی قسم تھیا کریسی کا اضافہ کرتا ہے۔ یعنی خدائی اختیارات کے مطابق حکومت

مانٹسکو کی تقسیم : مانٹسکو نے سب سے پہلے مملکتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱- جابرانہ مملکتیں

۲- آئینی مملکتیں

۱- جابرانہ مملکتیں : Despotic States وہ ہیں جن میں فرد واحد حکومت کرتا ہے جو کسی قانون کے تابع نہیں ہوتا۔

۲- آئینی مملکتیں : Constitutional States وہ مملکتیں ہیں جن میں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے ان کی پھر دو قسمیں ہیں۔ بادشاہت، جس میں فرد واحد حاکم ہوتا ہے۔ ری پبلک (جمہوریہ) جس میں عوام یا ان کا کوئی حصہ حکومت کرتے ہیں۔

جمہوریہ کی پھر دو قسمیں ہیں

۱- اشرافیہ : Aristocracy جس میں حکومت چند افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔

۲- جمہوریت : Democracy جس میں بہت سے افراد حکومت کرتے ہیں

روسو کی تقسیم ، فرانس کے فلاسفر اور سیاست دان روسو نے مملکت کو بادشاہت اشرافیہ و جمہوریہ میں تقسیم کیا ہے۔ اشرافیہ کی مزید تین قسمیں بیان کرتا ہے۔ اول قدرتی اشرافیہ، دوم

انتخابی اشرافیہ۔ سوم، وراثتی اشرافیہ

روسو انتخابی اشرافیہ کو بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے کیونکہ اس طرز حکومت کو چلانے میں عوام کا دخل ہوتا ہے۔

سر جے، اے آر مریوٹ Sir J. A. R. Marriot کی تقسیم: موجودہ دور میں مریوٹ نے مملکت کی تقسیم بیان کی ہے اس کی تقسیم سہ بندی Thre Fold. اساس پر قائم ہے۔

وحدانی: Unitry وہ ریاستیں جن میں حاکمیت ایک مرکز پر مرتکز ہوتی ہے وہ وحدانی ریاستیں کہلاتی ہیں۔

وفاقی: Federal. جن ریاستوں میں حاکمیت دو یا دو سے زیادہ مراکز میں تقسیم کر دی جائے وہ وفاقی ریاستیں کہلاتی ہیں۔

دوم: مریوٹ ریاستوں کو دستور کے لحاظ سے تقسیم کرتا ہے اگر دستور میں آسانی سے ترمیم کی جا سکے تو لچکدار Flexible دستور ہوتا ہے۔ اگر دستور میں ترمیم کرنا مشکل ہو تو وہ بے لچک Rigid دستور کہلاتا ہے

تیسرا اصول: آیا حاکمیت مقننہ کے پاس ہے یا عاملہ کے پاس۔ اگر حاکمیت مقننہ کے پاس ہے تو ریاست پارلیمانی کہلاتی ہے۔ اگر عاملہ یا صدر کے پاس ہے تو صدارتی نظامِ حکومت کہلاتی ہے۔

لیکاک Leacock کی تقسیم: عصر حاضر میں لیکاک کی تقسیم مملکت اعلیٰ خیال کی جاتی ہے جو درج ذیل ہے۔

۱۔ بادشاہت Monarchy ۲۔ اشرافیہ Aristocracy

۳۔ جمہوریہ Democracy

بادشاہت: اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں حکومت کے تمام اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ مطلق العنان بادشاہت ب۔ آئینی بادشاہت

ا۔ مطلق العنان بادشاہت: Absolute Monarchy اس طرز حکومت کو کہتے ہیں جس میں بادشاہ کے اختیارات غیر محدود ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی حیثیت ایک دیوتا کی ہوتی ہے لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں اس کے ہر حکم کو دل و جان سے مانتے ہیں اس قسم کی مملکتیں سترھویں صدی میں یورپ میں پائی جاتی تھیں۔ جاپان میں بادشاہ کو یہی مقام حاصل ہے۔

ب ۔ آئینی بادشاہت : Constitutional Monarchy آئینی بادشاہت میں نظریاتی اعتبار سے بادشاہ کے ہاتھ میں ہر قسم کے اختیار ہوتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر ان اختیارات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ گو بادشاہ فرماں روائے اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ مملکت کے قوانین کے تابع ہوتا ہے اور قوانین سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا صرف مقننہ قانون ساز جماعت ہوتی ہے وہ قانون بناتی ہے اور ان قوانین کی بادشاہ منظوری دیتا ہے۔ اس قسم کی حکومت انگلستان میں ہے۔ نظریاتی طور پر بادشاہ کو تمام اختیارات حاصل ہیں لیکن عملی طور پر وہ تمام اختیارات کابینہ استعمال کرتی ہے۔ جو برطانوی پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہے۔

۲ ۔ اشرافیہ : Aristocracy اشرافیہ وہ طرزِ حکومت ہے جس میں حکومت کی باگ ڈور صرف مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں امراء اور جاگیرداروں کی حکومت کا نام اشرافیہ ہے۔ اشرافیہ کی بنیاد تعلیم یا دولت پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی ریاستیں عموماً قرونِ اولیٰ یا ازمنہ وسطیٰ میں پائی جاتی تھیں۔ جاگیرداری Feudal دستور اشرافیہ کی ایک قسم ہے گو اس قسم کی مملکت دورِ حاضر میں نہیں پائی جاتی لیکن اس کے اثرات ہر ملک میں پائے جاتے ہیں کہ امراء اور زمیندار دولت اور ثروت کے بل بوتے پر حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں۔

۳ ۔ جمہوریت : Democracy یہ وہ طرزِ حکومت ہے۔ جس میں عوام حکومت کرتے ہیں۔ ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

Government of the people, for the people,

by the people

یعنی جمہوریت حکومت کی وہ شکل ہے جو عوام کی حکومت ہو۔ عوام کے لیے ہو اور عوام ہی اسے چلاتے ہو۔

جمہوریت کی دو قسمیں ہیں :

ا ۔ بلاواسطہ جمہوریت Direct Democracy

ب ۔ بالواسطہ جمہوریت Indirect Democracy

ا بلاواسطہ جمہوریت : اس قسم کی طرزِ حکومت قدیم زمانہ میں پائی جاتی تھی۔ قدیم یونان اور اٹلی میں شہری ریاستیں City States پائی جاتی تھیں۔ ان کا رقبہ اور آبادی کم ہوتی تھی۔ افراد آسانی کے ساتھ نظامِ حکومت میں حصہ لے سکتے تھے۔ اس قسم کی مملکتوں میں تین قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ اول وہ شہری جن کو ہر قسم کے حقوق حاصل

ہوتے تھے اور وہ آزادی کی نعمت سے متمتع ہوتے تھے۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کا نظم و نسق ہوتا تھا، دوسرے غیر ملکی افراد جن کو صرف غیر سیاسی حقوق حاصل ہوتے تھے۔ تیسرے غلام۔ جنہیں کسی قسم کے حقوق اور اختیارات حاصل نہیں ہوتے تھے قسم اول کے لوگ ہی مقننہ، عاملہ اور عدلیہ بناتے تھے۔

آج کل مملکتوں کے رقبے بہت وسیع ہیں اس وجہ سے اس قسم کی حکومتیں کہیں نہیں پائی جاتیں لہٰذا عملی اعتبار سے قدیم جمہوریت کو اشرافیہ کا نام دیا جا سکتا ہے

بلاواسطہ جمہوریت چھوٹی ریاستوں کے لیے بڑی موزوں ہے۔ لیکن اس دور میں کوئی بھی حکومت ایسی نہیں ہے جس میں رعایا کا ایک حصہ حقوقِ انسانی سے محروم ہو۔

ب۔ بالواسطہ جمہوریت: عصرِ حاضر میں ملکوں کا رقبہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ عوام براہِ راست حکومت میں حصہ نہیں لے سکتے اس وجہ سے وہ اپنے نمائندے چن کر بالواسطہ حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں ہی حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے، وہی انتظام کرتے ہیں۔

رئیس مملکت کے اقتدار کے لحاظ سے جمہوریت کی دو قسمیں ہیں

و۔ جمہوریت بادشاہت Democratic Monarchy

ب۔ جمہوریہ Republic

و جمہوریت بادشاہت: یہ طرز حکومت آئینی بادشاہت Legal Monarchy کا دوسرا نام ہے۔

ب۔ جمہوریہ: Republic اس طرز حکومت کو کہتے ہیں۔ جس میں مقننہ کے ارکان اور ان کے علاوہ عاملہ کے ممبران لوگوں کے منتخب نمائندے ہوتے ہیں۔

وحدانی حکومت: Unitary States جس میں تمام مملکت ایک ہی وحدت تصور ہوتی ہے اور سارے اختیارات مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اس قسم کی مملکت میں صوبائی حکومتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ حکومتیں مرکز کی ہدایت پر کام چلاتی ہیں مرکز صرف اپنی آسانی کے لیے کچھ اختیارات صوبوں کو تفویض کر دیتا ہے۔ لیکن ان صوبائی حکومتوں پر پورا کنٹرول مرکز کا ہی ہوتا ہے۔

وفاقی مملکت: Federal State جس میں مملکت کی مختلف وحدتیں Units ہوتی ہیں اور باہمی اشتراک سے کام کرتی ہیں۔ تمام وحدتوں کا مرکز ایک ہوتا ہے۔

اقتدار اعلیٰ مرکز کو ہی حاصل ہوتا ہے

فری مین نے وفاقی مملکت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"وفاقی حکومت وُہ ہے جو غیر قوموں کی نگاہ میں ایک مملکت کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جو اندرونی معاملات کے متعلق بہت سی حکومتوں پر مشتمل ہو۔ فی الحقیقت وفاق ایک ایسی مملکت ہے جس میں ملک کا دستور اساسی .Constitution سارے اختیارات مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک طرح سے ہم اسے دوعملی حکومت Dual Government بھی کہہ سکتے ہیں۔ تقسیم اختیارات .Division of Power اس کی روح ہے۔

امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور پاکستان وفاقی مملکتیں ہیں؛

پھر ان میں سے ہر طرز حکومت یا تو پارلیمانی Parliamentarian ہوگا یا غیر پارلیمانی۔ پارلیمانی طرز حکومت میں ہیئتِ اجزائیہ Executive - لیجسلیچر کے سامنے جوابدہ ہے۔ اور لیجسلیچر نصب اور عزل کی مجاز ہے لیکن غیر پارلیمانی طرز حکومت میں ہیئتِ اجزائیہ Executive - لیجسلیچر کے ماتحت نہیں ہوتی بلکہ ایک مدت معینہ کے لیے قائم رہتی ہے۔

انہی میں سے ایک طرز حکومت صدارتی ہے جس میں ایک مقررہ مدت کے لیے صدر حکومت کو تمام اختیارات تفویض کر دیے جاتے ہیں اور لیجسلیچر کا اس پر کوئی اقتدار نہیں ہوتا۔ دورِ حاضر میں جمہوری طرزِ حکومت کے برعکس آمرانہ حکومتیں بھی ہیں۔

اسلامی ریاست

اسلامی حکومت کے نام

امامت، خلافت، امارت: اسلامی حکومت کے تین نام ہیں۔ امامت، خلافت، امارت۔ تینوں ناموں کی تشریح جید علماء کے الفاظ میں بیان کی جاتی ہے

امامتِ کبریٰ: امامت ایک ایسی ریاستِ عامہ کا نام ہے جو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی قانونی نمائندگی سے حاکمانہ بالادستی حاصل کرتی ہے دروین و دنیا کی اجتماعی سرگرمیوں میں اپنی عظمت و طاقت کا اس طرح اظہار کرتی ہے کہ اس ں اعلیٰ رہنمائی کے اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں[1]

گویا امامتِ کبریٰ اسلامی حکومت کا اعلیٰ ترین نام ہے۔

علامہ ابن خلدون رقمطراز ہیں:۔

"حکومت کا وہ منصب جو دین کی نگہبانی اور دنیا کے سیاسی فرائض کو پورا کرتا ہے، خلافت و امامت ہے۔ اس کو امامتِ کبریٰ اور خلافتِ عامہ کہا جاتا ہے[2]"

علامہ شیخ محمد ابن بن عابدین امامت کبریٰ کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا کے باشندوں پر وہ عام تصرف جو ایک ریاست عامہ کی تشکیل کا موجب ہوتا ہے اور جس کو پیغمبر کی نمائندگی کا فخر حاصل ہو"[3]

امارت: جب حکومت امور عامہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر افراد امت کو معروفات کا حکم دیتی ہے اور منکرات کا سے روکتی ہے تو وہ امارت امت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہ لفظ امر سے مشتق ہے۔ امر کے معنی ہیں حکم۔ اور حکم حکومت کا فعل ہے۔ ابو البقاء نے مختصر الفاظ میں امارت کی تعریف کی ہے "امارت ولایت ہے"[4] یعنی امارت حکومت ہے۔

---

[1] المواقف والمرصد فی الامامۃ جلد ۸ صفحہ ۳۴۴ ماخوذ از اسلام کا نظامِ حکومت تالیف مولانا حامد الانصاری غازی [2] مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون (امامت و خلافت صفحہ ۱۳۴) [3] رد المختار بر در المختار باب امامۃ جلد ا صفحہ ۵۱۱ [4] کلیات ابو البقاء حنفی لفظ امارت صفحہ ۱۴۳۔

امارت میں اطاعت اور غلبہ دونوں باتیں شامل ہیں اور یہی حکومت کی اصل ہے

اسلامی حکومت کے رئیس کے خطابات: ۱۔ امام اعظم: یہ نام اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ امام حکومت کا قائد ہے۔

۲۔ **خلیفہ**: رسول کریم صلی اللہ علیہ کا نائب ہونے کی وجہ سے خلیفہ کہلاتا ہے

۳۔ **امیر**: معروفات کا حکم دینے اور منکرات سے روکنے کی وجہ سے کہلاتا ہے

خلیفہ یا امیر کی ضرورت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: الوالی من الرعیۃ کالروح من الجسد[1] یعنی حاکم رعیت میں ایسے ہیں جیسے روح جسم میں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: اسلام بغیر جماعت کے نہیں اور جماعت بغیر امیر کے نہیں ہے۔

خلیفہ کا انتخاب: رئیس مملکت کا انتخاب عوام یا ارباب حل و عقد سے ہونا چاہیے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ[2] یعنی مسلمانوں کا اجتماعی کاروبار باہمی مشورہ سے طے پاتا ہے۔

اسلام کے دور اول میں جب خلفاء راشدین کے انتخاب پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خلفاء کا انتخاب براہِ راست شوریٰ کے ذریعہ ہوا حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی۔ اس وقت وہاں انصار اور مہاجرین کے صاحب الرائے افراد موجود تھے۔ تبادلہ خیالات اور اسباب ترجیح پر تبصرہ بھی ہوا تھا۔ پھر مسجد میں عام بیعت ہوئی اور سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کے لیے نام تجویز کیا۔ پہلے اہل حل و عقد سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد مرضی عامہ حاصل کرنے کے لیے نام پیش کیا۔ اہل و عقد کی رائے اور مرضی عامہ معلوم کر لینے کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ اس نامزدگی میں بھی اپنی مرضی شامل نہیں بلکہ عوام کی مرضی شامل ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے حل و عقد کی ایک مجلس شوریٰ مقرر کر دی اور خلافت کے لیے چند نام تجویز فرما دیے۔ مجلس شوریٰ کو یہ ہدایت کی اصحاب الرائے سے مشورہ کر کے کسی ایک کا نام تجویز کر دیں۔ اس کے بعد عوام کی مرضی معلوم کر لی جائے۔ رائے عامہ کے مطابق خلیفہ

---

[1] کنوز الحقائق حدیث ۱۰۲

[2] الشوریٰ ۴۲: ۳۸۔

منتخب کر لیا جائے۔ کثرت رائے سے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔

حضرت علیؓ کی بیعت بھی جمہور کی رائے کے مطابق ہوئی۔

خلفاء راشدین کے انتخاب کے طریقے گو مختلف ہیں۔ لیکن عوام کی رائے کا دخل ہر طریقے میں کارفرما ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں ولی عہدی بعد نامزدگی کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

شرائط امارت یا خلافت

شرط اوّل:- امیر مملکت مسلمان ہو۔ کیونکہ شریعت اسلامیہ کے مطابق نظام حکومت چلانے کے لیے وہی شخص مستحق ہو سکتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو اور یہ ناممکن ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر آپ کا خلیفہ بنے: قرآن مجید میں آتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ[1]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کی تابعداری کرو اور رسولؐ کی اپنے میں سے صاحب امر کی تابعداری کرو۔

اس آیت کریمہ میں مِنْكُمْ کا لفظ اس بات پر صریح النص ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ انہی میں سے ہو گا۔ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر فوقیت رکھنے کو ہرگز روا نہیں رکھے گا

شرط دوم:- خلیفہ کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو اس لیے شرعاً مجنون اور نابالغ کے کسی تصرف پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔

شرط سوم:- جسمانی نقص نہ ہو۔

خلیفہ جسمانی نقص نہ رکھتا ہو۔ جس وجہ سے وہ فرائض منصبی اچھی طرح سرانجام نہ دے سکے۔ اگر وہ دوران خلافت کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً پاگل ہو جائے مفلوج ہو جائے۔ اندھا ہو جائے وغیرہ تو پھر بھی اس کو مسند خلافت سے معزول کر دیا جائے گا۔

قرآن مجید میں آتا ہے:-

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ[2]

یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اس کو چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔

یہ آیت اس بات پر اشارۃ النص ہے کہ خلیفہ کے لیے حواس اور اعضاء کی سلامتی

---

[1] النساء ۴: ۵۹۔ [2] بقرہ ۲: ۲۴۷۔

ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقص سے ایک تو کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ دوم۔ دوسروں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے

شرط چہارم: کفایت

کفایت سے مراد سیاستِ حاضرہ اور زمانہ کے جدید تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ[1] یعنی ہم نے داؤد علیہ السلام کو حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

سورۂ بقرہ آیت ۲۴۷ سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ خلیفہ کے اندر معاملہ فہمی ژرف نگاہی اور مسائل کے حل کرنے کا ملکہ ہونا چاہیئے۔

شرطِ پنجم: علوم دینیہ کا ماہر

خلیفہ کے لیے علوم دینیہ کا ماہر ہونا ضروری ہے تاکہ کلیات شرعیہ کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کو حل کر سکے اور لاعلمی کی بنا پر حدود شرع سے تجاوز نہ کرے۔

شرطِ ششم: تقویٰ۔ عدل اور امانت۔

امیر متقی عادل اور امین ہونا چاہیئے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ[2] اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴: ۵۸) بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "امانات" سے مراد حکومت کی باگ ڈور ہے۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ[3]

حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کیجئے۔ میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔

شرطِ ہفتم: شجاعت

خلیفہ کا شجاع ہونا ایک ناگزیر شرط ہے۔ تاکہ دشمن کے حملے کے وقت جہاد کا جوش پیدا کر سکے۔

---

[1] ص ۳۸: ۲۰ [2] الحجرات ۴۹: ۱۳ [3] یوسف ۱۲: ۵۵

شرطِ ہشتم: اسلامی حکومت کی صدارت کے لیے مرد کا ہونا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
اس قوم نے ہرگز فلاح نہیں پائی۔ جس کا نظام اقتدار ایک عورت کے ہاتھ میں ہو۔ (بخاری)

خلیفہ کے اختیارات

اختیاراتِ تنفیذی: خلیفہ محکمہ کا حاکم اعلیٰ ہے۔ اس وجہ سے ہر فرد پر معروف کاموں میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار: قوانین شرعیہ کی تنفیذ کے لیے قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار ہے۔

حکام کے نصب و عزل کا اختیار: حکومت کے حکام کے نصب و عزل کا اس کو اختیار حاصل ہے۔

احتساب و مواخذہ کا اختیار: خلیفہ سلطنت کے ہر فرد سے اس کی کسی قانون شکنی پر مواخذہ کر سکتا ہے اور اسے سزا دے سکتا ہے۔

جنگ و صلح کا اختیار: خلیفہ کو ملکی حالات کے مطابق جنگ اور صلح دونوں کا اختیار حاصل ہے۔

حکام کی کارروائیوں کی تفتیش کا اختیار: خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر عامل کی غیر اسلامی کارروائی کی تفتیش کرے اور ان کو سزا دے

خلیفہ کی انتظامی مجلس شوریٰ: خلیفہ کے لیے ملکی امور چلانے کے لیے ایک ایسی مجلس ہوگی۔ جس کے ارکان کا انتخاب خود کر سکتا ہے تاکہ وہ تنفیذی اختیارات کے استعمال کے سلسلہ میں مشورہ دے۔ مجلس کی رکنیت کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:-

۱۔ مسلمان ہونا ۲۔ عالم دین ہونا ۳۔ عادل ہونا ۴۔ مشورہ دینے کا اہل ہونا
۵۔ ملکی حالات سے باخبر ہونا۔

اختیاراتِ تشریعی: خلیفہ کو اصحاب الرائے کے مشورہ کے ساتھ ضمنی قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [1] تو ان سے کاموں میں مشورہ لے۔

امیر کا حقِ تنسیخ:

ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مجلس تشریعی کے متفقہ یا کثرت رائے سے پاس شدہ مسودہ قانون کو خلیفہ مسترد کر سکتا ہے یا کہ نہیں۔

اگر مجلس تشریعی ایک قانون متفقہ یا کثرت رائے سے پاس کر لیتی ہے جو کسی نص صریح کے خلاف ہو تو خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس قانون کو مسترد کر دے۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر جید صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف سردست جہاد نہ کریں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

لیکن کسی نص صریح کے خلاف فیصلہ نہ ہو تو خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کثرتِ رائے سے پاس شدہ قانون کو مسترد کر دے۔

عادلانہ اختیارات:

عدالتوں کے لیے ضوابط مقرر کرنے کا اختیار خلیفہ کو ہے یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ عدالت کی آزادی میں دخل اندازی کرے۔ خلیفہ نہ عدالت کو کسی فیصلہ کا حکم دے سکتا ہے اور نہ کسی فیصلہ سے روک سکتا ہے

امیر مملکت کے اختیارات پر پابندیاں:

اسلام خلیفہ کو کلی طور پر اختیارات نہیں دیتا کہ وہ جس طرح چاہے کرے۔ بلکہ اس پر کچھ پابندیاں بھی ہیں۔

امیر کو یہ اختیار نہیں کہ شریعت کے کسی حکم کو بدل ڈالے اور نہ اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مفادِ عامہ کے خلاف کوئی قانون نافذ کر دے۔ خلیفہ عوام کے سامنے اپنے فعل کا جوابدہ ہے عوام اس سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ اس نے یہ کام کیوں کیا۔ یہ حکم کیوں دیا۔

خلیفہ کی معزولی:

خلیفہ کو حسب ذیل صورتوں میں منصب خلافت سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

۱. خلیفہ دین اسلام سے مرتد ہو جائے۔

۲. پاگل ہو جائے۔

۳. دشمن کے ہاتھ اسیر ہو جائے اور رہائی کی امید نہ رہے۔

---

[1] الشوریٰ ۴۲: ۳۸

۴ - ایسا مرض لاحق ہو جائے جس وجہ سے سلطنت کے فرائض سرانجام نہ دے سکتا ہو۔

۵ - فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے

۶ - قانون کی بالادستی کو تسلیم نہ کرے

۷ - مسلمانوں کے دینی اور دنیوی امور کی حفاظت نہ کرے

سید شریف لکھتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کے کام درست طریقے سے انجام نہ پائیں اور دین کے معاملات میں خرابی کی صورت نظر آئے تو امت امام کو عہدہ سے علیحدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اجتماعی نظم کے لیے امام کا تقرر بھی امت کے حق میں ہے۔ اور معزول کرنا بھی۔"[1]

۸ - اگر امام ارباب حل و عقد کے مشورہ کے بغیر حکومت کا نظام چلانا چاہے تو اس کو معزول کر دینا چاہیئے۔ ابن عطیہ لکھتا ہے:۔

"اگر صدر حکومت ماہرین علم و فن اور امت کے دین دار افراد کا مشورہ طلب کیے بغیر اپنی رائے سے کام کرتا ہے تو اس کو معزول کر دینا چاہیئے۔ اس پر تمام علماءِ قانون متفق ہیں"[2]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ کی اطاعت اسی وقت تک ضروری ہوتی ہے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ[3]۔ امیر کی معصیت میں کوئی فرمانبرداری نہیں ہے۔ فرمانبرداری صرف معروف میں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنے تو مسجد نبویؐ میں صحابہ کرام کے سامنے اپنے خطبہ میں فرمایا:

یا ایہا الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان انا احسنت فاعینونی وان انا زغت فقومونی[4]

اے لوگو! میں اسلام کے احکام کی پیروی کرنے والا ہوں اور کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں اگر میں نیکی کا راستہ اختیار کروں تو میری مدد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا

---

[1] المواقف مع شرح جلد ۸ صفحہ ۳۵۲۔ [2] وحکی القرطبی من ابن عطیہ لا خلاف فی وجوب العزل من لا یستشیر اہل العلم والدین۔ فتح القدیر شوکانی ال عمران جلد ا صفحہ ۳۶۰۔
[3] بخاری۔ [4] کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶

کرو۔

صحابہ کرام نے فرمایا ہم آپ کو نیزوں کی انیوں سے درست کر دیں گے۔

اقتدارِ اعلیٰ

مفہوم : اقتدار اعلیٰ Sovereignty. کا انگریزی مترادف لاطینی زبان کے ایک لفظ Superanus. سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں اعلیٰ یا فائق یا برتر و بالا۔

اس معنی کی رو سے اقتدارِ اعلیٰ کا مفہوم یہ ہوا کہ ایسا اقتدار جو تمام دوسرے اقتداروں سے اعلیٰ ہے اور سب پہ برتری اور فوقیت رکھتا ہے۔

سیاسی نقطۂ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ وہ طاقت ہے جو قوانین بناتی ہے اور اس کا نفاذ کرتی ہے اور لوگوں کو اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ یہ طاقت سب طاقتوں پر فائق ہوتی ہے۔

تعریفات : مغربی مفکر بودین اقتدار اعلیٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"شہریوں اور رعایا پر ریاست کا ایسا فائق اختیار جو قانونی حد بندیوں سے آزاد ہو۔"

برگس Burgess نے اقتدار اعلیٰ کی اس طرح تعریف کی ہے۔

"اقتدار اعلیٰ مملکت کا وہ اصلی مطلق العنان غیر محدود اور مکمل اختیار ہے جس کے ماتحت ملک کا ہر فرد اور ہر جماعت ہوتی ہے۔"

جان آسٹن نے اس طرح تعریف کی ہے۔

"اگر ملک میں ایسا برتر اور افضل انسان ہو جو کسی کے ماتحت نہ ہو اور جس کے احکام کی پابندی کی سوسائٹی عادی ہو چکی ہو تو اس مخصوص اور برتر شخص کو اس سوسائٹی کا مقتدر اعلیٰ یا فرمانروا Sovereign. متصور کیا جائے گا اور منظم سوسائٹی مع اس افضل شخص کے آزاد سمجھی جائے گی۔"

پولک Pollack کہتا ہے:

"اقتدار اعلیٰ کی قوت نہ وقتی ہوتی ہے اور نہ مستعار لی ہوئی اور نہ دنیا میں وہ کسی دوسری طاقت کے رو برو جوابدہ ہوتی ہے۔"

گرو شیش کہتا ہے:

"ایسے شخص میں تفویض شدہ سیاسی اختیار اعلیٰ ہے جس کے اعمال کسی دوسرے کے

"تابع نہیں ہیں اور جس کی منشا کا رد نہیں ہو سکتا"

روسو جان لاک کہتا ہے :۔

" یہ اعلیٰ اختیار عوام کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن اس کا عملی اظہار حکومت کے ذریعے ہوتا ہے۔

روسو کا نظریہ اقتدار اعلیٰ: روسو نے اقتدار اعلیٰ کو ارادہ عامہ یا مشیت عامہ کے سپرد کیا ہے۔ اس طرح وہ عوامی اقتدار اعلیٰ کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا تعریفات کی رو سے اقتدار اعلیٰ یا تو سلطنت کو حاصل ہے جیسا کہ بودین کا نظریہ ہے یا سلطنت کا بادشاہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ جیسا کہ جان اسٹن گروشیش کا خیال ہے یا مرضی عامہ یعنی قوم کی عام منشا اقتدار اعلیٰ ہے۔ جیسا کہ روسو کہتا ہے :۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم

اسلامی نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ وہ بالادست طاقت ہے جس سے بالا کوئی طاقت نہ ہو۔ اسلام کے نظام حکومت میں خدا تعالیٰ ہی اقتدار اعلیٰ کا حقیقی مالک ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں آتا ہے :۔ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ [۱] اللہ حکمران کرتا ہے کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا نہیں ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [۲]۔ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ [۳] تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کر اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [۴] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی اور قانونی حاکمیت صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔ عہد حاضر کا فرانسیسی ماہر سیاسیات ڈی ٹوکویل خدا کی حاکمیت کے متعلق لکھتا ہے:

" مطلق اقتدار فی الواقعہ ایک بری چیز ہے اور خطرناک بھی۔ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اقتدار مطلق کو دوراندیشی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اقتدار مطلق کا مرجع

---

[۱] الرعد ۱۳ : ۴۱ [۲] سورۂ یوسف ۱۲ : ۴۰ [۳] المائدہ ۵ : ۴۸ [۴] المائدہ ۵ : ۴۴۔

صرف خدائے واحد کی ذات ہے کیونکہ اس کے اقتدار کی کارفرمائی کے پہلو بہ پہلو اس کی حکمت اور عدل بھی کارفرما ہے۔ لیکن دنیا کے اندر کوئی ایسا معتبر اور قابل اطاعت اقتدار نہیں پایا جاتا جس کے احکام کو ہر معاملے میں غیر مشروط طور پر قبول کرتا جاؤں۔ جب میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ کسی قوم یا کسی ملک کو یا کسی حکومت کو خواہ وہ شخصی ہو یا ڈیموکریٹک یا بادشاہت ہو یا ری پبلک۔ اقتدار سونپ دیا گیا ہے تو مجھے اسی وقت انتشار و انارکیت کے بیج نظر آنے لگتے ہیں اور میں فوراً ایک ایسی ریاست کی تلاش کرنے لگتا ہوں جو میری حقیقی آرزو پورے کرے۔"

اقتدارِ اعلیٰ کی خصوصیات: قرآن مجید کی رو سے اقتدار اعلیٰ کی حسب ذیل خصوصیات ہیں:۔

۱۔ وحدتِ اقتدار:۔ اسلامی حکومت کا اقتدار اعلیٰ اپنے اقتدار میں وحدت اور یگانگت کا مالک ہوتا ہے اور اس کے اقتدار میں کوئی دوسرا شریک اور ساجھی نہیں ہو سکتا جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا[۱] وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ[۲] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔

لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ[۳] یعنی مملکت میں اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

۲۔ قدرتِ عامہ:۔ قدرت اور قوت اللہ تعالیٰ کے حاکمانہ اقتدار کی ایک خصوصیت ہے۔ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ قدرتِ عامہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی مکمل نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کے ساتھ نہیں ہو سکتی وہی ہے جس کی اعلیٰ ہستی اعلیٰ درجے کا اقتدار اور قدرت رکھتی ہے۔ وہ ایک قادر اور مقتدر ہستی کی حیثیت سے اپنے حکم اور حکومت کے کام میں قابلِ تعریف تشخص کا مالک ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:۔ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ[۴]: اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۔ بالادستی: بالادستی اقتدار اعلیٰ کی روح ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں بالادستی اقتدار اعلیٰ کی حقیقت ہے۔ علامہ ابن اثیر جزری فرماتے ہیں "خداوند عالم بلند و بالادست ہے"۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے مرتبہ اور حکومت میں اتنا اونچا ہے

---

[۱] الکہف ۱۸ : ۲۶ [۲] یوسف ۱۲ : ۴۰ [۳] بنی اسرائیل ۱۷ : ۱۱۱

کہ اس سے کوئی اونچا نہیں ہے۔[۱] امام غزالی فرماتے ہیں " دنیا کی ہر چیز اس کے تحت سلطنت کے ماتحت ہے اور تحت اس کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ اس کا اقتدار اور قدرت عامہ اور حکومت کمال کے ایسے منتہا پر ہے کہ اس سے اوپر کوئی اقتدار نہیں ہر کمی سے محفوظ اور ہر نقص سے خالی اس کے غلبے اور تسخیر کی قوتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ حکومت اس کی مالک ہے "

قرآن مجید میں آتا ہے: فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ: اللہ برحق بادشاہ بلند و بالا ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔

كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا: یعنی اللہ کا ہی حکم سب حکموں سے بلند ہے۔

۴۔ آزادی: اقتدار اعلیٰ کو حکم اور نفاذ حکم کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ بلنچلی لکھتا ہے: " اقتدار کی آزادی اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں داخل ہے "[۲]

قرآن مجید میں آتا ہے: وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ۱۴/۲۷ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ۳۵/۴۴ اور اللہ ایسا نہیں کہ اسے کوئی چیز عاجز کر دے۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔

۵۔ جلالت عامہ: اقتدار اعلیٰ کی حاکمیت کے لیے جلالت ایک ضروری وصف ہے امام راغب فرماتے ہیں: جلالت ایک خاص وصف ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ (مفردات القرآن جل جلالہ۔)

۶۔ دوام: لازوال زندگی اقتدار اعلیٰ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مخصوص ہے۔ وہی ہستی ہے جو ہر قسم کے زوال سے پاک ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ اس کی حاکمیت نامعلوم زمانہ تک ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الحدید ۵۷: ۳) کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی اللہ اور اس کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد بھی وہی رہے گا۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ یعنی پہلے بھی اور بعد میں بھی حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ وہ ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے (بقرہ ۲: ۲۵۵)

۷۔ بے تعطلی: اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں لمحہ بھر بھی تعطل واقع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت فعال اور خبردار رہتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

---

[۱] النہایہ لابن اثیر ج ۳ ص ۱۴۱۔ [۲] نظریۂ السلطنت ج ۲ ص ۵۰۳

(البقرہ ۲:۲۵۵) یعنی اس کو نہ کسی وقت نیند آتی ہے اور نہ اونگھ وَلَا یَؤُدُہٗ حِفْظُهُمَا۔
(۲ : ۲۵۵) اسے دنیا و مافیہا کی حفاظت تھکا نہیں دیتی۔

۸۔ ناقابل انتقال: اللہ تعالیٰ کے اختیارات ناقابل انتقال ہیں۔ اس کے تمام اختیارات ذاتی ہیں،۔ دوسرے کسی شخص کو منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ دنیا کی ہر چیز اسی کے ماتحت اور حلقہ اقتدار میں ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت مالک بیان کی ہے۔ عربی زبان میں مالک وہ ہستی ہوتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں ہر قسم کے اختیارات ہوں۔

۹۔ جامعیت تامہ: اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے۔ اس کے اقتدار کی حدود غیر معین اور غیر محدود ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ (البقرہ ۲ : ۱۱۵) مشرق اور مغرب کی وسعتیں سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ[۱] یعنی اس کی حکومت زمین و آسمان تک ہے۔ اگر کوئی انسان یہ کوشش کرے کہ اس کی حکومت سے کہیں باہر نکل سکتا تو وہ نکل نہیں سکتا۔

حکومت کے فرائض

جان، مال اور عزت کی حفاظت: حکومت کا سب سے اول اور مقدم فرض یہ ہے کہ شہریوں کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرے۔ نہ تو حکومت ان چیزوں پر ہاتھ اٹھائے اور نہ کسی کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت دے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ[۲] کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ حق کے بغیر قتل نہ کرو۔

لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ[۳] اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ[۴] کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کل المسلم علی المسلم حرام دمہ و مالہ وعرضہ (مسلم) مسلمان کی ہر چیز ہر مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون بھی اس کا

---

[۱] البقرہ ۲ : ۲۵۵ [۲] بنی اسرائیل ۱۷ : ۳۳ [۳] البقرہ ۲ : ۱۸۸
[۴] الحجرات ۴۹ : ۱۱

مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:-

ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا۔ (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں وہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن (عرفہ کا دن) کی حرمت ہے۔

ان چیزوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی ضمانت شامل ہے۔ اگر کوئی حکومت جان و مال اور ناموس کی حفاظت نہیں کر پاتی تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے عہد کو توڑتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ ورسولہ پس یہ وہ مسلم ہے جس کے جان مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے لیا ہے۔

شخصی آزادی: اسلامی ریاست میں ہر فرد کو شخصی آزادی حاصل ہے۔ جب تک کہ وہ دوسروں کے مفاد کو نقصان پہنچانے میں استعمال نہیں کرتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:- لا یوسد الرجل فی الاسلام بغیر عدل (موطا) اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جاسکتا۔

مذکم تعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً[۱] تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا۔ حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا۔

شرار الناس الذین یشترون الناس ویبیعونھم[۲] برے لوگ وہ ہیں جو انسانوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔

مذہب کی آزادی: قرآن مجید میں آتا ہے: لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ[۳] دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ[۴] تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ[۵] اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔

قانونی مساوات: اسلام کا ہر شہری خواہ وہ امیر ہو یا غریب قانون کی نظر میں برابر ہوتا ہے۔ فاحکم بینھم بما انزل

---

۱ احسن المحاضر جلد ۲ ص۱ ۲ ترمذی۔ کنوز الحقائق۔ ۳ بقرہ ۲: ۲۵۶ ۴ الکافرون ۱۰۹: ۶ ۵ یونس ۱۰: ۹۹۔

اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَاءَھُمْ عَمَّا جَاءَکَ مِنَ الْحَقِّ [۱]

پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس قانونِ حق آیا۔ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ [۲]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ قوانین کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ سخت ذلیل لوگوں میں سے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی قریش نے اس عورت کو قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے حضرت اسامہؓ کو حضورؐ کی خدمت میں سفارش کے لیے بھیجا۔ جونہی اسامہؓ نے اپنا مدعا ظاہر کرنے کے لیے زبان کھولی تو حضورؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ پھر لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ فرمایا:

تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے اور اگر کوئی بااثر آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا۔ آپؐ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہٖ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا [۳]۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے چوری کی ہوتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں بھی اس قانونی مساوات کو دہرایا۔ فرمایا:

ان اقواکم عندی الضعیف حتی اخذ لہ بحقہ وان اضعفکم عندی القوی حتی اخذ منہ الحق [۴]۔ تمہارے طاقت ور اور بااثر لوگ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہیں جب تک کہ میں ان سے ان پر واجب شدہ حق لے لوں اور تمہارے کمزور لوگ میرے نزدیک اس وقت تک طاقت ور ہیں اور بااثر ہیں جب تک میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دوں۔

جبلہ بن ایہم کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے حج کے موقع پر ایک بدو کو تھپڑ مار دیا۔ اسلامی قانون میں یہ سزا تھی کہ وہ بدو اس کے منہ پر تھپڑ مارے۔ چونکہ ایک والی ریاست تھا: اس کو یہ بات ناگوار گزری حضرت عمرؓ سے ایک رات کی مہلت مانگی تو وہ رات کی تاریکی میں بھاگ گیا اور

۱۔ المائدہ ۵: ۴۸ ۲۔ المجادلہ ۵۸: ۲۰

۳۔ مسلم باب قطع السارق الخ ۴۔ کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۲۶۶۔

مرتد ہو گیا۔

حضرت عمروؓ بن میمون سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ اے لوگو! میں اپنے عاملوں کو تمہارے پاس اس لیے نہیں بھیجتا کہ وہ تمہیں ماریں، یا تمہارے مالوں کو ناجائز طریقوں سے لوٹیں۔ بلکہ میں ان کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ وہ تم کو تمہارا دین اور تمہارے نبیؐ کی سنت سکھائیں۔ اگر کسی کے ساتھ اس قسم کی تعدی کی گئی ہو۔ تو وہ مجھے بتا دے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اس کو زیادتی کرنے والے سے اس کا قصاص ضرور دلواؤں گا۔ یہ سن کر عمروؓ بن العاص اٹھے اور یوں گویا ہوئے اے امیرالمؤمنین فرض کیجئے کہ ایک شخص کہیں کا وال ہے اور وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ بولے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اس سے بھی مظلوم کو قصاص دلواؤں گا۔ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپؐ اپنی ذات کو بھی قصاص کے لیے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ خبردار! مسلمانوں کو مارو نہیں کہ ان کو ذلیل کر کے رکھ دو۔[1]

معاشرتی مساوات: اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے درمیان رنگ و نسل قوم کے لحاظ سے طبقاتی تقسیم نہیں کرتی۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے طبقاتی تفریق بالکل باطل ہے۔ اسلام میں صرف تقویٰ ہی بزرگی کی علامت ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝[2]

اے لوگو! ہم نے تم کو مرد عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو زیادہ متقی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:۔ یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی[3] اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی

---

[1] کتاب الخراج ص ۶۶ [2] الحجرات ۴۹: ۱۳ [3] مسند احمد

کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پہ اور سیاہ کو سرخ پہ کوئی فضیلت نہیں۔ مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اقتصادی مساوات: اسلامی حکومت کا ایک اہم فرض ہے کہ وہ ہر ایک شہری کے لیے معاشی ترقی اور خوش حالی کے راستے برابر کھولے اور ان تمام راہوں کو مسدود کرے۔ جن کے ذریعے انسان دوسرے کے حقوق کو تلف کر سکتا ہے اور ناجائز طریقے سے سیم وزر سے اپنی تجوریوں کو بھر سکتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ[۱] اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا[۲] ان کی دنیاوی زندگی میں ہم نے ان کی روزی تقسیم کر دی ہے

وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَہٗ بِرٰزِقِیْنَ[۳] اور تمہارے لیے اس میں روزی کا سامان پیدا کر دیا۔ اور اس کے لیے بھی جسے تم رزق نہیں دیتے۔

وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ[۴]۔ اور بے شک ہم ہی تم کو زمین میں رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لیے سامانِ معیشت پیدا کیے۔

ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرنے کی ممانعت میں اصولی طور پر قرآن مجید میں آتا ہے:

لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ[۵] اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔

آزادیٔ اجتماع کا حق: ارشادِ الٰہی: وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[۶] اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

نجی زندگی کی حفاظت: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا[۷]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو جب

---

[۱] الروم: ۳۰: ۴۰ [۲] الزخرف: ۴۳: ۳۲ [۳] الحجر: ۱۵: ۲۰ [۴] الاعراف: ۷: ۱۰

[۵] البقرہ: ۲: ۱۸۸ [۶] آل عمران: ۳: ۱۰۴ [۷] نور: ۲۴: ۲۷

تک کہ اجازت نہ لے لو۔

ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس قوم و ملک میں ظلم بڑھ جائے اور اس کی روک تھام کے لیے قانون حرکت میں نہ آئے تو وہ قوم اور ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے اس وجہ سے حکومت کی بقاء اسی میں ہے کہ وہ ظلم کے خلاف ہر فرد کو آواز اٹھانے کا حق دے تاکہ جہاں بھی ظلم سر اٹھائے وہیں اس کا سر کچل دیا جائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ یعنی اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دوسری جگہ آتا ہے:۔ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ[1] اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پہ ظلم کیا گیا ہو۔ اس آیتِ کریمہ میں مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت دی ہے۔

مذہبی دل آزاری سے تحفظ: لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ[2] ان بتوں کو برا بھلا نہ کہو جنہیں یہ لوگ اللہ سے علاوہ پکارتے ہیں۔

آزادی سکونت: اسلامی حکومت میں ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے رہے کسی فرد کی سکونت پہ قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔

ارشادِ الٰہی ہے: سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ[3] زمین میں چلو پھرو۔ دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کونوا حیث شئتم وبیننا وبینکم ان لا تسفکوا دماءً لا تقطعوا سبیلا ولا تظلموا احداً[4] تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان صرف شرط ہیں کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم راہ زنی کرو اور نہ کسی پہ ظلم کرو۔

ملکیت کا حق: اسلام نے ذاتی ملکیت کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن محدود اور مفید اخلاقی معاشرتی اور قانونی پابندیوں کے ساتھ۔ ارشادِ الٰہی

---

[1] النساء ۴: ۱۴۸ [2] الانعام ۶: ۱۰۸ [3] العنکبوت ۲۹: ۲۰ [4] نیل الاوطار جلد ۸ صہ ۱۳۹

ہے: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى[۱] کہ انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہی جو کوشش کرتا ہے۔ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ[۲] ہر آدمی اپنے کیے کا پھل پانے والا ہے۔ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ[۳] خدا کے فضل کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ

اگر کمانے والا اسلامی عائد شدہ پابندیوں پر کاربند نہیں رہتا اور مفاد عامہ کو ملحوظ نہیں رکھتا تو حکومت کا فرض یہ ہے کہ اس کو ملکیت سے دست بردار کر دے۔

تعلیم کا انتظام: یہ تاریخی مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں وہی قومیں ابھری ہیں ہیں۔ جو علم کے زیور سے آراستہ تھیں۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ عوام کی تعلیم کے لیے وسیع پیمانے پر انتظام کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ[۴] کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة: یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔

حفظانِ صحت کا انتظام: اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کی صحت کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرے یہ حکم اس حکم سے ماخوذ ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز نبوت میں دیا گیا تھا۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴: ۴) اپنے کپڑے صاف رکھ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴: ۵) یعنی گندگی چھوڑ دے ارشاد نبوی ہے الطهور شطر الایمان۔ پاکیزگی نصف ایمان ہے۔

بنیادی ضروریات کو پورا کرنا: غذا لباس اور مکان انسان کی وہ بنیادی ضروریات ہیں جن پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ بنیادی ضرورتیں ہر فرد کے لیے پورا کرے

اس کے متعلق اسلام کی یہ تعلیم ہے وَفِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱: ۱۹) کہ امراء کی دولت میں سائل اور نادار لوگوں کا حق ہے۔ نبی کریم کو اللہ تعالیٰ کا

---

[۱] النجم ۵۳: ۳۹ [۲] الطور ۵۲: ۲۱ [۳] الجمعہ ۶۲: ۱۰ [۴] زمر ۳۹: ۹ [۵] الذاریات: ۱۹

ارشاد ہے توخذ من اغنیاءھم وتترد الی فقراءھم (مسلم جلد ا کتاب الایمان) یعنی امراء سے دولت لے کر فقراء اور ناداروں کو دی جائے گی اس وجہ سے اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ حاجت مندوں کی کفالت کرے۔ رہائشی مکانات کی فراہمی کے متعلق علامہ ابن حزم فرماتے ہیں تکنھم من المطر والصیف والشمس [1]

یہ مکانات ایسے ہوں جو رہنے والوں کو بارش، گرمی، دھوپ سے چھپائے رکھیں۔

گزرگاہوں اور راستوں کی حفاظت: گزرگاہوں اور راستوں سے جمہور کے حق انتفاع کی حفاظت کرے

چنانچہ ماوردی لکھتے ہیں:-

"وہ کہ محتسب عام گزرگاہوں میں عمارت بنانے سے روک دے اگرچہ راستہ وسیع ہو اگر کوئی عمارت بنا لے تو اس کو پیوندِ خاک کر دے چاہے وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ راستے آمد و رفت میں سہولت اور آسائش کے لیے ہوتے ہیں۔ اس لیے نہیں ہوتے کہ لوگ آسائش اور سہولت کو نظر انداز کر کے اس میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں"۔ [2]

بازاروں اور گلیوں کی صفائی: حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ بازاروں اور گلیوں کی صفائی کا بندوبست کرے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اماطة الاذی عن الطریق صدقة۔ یعنی راستے سے تکلیف دِہ چیز کو دور کرنا صدقہ ہے۔

شریعت اسلام کا نفاذ: اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ حدودِ شرعیہ قائم کرے تاکہ کوئی فرد ان امور کا مرتکب نہ ہوسکے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور ملک چوری، شراب خوری، قمار بازی اور بدکاری وغیرہ کے جرائم سے پاک ہو جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ [3]

وہ جنہیں اگر ہم زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

---

[1] المحلی جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ [2] الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۴۴ [3] الحج ۲۲ : ۴۱

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ[1] تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؕ[2] اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی دعوت دے اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

دیانت دار اور اہل لیاقت عہدے دار : سلطنت کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو عامل مقرر کرے جو دیانت دار اور اہل لیاقت ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ

بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں (حکومت کی باگ ڈور) اس کے اہل کے سپرد کرو۔[3]

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ ... اِنَّ فِىْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ؕ[4] اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ یقیناً اس میں عبادت کرنے والوں کے لیے پیغام ہے۔

عمال کی نگرانی : حکومت کا یہ فرض ہے کہ عمال کی نگرانی کرے اور تمام واقعات اور ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبر رہے۔

سرحدوں کی حفاظت : اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ ملک کی سرحدوں کی کما حقہ، حفاظت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ؕ[5] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کرو۔

دوسری جگہ آیا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ

---

[1] آل عمران ۳ : ۱۱۰ [2] آل عمران ۳ : ۱۰۴ [3] النساء ۴ : ۵۸ [4] الانبیاء ۲۱ : ۱۰۵-۱۰۶ [5] آل عمران ۳ : ۲۰۰۔

وَّ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ[1] اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو۔ تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اوروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ: حکومت کا ایک اہم فرض اصلاحِ معاشرہ ہے اصلاح معاشرہ کے لیے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک اہم پہلو یہ ہے کہ معاشرہ میں بھلائیوں اور نیکیوں کو فروغ دیا جائے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۲۲: ۴۱) وہ جنہیں اگر ہم زمین پر طاقت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاشرہ سے ان تمام برائیوں کا سدباب کیا جائے جس سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے والی برائیاں یہ ہیں۔

۱۔ **قتل:** قرآن مجید نے قتل کو بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا اَلِيْمًا (النساء ۴: ۹۳) یعنی جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے گا۔ اس کی سزا جہنم ہے وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس پر غضب ہوگا اور اس پر لعنت ہوگی اللہ نے اس کے لیے بڑا دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

۲۔ معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے والی دوسری چیز بغاوت، لوٹ مار اور ڈاکہ ہے۔ اسلام نے ان کے لیے بھی سخت سزائیں مقرر کی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدہ ۵: ۳۳) ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں بس یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں آمنے سامنے کے کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔

۳۔ چوری بھی معاشرہ میں فساد کا موجب ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے چوری کی سزا مقرر کی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً

---

[1] الانفال ۸: ۶۰

بِمَا کَسَبَا نَکَالاً مِّنَ اللّٰہِ (المائدہ ۵: ۳۸) اور جو چور مرد اور چور عورت ہو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ اس کی سزا ہے جو انہوں نے کیا ہے اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے۔

۴۔ زنا معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے زنا کی سزا تجویز کی ہے اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (النور ۲۴: ۲) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کے لیے حکم یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور ان پر مہربانی تمہیں اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو۔ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت ہو۔

۵۔ جس طرح زنا معاشرہ میں فساد کا موجب ہے اسی طرح لواطت بھی فساد اور بگاڑ کا ذریعہ ہے قرآن نے اس مرض کی اصلاح کے لیے سزا حکومت پر چھوڑ دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِھَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْھُمَا (النساء ۴: ۱۶) یعنی تم میں سے جو دو مرد بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو سزا دو۔

۶۔ معاشرہ میں شراب خوری بھی بگاڑ کا موجب ہوتی ہے۔ گو قرآن مجید میں شراب خوری کے لیے سزا کا کوئی ذکر نہیں لیکن احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کوئی متعین سزا نہ تھی صرف پٹائی کا حکم صادر فرمایا کرتے تھے کوئی ہاتھ سے مارتا کوئی جوتے سے۔ کوئی کوڑے سے اور کوئی کھجور کی شاخ سے۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں شراب نوشی کی سزا چالیس ۴۰ کوڑے تھی۔ جب شراب نوشی کی زیادہ وارداتیں ہونے لگیں تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا غور و فکر کرنے کے بعد متفقہ طور پر اسی کوڑے طے پائے۔

۷۔ بہتان تراشی بھی معاشرہ میں فساد کا موجب بنتی ہے۔ قرآن مجید بہتان تراشی کے لیے بھی سزا مقرر کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَھَادَۃً اَبَدًا ۚ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (النور ۲۴: ۴) جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر ان پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو تم اسّی کوڑے لگاؤ اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یاد رکھو کہ یہی لوگ بدکار ہیں۔

۸ - قمار بازی بھی معاشرہ کی ابتری کا باعث بنتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کو شیطانی عمل قرار دے کر اس سے پرہیز کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس سے معاشرہ میں باہمی عداوت اور بغض فروغ پاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (المائدہ ۵: ۹۰، ۹۱) اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک کام شیطانی عمل ہیں تم ان سے بچتے رہو، تاکہ فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے سے تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت ڈالے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے، پس کیا تم رکنے والے ہو۔

۹ - ناپ تول میں کمی بھی معاشرہ میں موجب بگاڑ ہے۔ قرآن مجید نے شدید وعید دی ہے ارشادِ الٰہی ہے: وَاَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (بنی اسرائیل آیت ۳۵) یعنی تم ناپو تو ناپ کر پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو یہ بہتر اور انجام کار خیر و خوبی کی بات ہے۔

اس جرم کی سزا وقت حکومتِ وقت پر چھوڑ دی گئی ہے۔ وہ وقت کے تقاضا کے مطابق سزا مقرر کرے۔

۱۰ - معاشی عدمِ توازن بھی معاشرہ میں ابتری پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ معاشی عدم توازن سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ میں اس قسم کا معاشی نظام رائج کیا جائے جس سے ایک طبقہ امیر ہوتا چلا جائے اور ایک طبقہ غریب تر۔ جب کوئی معاشرہ امیر اور غریب دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے تو معاشرہ میں دشمنی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا نظام قائم نہ ہونے دے۔ جس سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹ جائے معاشی ناہمواری کا سب سے بڑا سبب سود ہے۔ اسلام نے اس کو منع کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران ۳: ۱۳۰) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

قیامِ امن: اسلامی حکومت کا اہم ترین فریضہ امن وامان کا قیام ہے۔ جس کے بغیر فلاحی حکومت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید نے بار بار فتنہ وفساد کی مذمت کی ہے ارشادِ الٰہی ہے: لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۔ زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے نہ پھرو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ اور اللہ مفسد لوگوں کے کام کی اصلاح نہیں کرے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ اللہ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا۔ فتنہ وفساد کو بیخ وبن سے ختم کرنے کے بارے میں یہ حکم ہے قَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ (البقرہ ۲: ۱۹۳)

قیامِ عدل: قیامِ عدل اسلامی حکومت کا ایک فرض ہے۔ قرآن نے قیامِ عدل کی بار بار تاکید ہے ارشادِ الٰہی ہے وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (المائدہ ۵: ۸) کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے:

وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (المائدہ ۵: ۴۲) اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

قانون کی حفاظت: حکومت کے فرائض میں سے ایک فرض یہ ہے کہ قوانین کی پابندی کرے۔ مقررکردہ قوانین کے مطابق حکومت چلائے۔ ارشادِ الٰہی ہے: فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ ۵: ۴۸) پس تم لوگوں کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرو اور اس قانونِ حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ ۵: ۴۵) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں۔ پس وہی ظالم ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت: تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب سے ریاست نے جنم لیا ہے اقلیتوں اور ماتحت اقوام کا وجود ذلت ومسکنت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ حاکم قوم کے تحت ذلیل وخوار

ہو کر زندگی گزار دی اگر محکوم قوم کو غلبہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا تو غالب آکر اپنی سابقہ ذلت و رسوائی کا انتقام لیا۔ اس قسم کے انقلابات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

غلامی کا رواج بھی اسی ظلم و عدوان کا نتیجہ ہے محکوم قوم غلام تصور کی جاتی تھی ان کو معاشرتی اقتصادی، سیاسی اور مذہبی آزادی سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اسلام سے قبل تمام متمدن حکومتوں میں اقلیتوں کی ناگفتہ بہ اور المناک حالت تھی۔

مِصر: مصر میں قبطی قوم حکمران تھی وہ اقلیت بنی اسرائیل سے نہایت ہی ذلت آمیز سلوک کرتی تھی ان سے بیگار لیا جاتا۔ انکار کرنے والے کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے ان کی جان و مال، عزت قبطیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی تورات میں ارشاد ہے:۔

"انہوں نے (مصری قبطیوں نے) ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر ان کو ستائیں سو انہوں نے فرعون کے لیے ذخیرہ کے شہر پتوم رعمسیس بنائے پھر انہوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھے اور پھیلتے گئے۔ اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکرمند ہو گئے اور مصریوں نے ہر تشدد کر کے ان سے کام کرایا اور انہوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور ہر کھیت میں ہر قسم کے محنت لے لے کر ان کی زندگی تلخ کی ان کی سب خدمتیں جو وہ ان کی کرتے تھے، تشدد کی تھیں۔"[1]

قرآن مجید میں آتا ہے۔ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَهُمْ یعنی فرعون اور اس کی قوم) ان کے (بنی اسرائیل کے) بیٹوں کو ذبح کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے۔

جب بنی اسرائیل محکومیت اور مظلومیت کے پھندے سے باہر نکلی اور دوسری اقوام کو زیر کرنے کے لیے میدان جنگ میں نکلی تو ماتحتوں کے متعلق ان کو یہ تعلیم دی۔

"جب خداوند (تیرا خدا) اسے تیرے قبضے میں دے تو واں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر...... لیکن ان قوموں کے شہر میں جنہیں خداوند (تیرا خدا) تیری میراث کر دیتا ہے، کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو"[2]

"سو تم ان بچوں کو لڑکے ہیں سب کو قتل کرو اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو"[3]

---

[1] تورات خروج ب [2] استثناء ۱۳: ۱۶ [3] گنتی باب ۳۱: ۹-۱۶-۱۷

خداوند نے ساؤل کو حکم دیا۔

"سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور سب کچھ جو ان کا ہے یک لخت حرم کر (قتل کر) اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت اور ننھے بچے اور شیر خوار بیل اور بھیڑ اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر۔"[1]

یشوع جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جرنیل تھا اس کے بارے میں لکھا ہے:۔

"اور انہوں نے ان سب کو جو اس شہر میں تھے مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھا کیا بیل کیا اور گدھا کیا سب کو تہہ تیغ کیا"[2]

ساؤل جسے خداوند نے سموئیل کی معرفت بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ جب اس کی جنگ عمالیقیوں سے ہوئی تو اس نے سب کو ہلاک کر دیا ان میں سے کسی کو بھاگنے نہ دیا اور نہ جیتا چھوڑا مگر اچھی اچھی بھیڑوں بیلوں اور پالے ہوئے بچوں کو اور بڑوں کو جتیار رکھا۔ خداوند کا غصہ اس پر بھڑکا کہ ہر ایک جان دار کو ہلاک کیوں نہ کیا گیا؟ اور خدا پچھتایا کہ اس نے ساؤل کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔[3]

بابل: بابلیوں کے عہد میں محکوم قوم کی حالت نہایت ذلت آمیز اور دردناک تھی۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر کے عہد میں بنی اسرائیل کو نظر بند کر دیا گیا۔ ان سے ہر قسم کا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا۔ نہ ان کی عزت محفوظ تھی اور نہ ان کو سماجی اور دینی آزادی حاصل تھی۔ ساٹھ فٹ لمبا سونے کا بت بنا کر انہیں پوجنے کے لیے مجبور کیا گیا جو اس سے انکار کرتا اس کو نذر آتش کر دیا جاتا۔

یونان: یونان میں اقلیتوں کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو نے ملکی استحکام اور بقا کے لیے غلام کے وجود کو ناگزیر قرار دیا اور کہا:۔

"غلام ایک ایسا ذی روح آلہ یا متاع ہے جس کے ذریعے زندگی کا نظام چل رہا ہے"

یونانی قوم جن ممالک کو مغلوب کر لیتی۔ وہاں کے باشندے ان کے غلام سمجھے جاتے اور وہ ہر قسم کی آزادی سے محروم کر دیئے جاتے۔ ان سے نہایت ہی ذلت آمیز اور مشقت کا کام لیا جاتا۔ اگر کوئی انکار کرتا تو مار مار اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی۔

رومی سلطنت: رومی سلطنت میں اقلیتوں کا بہت ہی برا حال تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک مفتوحہ قومیں غلام ہوا کرتی تھیں۔ جنگ میں جو

---

[1] سموئیل اول ۱۵: ۳ [2] یشوع ۶: ۲۱ [3] سموئیل اول ۱۵: ۹، ۳۵

لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو روما کے بازاروں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ رومی بادشاہ نے جب عیسائیت قبول کی تو غیر عیسائیوں کو جبراً عیسائیت قبول کرایا جانے لگا۔ اس جبر واستبداد کی بنا پر بہت سوں نے خودکشی کر لی۔ ان تمام کے مذہبی ادارے توڑ دیئے گئے۔

یہودی اقلیت کو بیت المقدس سے باہر نکال دیا اور بیت المقدس کے تین ہزار فٹ کے احاطہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔

فارسی اکثریت نے عیسائی اقلیت کو ظلم واستبداد کا نشانہ بنا رکھا تھا۔

فارس: اس کے مقابل پہ شاہِ روم عیسائی تھا۔ اس وجہ سے ایرانی عیسائیوں کو ہمیشہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور معمولی غلطی پہ انتہائی الم ناک سزا دی جاتی تھی۔

اسلامی حکومت میں اقلیت: اس مختصر سے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب تک کسی نظامِ حکومت نے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا۔ اسلام ہی صرف ایسا نظامِ حیات ہے جس میں غیر مسلم رعایا کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت کے اعتبار سے اقلیتوں کی دو قسمیں ہیں:

ایک معاہد جو مصالحت یا معاہدے کے ذریعے اسلامی حکومت کے ماتحت آتے ہیں ان کو اسلامی اصطلاح میں معاہد یا ذمی کہا جاتا ہے۔ یہ غیر مسلم رعایا جزیہ دیتی ہے اور اسلامی حکومت کی رعایا بننا منظور کرتی ہے۔

دوم: اہل العنوہ یعنی جو لڑائی میں شکست کھا کر مغلوب ہوتے ہیں۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق

معاہدات کی پابندی: اسلام نے معاہدات کو دیانت داری کے ساتھ نبھانے کی تعلیم دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا [1] اے مسلمانو! تم اپنے عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔ دوسری جگہ آیا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي

---

[1] بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴

السِّدِيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ؎۱ اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ تم پر ان کی دوستی کا کوئی حق نہیں یہاں تک وہ ہجرت کریں اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض ہے سوائے اس کے کہ یہ مدد ان لوگوں کے خلاف نہ ہو جن کے اور تمہارے درمیان عہد ہے۔ اللہ جو تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں معاہدہ کی پابندی کا اس قدر تاکیدی حکم ہے کہ اگر کسی اسلامی حکومت کا کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اور پھر اس غیر مسلم معاہدہ کے خلاف کوئی دوسری مسلمان قوم، اسلامی حکومت سے مدد طلب کرے تو وہ معاہد قوم کے خلاف ہرگز مدد نہ کرے اور اپنے عہد پر قائم رہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ فاتح شام کو لکھا۔

د امنع المسلمین من ظلمهم والاضرار لهم واکل اموالهم الا بحلها ووَفِّ لهم بشرطهم الذی شرعت لهم فی جمیع ما اعطیتم ؎۲

مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے ان کو نقصان پہنچانے اور ناجائز طور پر مال کھانے سے روکو ان سے جو شرطیں کی گئی ہے اور ان سے جو وعدے کیے گئے ہیں ان کو پورا کرو۔

ایک مرتبہ آپؓ کو معلوم ہوا کہ اہواز کے ذمی بھاگ رہے ہیں تو تحقیقات کے لیے بصرہ سے دس نیک سیرت مسلمان طلب کر لیے ان میں ایک احنفؓ بن قیس بھی تھے۔ ان سے پوچھا کہ ذمی مسلمانوں کے ظلم و تشدد کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں یا کسی اور وجہ سے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ان پر کسی قسم کا ظلم و تشدد نہیں ہوا۔ وہ از خود بلا کسی وجہ کے بھاگ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کی مرضی کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔

مگر اس بیان سے آپ کو اطمینانِ قلب نصیب نہ ہوا تو عقبہ بن غزوان والیٔ بصرہ کو لکھا کہ:

"لوگوں کو ذمیوں کے ساتھ جور و ظلم سے روکو اور اس سے ڈرو اور محتاط رہو ایسا نہ ہو کہ تمہاری بدعہدی یا ظلم کی وجہ سے حکومت تم سے چھین لی جائے خدا نے تم کو اس وعدہ پر حکومت عطا کی ہے۔ اس لیے اس عہد کو پورا کرو اور اس کے حکم اور مرضی پر عمل کرو اس وقت خدا تمہاری مدد کرے گا۔ ؎۳

؎۱ الانفال ۸: ۷۲ ؎۲ کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۲ مطبوعہ مصر

؎۳ طبری جلد ۴ ص ۲۴۴۵۔

دشمن کے حملے سے حفاظت: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا۔ توان کو یہ لکھ کر دیا کہ اگر دشمن ان پر حملہ کرے گا توان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: یمنعوا[1]

مذہب کی آزادی: ذمی اپنی بستیوں میں مذہبی فرائض بجالانے میں آزاد ہوں گے اور ان کے مذہبی حقوق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ قرآن مجید میں آتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[2] یعنی دین میں جبر نہیں۔

ابوعبید نے تلوار کے ذریعے فتح کیے ہوئے مقامات کی فہرست دینے کے بعد لکھا کہ:۔

"سارے مقامات بزور شمشیر فتح ہوئے اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب وشریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی آزادی دی گئی"۔[3]

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حیرہ کی فتح کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے جو اہل حیرہ سے معاہدہ کیا اس میں لکھا:۔ لا یھدم لھم بیعة ولا کنیسة ولا یمنعون من ضرب النواقیس ولا من اخراج الصلبان فی یوم عیدھم[4] اور گرجے پیوند خاک نہیں کیے جائیں گے اور نہ ان کے عید کے دن ان کو ناقوس بجانے اور صلیبیں نکالنے سے روکا جائے گا۔

شام کے پادری کو یہ ضمانتیں دیں۔

ولا یھدم لھم بیعة ولا کنیسة، وعلیٰ ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعة شاؤا من لیل او نھار الا فی اوقات الصلوٰة وعلیٰ ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدھم[5] ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ ڈھائے جائیں گے۔ وہ نماز کے اوقات کے علاوہ رات دن جب چاہیں ناقوس بجا سکتے ہیں۔ اور عید کے موقع پر صلیبیں نکال سکتے ہیں۔

ابوعبیدہؓ فاتح شام نے اہل شام کو عبادت خانوں کے تحفظ کی پوری ضمانت دی۔ وَ اشترط علیھم حین دخلھا ان تترك کنائسھم و بیعھم[6]

حضرت ابوعبیدہؓ نے اہل شام سے وعدہ کیا کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے برقرار رکھے جا

---

[1] فتوح البلدان ص۵۹ [2] بقرہ ۲: ۲۵۶ [3] کتاب الاموال ابوعبید ص۱۵۰
[4] کتاب الخراج ص۸۴ [5] کتاب الخراج ص۸۶ [6] کتاب الخراج ص۸۰

جان کی حفاظت: اسلام نے اقلیتوں کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر قرار دی ہے اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کرے گا تو قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر مقتول کے ورثاء قصاص لینے کی بجائے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو قاتل کو خون بہا دینا ہوگا۔ بیہقی میں روایت ہے کہ عہد نبوی میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ مقدمہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھ پر ذمی کے عہد کو پورا کرنے کی ذمہ داری ہے اور مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا۔[1]

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔[2]

قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے لکھ بھیجا کہ "قاتل مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے" چنانچہ قاتل حنین نامی ایک شخص کو جو مقتول کے ورثاء میں سے تھا سپرد کر دیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر دیا۔[3]

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔ من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا ودیتہ کدیتنا۔ یعنی جو ذمی ہیں ان کا خون ہمارا خون ہے اور ان کا خون بہا ہمارا خون بہا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان شاس نے شام کے ایک قبطی کو قتل کر دیا مقدمہ حضرتِ عثمانؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا لیکن حضرت زبیرؓ بن عوام اور بعض دوسرے صحابہ کی سفارش پر قصاص معاف کرایا اور مقتول کے ورثاء کو مسلمان کی دیت کے برابر ایک ہزار دینار دیت دلوائی۔[4]

امام شعبیؒ، نخعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں:

"اقلیت کا قاتل اگر مسلمان بھی ہو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا"

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آپ نے مسلمان کو ذمی کے ورثاء کے سپرد کر دیا کہ وہ چاہیں معاف کر دیں چاہیں قصاص میں قتل کر دیں، انہوں نے قتل کر دیا۔[5]

---

[1] سنن بیہقی جلد ۸ ص ۳۰، ۳۱ [2] بخاری احمد [3] زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ دہلی ص ۳۳۸، ۳۳۹۔ [4] سنن بیہقی جلد ۸ ص ۳۳ [5] نصب الرایہ جلد جلد ۴ ص ۳۳۷

مال کی حفاظت: ذمی کی جان کی حفاظت کی طرح اس کے مال کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔ ذمیوں کے قبضہ میں جس قدر زمینیں تھیں انہیں کی تحویل میں رہنے دیں اگر خلیفہ کو مسجد یا اور کسی عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تو معاوضہ دے کر لی جاتی تھی۔

جب عراق فتح ہوا تو صحابہؓ کی رائے تھی کہ ان کی اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ زمیندار وں اور کاشت کاروں کی تحویل میں رہنے دی جائے۔ کئی دن بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار یہ ٹھہرا کہ مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک اجتماع ہوا۔ انصار میں سے دس آدمی اپنے قبیلہ کی طرف سے حاضر ہوئے اور بڑے بڑے مہاجرین صحابہ یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف مخالف رہے لیکن عام رائے یہی رہی کہ ذمیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل نہ کیا جائے۔ حضرت بلالؓ قائل نہیں ہوتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی ایک آیت سے استدلال کیا تو ان کو مجبور ہونا پڑا اور تمام صحابہؓ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے۔[۱]

ولیس لہ ان یاخذ بعد ذالک منھم وھی ملک لھم یتوارثونھا

یعنی امام وقت بھی زمین لینے کا مجاز نہیں ہے وہ کاشت کاروں کی ملک ہے جو ان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے گی اور وہ اس کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت کو زمین کی ضرورت پڑتی تو مالک کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لیے ایک رمنہ بنانا چاہا آپؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کو جو بصرہ کے گورنر تھے لکھا اگر وہ ذمیوں کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دے دی جائے۔[۲]

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے کہ ایک ذمی نے آکر شکایت کی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ تحقیق کے لیے خود وہاں گئے دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لیے جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا آپ بھی ہیں۔ اس نے جواب دیا امیر المؤمنین بھوک شدت سے لگی ہوئی تھی اس وجہ سے یہ حرکت کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ باغ کے مالک کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے۔[۳]

---

[۱] تفصیل کے لیے کتاب الخراج ص ۱۴، ۱۵۔ [۲] فتوح البلدان ص ۲۵۱ [۳] کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۱۵۱

تحفظ عزت: اقلیت کی عزت و ناموس کو وہی تحفظ حاصل ہے جس طرح ایک مسلمان کی عزت و آبرو کو۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حمص کے گورنر حضرت عمیر بن سعد کی زبان سے کسی ذمی کے متعلق اخزاك الله (اللہ تجھے رسوا کرے) یہ کلمہ نکل گیا تھا اس پر حضرت عمیر بن سعد کو سخت ندامت ہوئی اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور فرمایا کہ اس منصب کے غرور میں مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ لہٰذا یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ میں اس منصب پر فائز رہوں (الفاروق)

دُرِ مختار میں لکھا ہے "اس کو (ذمی) تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے۔ اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے"۔[۱]

ارشاد نبویؐ ہے، من ظلم معاهدًا او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئاً بغير طيب نفسه فانا حجيجه يوم القيمة۔

جو شخص کسی پر معاہدے پر ظلم کرے یا اس کو نقصان پہنچائے یا اس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف دے یا اس کی خوشی کے بغیر کچھ لے۔ تو میں اس معاہد کی طرف سے قیامت کے دن حجت کروں گا۔

روزی اور کفاف کا ذمہ: اگر ذمی اپنی روزی کمانے سے عاجز آجائے تو اس کے گزارے کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو حکم بھیجا کہ اپنے علاقہ کے ذمیوں کے حالات معلوم کرو جو بوڑھے ہو چکے ہوں اور روزی کمانے کے قابل نہیں رہے تو ان کے گزران کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو دیکھا کہ در در بھیک مانگتا پھرتا ہے' آپ نے اس سے فرمایا ہم نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب تم جوان تھے اور کماتے تھے تو ہم نے تم سے جزیہ وصول کیا اب جب تم کمانے کے قابل نہیں رہے اب ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔[۲]

اگر ذمی دشمن کے قبضہ میں آجائے اور فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو فدیہ بیت المال سے دیا جائے گا۔[۳]

---

[۱] در المختار جلد ۳ صفحہ ۲۷۳، [۲] کتاب الاموال ابو عبیدہ ص ۴۶
[۳] کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۲۷

خالدؓ بن ولید نے فتح حیرہ کے وقت جو معاہدہ کیا تھا اس میں درج کیا۔ اور میں نے ان کو یہ حق دیا کہ اگر کوئی بوڑھا کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مصیبت آن پڑے، یا پہلے دولت مند تھا پھر مفلس ہو گیا اور اس وجہ سے اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگے تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کا اور اس کے اہل و عیال کا نفقہ مسلمانوں کے بیت المال سے مقرر کر دیا جائے گا۔ جب تک وہ مسلمانوں کے ملک میں رہے اگر وہ اسلامی ملک سے چلا جائے تو مسلمانوں پر اس کے اہل و عیال کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔[1]

اقتصادی آزادی: اسلامی حکومت میں اقلیتوں کو اقتصادی آزادی حاصل ہے، کمانے اور خرچ کرنے میں مکمل آزادی ہے یہاں تک کہ بعض ایسی چیزوں کی تجارت کرنا جو ایک مسلمان کے لیے حرام ہے۔ اقلیتوں کو اجازت ہے جیسے شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ان کے لیے شراب جیسے ہمارے لیے سرکہ ہے ان کے خنزیر جیسے ہمارے لیے بکری۔" (ہدایہ)

یعنی جس طرح ایک مسلمان کے لیے سرکہ اور بکری کی خرید و فروخت اور استعمال حلال ہے، اسی طرح اقلیتوں کے لیے شراب اور خنزیر کی بیع و شراء اور اکل و شرب جائز ہے۔

سیاسی حقوق: اسلامی حکومت میں اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ خلیفہ ملکی امور میں ان سے مشورہ لے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنیامین نامی مصری قبطیوں کا ایک سردار تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں بااثر شخص ہے تو حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھ بھیجا کہ انتظامی امور میں اس سے مشورہ لیں۔

اسی طرح اقلیتوں کے امور میں انہی کی رائے معتبر تصور ہوگی۔ عراق کے انتظام کے وقت وہاں کے قائدین کو مدینہ بلوایا اور ان سے مشورہ لیا۔ ایسا ہی مصر کے اقلیتی لیڈر مقوقس کی رائے لینے کے بعد وہاں انتظامی امور کا فیصلہ فرمایا تھا۔

اقلیتوں کے پرسنل لاء: اسلام نے اقلیتوں کے اپنے مذہبی قانون میں ہر قسم کی آزادی دی ہے اسلامی عدالت

---

[1] کتاب الخراج از امام ابو یوسف

ہیں ان کے قانون کے مطابق ہی فیصلے ہوں گے۔ اہل نجران کے معاہدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پہ فرما دیا تھا کہ:۔

"ان کے خالص مذہبی امور میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی"۔ (کتاب الاموال)

خلفائے راشدین کے دور میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا:۔

کیا وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح، شراب اور اور خنزیر کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا ہے"۔

حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا۔

"انہوں نے جزیہ دینا اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنا ہے۔ اور اپنی طرف سے کوئی نئی بات ایجاد نہیں کرنی ہے"[۱]

علامہ ابوالحسن ماوردی تحریر فرماتے ہیں:۔

"انہیں اپنے حقوق اپنے حکام کے پاس لے جانے میں کسی قسم کی ممانعت نہیں کی جا سکتی"۔ (احکام سلطانیہ)

"تاریخ سپین کا مصنف لکھتا ہے:

"جن عیسائیوں نے مفتوحہ ملک میں رہنا پسند کیا ان کے مال و جان کی پوری حفاظت کی گئی انہیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے طور پہ اپنی عبادت کریں۔ معینہ حدود میں انہی کے قوانین رائج تھے۔ بعض ملکی اور قومی عہدوں پر ان کا تقرر کیا گیا ان کی عورتوں کو اجازت تھی کہ فاتحوں کے ساتھ شادی کریں۔ غرض از روئے قانون ان کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا جس سے مفتوح یا غلام معلوم ہوں"۔[۲]

دفاعی نظام اور اقلیت:

اصولی طور پہ اسلامی حکومت کسی اقلیت کو جبری طور پہ فوج میں بھرتی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اسلامی حکومت ان سے ایک دفاعی ٹیکس لیتی ہے۔ اور اقلیت کے ہر فرد کی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اس دفاعی ٹیکس سے بچے، بوڑھے، عورت اور اپاہج وغیرہ مستثنیٰ تھے۔

---

[۱] کتاب الاموال ابو عبیدہؒ ص ۳۶ [۲] الہارون صفحہ ۲۸

اگر اسلامی حکومت ان کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ دفاعی ٹیکس واپس کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کے عہد گورنری میں رومیوں کے ساتھ شام کی لڑائی میں مسلمان کچھ پسپا ہو گئے تھے تو اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ نے اقلیتوں سے لیا ہوا ٹیکس یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ تمہاری حفاظت کے بدلہ میں یہ ٹیکس لیا گیا تھا۔ اس وقت ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لیے ہمیں اس کے رکھنے کا کوئی حق نہیں۔

ہاں! جو اقلیت اپنی خوشی سے فوج میں بھرتی ہونا چاہیئے اس سے یہ جزیہ وصول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو فوجی وظیفہ بھی ملتا ہے۔ معاہدہ آذربائیجان میں یہ واضح طور پہ لکھا تھا کہ اقلیت کے وہ افراد جو اسلامی فوج میں حصہ لیں گے ان سے اس سال کا جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم باشندے اگر اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہوں۔ تو حکومت کو ان سے خدمت لینے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے عوض ان کو عطیہ یعنی مال غنیمت سے کچھ دیا جائے گا (کتاب الاموال)

سرکاری ملازمت: اسلام اقلیتوں کو بھی ان کی صلاحیت کے مطابق ملازمت کا موقع دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنے عہد خلافت میں قاہرہ سے بحر احمر تک ایک نالی کھدوائی تھی تو اس وقت ایک ذمی کو انجینئر مقرر فرمایا تھا۔

حضرت سید احمد شہید نے اپنے زمانہ میں ایک ہندو کو اسلحہ خانہ کا نگران مقرر کیا تھا۔

قانون کی نظر میں مساوات: اسلامی حکومت میں مسلمان اور غیر مسلم قانون کی نظر میں برابر ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ فاتح قوم نے مغلوب قوم کو قانون میں اپنے برابر قرار دیا ہو یہ امتیاز بھی اسلام کو حاصل ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کو یہ تحریر فرمادیا تھا کہ ان میں اگر کوئی حق کا دعویٰ لے کر حاضر ہو تو اس کے ساتھ غیر جانبدارانہ انصاف کیا جائے گا۔[۱]

عہد علی مرتضیٰؓ میں ایک یہودی نے ان کی زرہ چوری کر لی تھی۔ حضرت علیؓ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے اور ان کے دو گواہ تھے۔ ایک حضرت حسنؓ بن علی اور دوسرے ان کے غلام۔ لیکن قاضی نے باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت اور آقا کے حق میں غلام کی گواہی کو مسترد کر دیا اور یہودی کے حق میں بیٹے فیصلہ صادر فرمادیا۔ یہودی اسلام کے اس عادلانہ انصاف کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

۱؎ کتاب الاموال

جزیہ اور خراج وصول کرنے میں نرمی: اسلام جزیہ اور خراج کی وصولی میں سختی سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا:

"مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انہیں ستانے اور ناجائز طریقے سے ان کے مال کھانے سے منع کرو۔"[1]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جزیہ کی وصولی کے بعد خفیہ طور پر تفتیش کرتے تھے کہ ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر تو جزیہ وصول نہیں کیا گیا۔

شہریوں کے فرائض

سمع و طاعت: اسلامی ریاست کے ہر شہری پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ خلیفہ اور ارباب کار کا حکم مانیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت کے لیے رسول کریم کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے اس طرح رسول کی اطاعت کو اولوالامر کی اطاعت کے لیے لازمی قرار دیا ہے ارشاد الٰہی ہے:

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ[2]

اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں۔

مؤطا میں حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے:

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ

یعنی ہم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمع و طاعت (ماننے اور تعمیل کرنے) کا عہد لیا تنگی، فراخی، دشواری اور آسانی ہر حال میں۔

ایک اور حدیث میں ہے، فرمایا "سنو اور اطاعت کرو" اگر تم پر کوئی حبشی غلام مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح ہو، جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تم کو حکم دے (بخاری)

السمع والطاعۃ حق مالم یومر بالمعصیۃ فاذا امر

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۲ [2] النساء: ۵۹

بالمعصیۃ فلا سمع و لا طاعۃ۔ اولوالامر کے احکام سننا اور ان کی تعمیل کرنا واجب ہے۔ جب تک کہ وہ معصیت کا حکم نہ دے تو پھر اس کا نہ سننا جائز ہے اور نہ اس کی تعمیل کرنا۔

السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احب و اکرہ مالم یومر بمعصیۃ فاذا امر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ۔ (بخاری کتاب الاحکام)
ہر مسلمان پر صاحب امر کی اطاعت ضروری ہے جب کہ وہ برائی کا حکم نہ دے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا۔

قانون کی پابندی: قانون کی تابعداری ہر شہری کا فرض ہے۔ اس کے بغیر ملک میں امن قائم رہ سکتا ہے اور نہ معاشرہ کی عمارت صحیح بنیادوں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا[1]۔ یعنی زمین میں اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد فساد نہ کرو۔

فساد ہمیشہ قانون شکنی سے پیدا ہوتا ہے گویا فساد قانون شکنی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے:
اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (المجادلہ ۵۸ : ۲۰)، جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگ ہیں

تعاون: انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اگر باہمی تعاون کے ساتھ انسان ایک دوسرے کی ضروریات اور احتیاجات کو پورا نہ کریں تو سوسائٹی میں فساد برپا ہو جائیگا اور ایک دوسرے کی زندگی اجیرن ہو جائے گی اس وجہ سے سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کا تعاون ضروری ہے، قرآن مجید میں آتا ہے:
تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى[2] نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[3] اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی سوسائٹی کے افراد کو ایک عمارت سے تشبیہ دے

---

[1] الاعراف ۷ : ۵۸ [2] المائدہ ۵ : ۲ [3] المائدہ ۵ : ۲

کر فرماتے ہیں:

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً ثم شبک بین اصابعہ[1]
ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ عمارت کی اینٹیں ایک جزو دوسرے جز کو قوت دیتی ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی اور پھر فرمایا:-

تکانفوا ولا تعاصیا ویسرا ولا تعسرا[2] مل کر رہو ایک دوسرے کے خلاف نہ رہو۔ آسانی کرو اور تنگی مت کرو۔

مالی قربانی: حکومت کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت مالی لحاظ سے مضبوط ہو اور حکومت خرچ پورا کرنے کے لیے ٹیکس ادا کرے، قرآن مجید میں آتا ہے:

یَسْئَلُوْنَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ[3] وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں کہہ جو ان کی ضرورت سے بچ جائے وہ سب خرچ کر دو۔

امن کا قیام: اچھے شہری کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ خود قانون کی تابعداری کرے۔ بلکہ اس سے یہ بھی امید ہوتی ہے۔ وہ حکومت کی قوانین کے نفاذ میں مدد کرے اور قانون شکنی کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے حکومت کا ہاتھ بٹائے جب تک ہر شہری ملک کے قانون کا محافظ نہیں ہوتا۔ اس وقت تک ملک میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

فوجی خدمات: مملکت کا تحفظ سب سے اہم فریضہ ہے۔ اس وجہ سے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ بیرونی حملہ کے وقت ملک کے دفاع میں ہر ممکن کوشش کرے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔ قرآن میں آتا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ[4]

اور جو کچھ طاقت گھوڑوں کے سرحدوں پہ باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ[5]

---

[1] بخاری کتاب الادب [2] کنوز الحقائق حرف التاء [3] البقرہ ۲ : ۲۱۹ [4] الانفال ۸ : ۶۰ [5] توبہ ۹ : ۳۸ -

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین پر جم جاتے ہو۔
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ [1] اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

تعلیم و صحت: ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے، تعلیم کے ساتھ ان میں سیاسی اور تمدنی شعور پیدا ہوتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ [2] کہہ دیجیے کیا علم اور جہل برابر ہو سکتے ہیں۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة: یعنی ہر مسلم مرد اور عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔

دستورِ اساسی

دستورِ اساسی کے معنیٰ: انگریزی لفظ Constitution. کے لغوی معنی جسمانی ساخت کے آتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں دستورِ اساسی Constitution سے مراد وہ منظور شدہ قواعد و ضوابط ہیں۔ جن کے مطابق حکومت کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔
ارسطو دستور کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔
"وہ کہ دستورِ اساسی اس اصول کو کہتے ہیں جس کے مطابق حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے۔"
گرٹ Guret کہتا ہے:
"مملکت کا دستورِ اساسی ان بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے۔ جو حکومت کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں۔ بنیادی اصولوں میں وہ طریقہ جس کے ذریعے مملکت کی تنظیم ہوتی ہے۔ مختلف اعضائے حکومت Organs of Government

[1] البقرہ ۲: ۱۹۰ [2] الزمر ۳۹: ۹

کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور فرائض حکومت انجام دینے کا طریقہ کار شامل ہے۔"
دوسری جگہ کہتا ہے:
"دستور اساسی ان چند انقلابی اصولوں پر خاص طریقے سے پاس کیے ہوئے رسوم ورواج کے مجموعہ کو کہتے ہیں جن کے مطابق مملکت کی تنظیم ہوتی ہے۔
برائس Bryce. کہتا ہے:
"کسی قوم یا مملکت کا دستور اساسی ان قوانین وضوابط پر مشتمل ہوتا ہے جو حکومت کی نوعیت شہریوں اور حکومت کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں"
پروفیسر وٹ Prof. Wookey کہتا ہے۔
"دستور اساسی ان اصولوں کا مجموعہ ہے جن کے مطابق حکومت کا اختیار رعایا کے حقوق اور دونوں کے مابین جو تعلق ہے ان کی ترتیب و تنظیم کی جاتی ہے"
پروفیسر ڈائسی Prof. Dicy کہتا ہے:
"دستور اساسی ان قاعدوں کو کہتے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے اختیارات اور فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں"
ان مفکرین کی تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دستور اساسی ان قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہے جن کے ذریعے حکومت کی مشنری چلتی ہے اور ملک کے دوسرے ضمنی قوانین اسی کی روشنی میں وضع کیے جاتے ہیں۔

دستور اساسی کی اہمیت: سیاسی نقطۂ نظر سے دستور اساسی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کوئی حکومت دستور اساسی کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس سے ملک میں امن وامان قائم رہتا ہے۔ لوگ آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں وہ شہریوں کے حقوق و فرائض متعین کرتا ہے۔ عمال حکومت کے اختیارات اور فرائض پر روشنی ڈالتا ہے۔

دستور اساسی کے بغیر ملک میں طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے ہر طرف فساد اور لاقانونیت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ہر شہری کی جان و مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر حکومت کے لیے ایک دستور اساسی ہونا ضروری ہے۔ جس کے بغیر وہ چند دن بھی چل نہیں سکتی۔

اسلامی حکومت کا دستور

اسلامی حکومت کا دستور قرآن مجید ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئیس سال تک نازل ہوتا رہا۔ ارشادِ الٰہی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (بقرہ ۲: ۱۸۵) رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اسلامی حکومت کا دستور قرار دیا ہے اور اس کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نظام حیات قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دستور کی خلاف ورزی ہے وہ اپنے تئیں گھاٹے میں ڈالتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدہ ۵: ۴۵) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ دستور کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ (اجارہ) کا انکار کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ ۵: ۴۸) پس تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ (دستور) کے مطابق فیصلہ کر اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اس وجہ سے اسلامی ریاست کا دستور قرار دیا ہے۔ کہ قرآن مجید اولین اور آخرین علوم کا مجموعہ ہے اور اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اجمالاً یا تفصیلاً اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۱۶: ۸۹) یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب (دستور) اتاری ہے جو تمام چیزوں کو واضح کرنے والی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (الانعام ۶: ۵۹) یعنی نظام حیات کے لیے کوئی خشک یا تر بات ایسی نہیں جو اس واضح کتاب و دستور میں نہ ہو۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ ۹۸: ۳) یعنی قرآن مجید میں تمام کتب کے علوم اور اصول جمع ہیں۔

اسلامی دستور کی خصوصیات

اسلامی دستور ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جو ایک بہترین دستور میں ہونی چاہئیں۔

۱۔ اسلامی دستور ایک مکمل جامع اور واضح دستور ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

۲۔ اسلامی دستور ایسے اصول اور نظریات کا حامل ہے کہ سوسائٹی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے وہ اس کی ضروریات کو پورا کرتا رہیگا

۳۔ حالات اور زمانہ کتنا ہی بدل جائے اسلامی دستور کی دفعات ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں۔

۴۔ اسلامی دستور اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

۵۔ اسلامی دستور انسانی فطرت کے مطابق ہے۔

۶۔ عوام کے بنیادی حقوق کا محافظ ہے۔

الٰہی اور انسانی دستور میں فرق

۱۔ انسانی دستاویز اس وقت وجود میں آئے جب لوگ خاندان اور قبیلوں میں بٹ گئے، اور افراد نے ایک دوسرے کے حقوق پامال کرنے شروع کر دیئے۔ حفاظت حقوق کے لیے لوگوں نے چند قواعد وضوابط کی ضرورت محسوس کی۔ خاندان اور قبیلوں کے رسم ورواج نے ان قواعد وضوابط کے لیے مواد فراہم کیا۔ اس طرح انسانی دساتیر کی عمارت تعمیر ہونا شروع ہو گئی۔

اس کے برعکس اسلامی دساتیر کا آغاز اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اس دنیا میں بھیجا اور حضرت آدم علیہ السلام کو وحی کے ذریعے وہ باتیں سکھائیں جو اس دور کے لیے ضروری تھیں۔ پھر وقتاً فوقتاً لوگوں کی ہدایت وراہ نمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اللہ تعالیٰ ہر دور اور زمانے کی ضروریات کے مطابق انبیاء علیہم السلام پر دستور نازل کرتا رہا۔ آخر کار یہ دستور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر دور اور زمانے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نازل کیا وہ ایک کامل ضابطہ حیات ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ[1]

یعنی آج میں نے تمہارا دستورِ حیات مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔ تمہارا دین اسلام کو ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

۲۔ انسانی دستور کے لیے کسی فردِ واحد یا قوم کی منظوری اور عدالت کا اس پر عمل کرنا ضروری ہے اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی دستور کو حاصل نہ ہو تو اس کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی دستور کسی کی منظوری کا محتاج نہیں۔ نہ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ عدالت اس پر عمل پیرا ہو۔ اگر قوم اور عدالت اس کو تسلیم نہیں کرتی تو وہ خود مجرم ٹھہرتی ہے۔

جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ[2] پس تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کر اور اس قانونِ حق کو ترک کر کے جو تمہارے پاس آیا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ[3] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں، وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ[4]۔

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ لوگ کافر ہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ[5] اس قانون کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

۳۔ انسانی دستور روحانیت اور تقدس کا کوئی پہلو اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ جب کہ اسلامی دستور پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے اور اس پر ایمان لائے بغیر دائرۂ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔

---

[1] المائدہ ۵: ۳ [2] المائدہ ۵: ۴۸ [3] المجادلہ ۵۸: ۲۰ [4] المائدہ ۵: ۴۴۔ [5] یونس ۱۰: ۱۰۹۔

۴۔ اسلامی دستور اخلاقی اقدار کی آبیاری کرتا ہے اور لیکن انسانی دستور کو اخلاقی اقدار سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاں انسانی دستور صرف اس وقت حرکت میں آتا ہے جب دوسرے افراد کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو اور نظمِ حکومت میں کوئی خلل پڑتا نظر آ رہا ہو۔ مثلاً قوانینِ مروجہ کی نگاہ میں زنا اس وقت جرم ہے۔ جب عورت پر جبر کیا جائے لیکن اسلامی دستور ہر شکل میں زنا کو ناجائز قرار دیتا ہے اور اس کے مرتکب کو سزا دیتا ہے۔

۵۔ اسلامی قانون کا ماخذ ذاتِ الٰہی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔
اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ لیکن انسانی قانون کا مصدر انسانی دماغ ہے۔ انسانی دماغ جذبات اور ماحول سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے کسی موضوعہ قانون کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذاتی رجحانات اور تعصبات سے بالاتر ہے۔

۶۔ انسانی دساتیر میں نہ تو وحدت ہے اور نہ یکسانی۔ یہ دونوں چیزیں قانون کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی دستور میں وحدت اور یکسانی پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔
شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ [1] اس نے تمہارے لیے دین وہی راستہ مقرر کیا ہے۔ جس کا نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا، اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی۔ اور جس کا ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ دین (قانون) کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

۷۔ انسانی دساتیر محدود اصول اور قواعد کی شکل میں وجود میں آتے ہیں۔ جوں جوں قوم کی ضروریات بڑھتی ہیں اور نئے نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔ قانونِ موضوعہ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے اصول اور قواعد بنتے رہتے ہیں۔ گویا قانونِ موضوعہ کی ترقی رفتارِ زمانہ کے ساتھ ہے۔ اس کے برعکس اسلامی دستور کلیات اور قواعد کی صورت میں قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں جو کسی زمانہ میں بھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:
لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ [2] اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتی۔

---

[1] الشوریٰ ۴۲: ۱۳ [2] یونس: ۱۰: ۶۴

لیکن ہر زمانہ کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قواعد کلیہ کی روشنی میں ضمنی قواعد بنائے جائیں گے۔ جن کو آج کل کی زبان میں بائی لاز کہنا چاہیئے۔

۸۔ اسلامی قانون فطرت انسانی کے مطابق خلق کیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا : یعنی اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس موضوعہ قانون انسان کی طبیعت جذبات رجحانات اور تعصبات کا مرہونِ منت ہے۔ اس وجہ سے اسلامی قانون ہر قسم کے معائب سے پاک ہے اور موضوعہ قانون انسانی جذبات کی وجہ سے نقائص سے خالی نہیں۔

۹۔ انسانی دساتیر ناقص ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں حاوی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے جوں جوں انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں۔ انسانی دساتیر میں ترامیم ہوتی رہتی ہیں لیکن اسلامی دستور میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اجمالی یا تفصیلی رنگ میں اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ ۹۸ : ۳)
اس طرح اسلامی دستور میں تمام علوم اور اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔
دوسری جگہ آتا ہے: نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل ۱۶ : ۸۹)
یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب (دستور) اتاری ہے جو تمام چیزوں کو واضح کرنے والی ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام ۶ : ۵۹)
یعنی تمام نظامِ حیات کے لیے کوئی خشک یا تر بات ایسی نہیں جو اس واضح کتاب (دستور) میں نہ ہو۔

قانون سازی کے مصادر

زمانہ کے تقاضا کے مطابق قانون سازی کے اختیارات مملکت کے افراد کے سپرد ہوتے ہیں فقہاء[1] اسلام نے قانون سازی کے حسبِ ذیل مصادر اور منابع مقرر کیے ہیں۔

قرآن مجید اسلامی قانون کا اولین مآخذ ہے: تمام امتِ مسلمہ اس امر پہ متفق ہے کہ اسلامی قانون کا پہلا مصدر قرآن مجید ہے۔ کوئی قانون قرآنی اصول اور نظریات کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا۔

---

[1] یوسف : ۱۲ : ۴۰۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ [۱] حکم (قانون) اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں اسی کا حکم ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت واطاعت نہ کرو۔ یہی صحیح طریقہ ہے: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ [۲] اسی قانون کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَہُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِہِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا [۳]

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے پھر خود اپنے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

فَاحْکُمْ بَیْنَہُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَہْوَآءَہُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ [۴]۔ پس ان کے درمیان اسکے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ [۵]

اگر کسی چیز میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ۔

ھٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوْہُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ [۶]

یہ بابرکت کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے۔ پس اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَہُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید ۵۷ آیت ۲۵) ہم نے اپنے رسولوں کو کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ ۵ آیت ۴۵) اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ فیصلے نہ کریں پس وہی ظالم ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗٓ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (المجادلہ ۵۸: آیت ۲۰) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ قوانین کے

---

[۱] یوسف ۱۲: ۴۰ [۲] اعراف ۷: ۳ [۳] الاحزاب ۳۳: ۳۶ [۴] المائدہ ۵: ۴۸ [۵] النساء ۴: ۵۹ [۶] انعام ۶: ۱۵۵

خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں

۲۔ سنت و حدیث: اسلامی قانون کا دوسرا مصدر سنت اور حدیث ہے
سنت کے معنی لغت میں طریقہ، قاعدہ یا کسی کام کا ڈھب یا زندگی کا اسلوب ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں یہ لفظ انہی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ پہلے لوگوں کا طریقہ سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ [1] اللہ کا طریقہ ہے ان لوگوں کے بارے میں جو گذر چکے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ یعنی تم پر یہ لازم ہے کہ میرے طریقۂ زندگی کو اختیار کرو اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کو اپناؤ۔

عرب کے لوگ لفظ سنت کو ظہور اسلام سے قبل بھی اسی معنی میں استعمال کرتے تھے۔

اصطلاحی معنیٰ: سنت سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر کا رنگ رکھتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الٰہی پر خود عمل کیا۔ پھر صحابہ نے دیکھ کر وہ کام کیا۔ اس کے بعد نسلاً بعد نسل تواتر کے ساتھ عمل ہم تک پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے اس حکم کو اپنے فعل سے بیان کیا کہ فجر کی نماز کیسے ادا کرنی چاہیئے۔ ظہر کی نماز کیسے پڑھنی چاہیئے۔ عصر کی نماز کیسے پڑھنی چاہیئے۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں کس طرح پڑھنی چاہییں۔ پس وہ عملی نمونہ اب تک اس امت میں جاری ہے۔ اسی کا نام سنت ہے۔

حدیث: حدیث کا لفظ تحدیث سے اسم ہے۔ تحدیث کے معنی خبر دینا ہے۔ ظہور اسلام سے پہلے بھی عرب حدیث کے لفظ کو اخبار کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً وہ اپنے مشہور ایام کو احادیث کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ عربی محاورہ ہے صار حدثنا یعنی فلاں چیز ضرب المثل بن گئی۔

قرآن مجید نے بھی اسی مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:
فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖ [2] تو اس جیسی کوئی بات لائیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ [3] اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے یعنی کتاب جس کی باتیں ملتی جلتی دہرائی گئی ہیں۔

---

[1] الاحزاب ۳۳: ۶۲ [2] الطور ۵۲: ۳۴ [3] زمر ۳۹: ۲۳

بعض علماء کے نزدیک حدیث میں جدت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

اصطلاحی معنی: حدیث سے مراد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال ہیں جو راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔

حدیث و سنت کا فرق: پس حدیث اور سنت کے الفاظ مترادف و مساوی نہیں۔ لفظ سنت اپنے اصل لغوی معنی کے اعتبار سے اس دینی عمل پر بولا جاتا ہے جس پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم گامزن رہے۔ بعض علماء کے نزدیک لفظ حدیث عام ہے اور اس میں آپؐ کے اقوال اور اعمال سب داخل ہیں بخلاف سنت کے یہ لفظ صرف آپؐ کے اعمال پر بولا جاتا ہے۔

اس فرق کے پیش نظر محدثین یوں کہہ دیتے ہیں۔ ھذ الحدیث مخالف للقیاس والسنۃ والاجماع۔ یعنی یہ حدیث قیاس سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔

یا یوں کہتے ہیں۔ امام فی الحدیث وامام فی السنۃ وامام فیھما معًا یعنی فلاں شخص حدیث کا امام ہے۔ فلاں سنت کا امام ہے اور فلاں دونوں کا۔

قرآنِ مجید میں بے شمار ایسی آیات پائی جاتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حدیث اسلامی قانون کا ماخذ ہے۔

قرآن مجید میں دو قسم کی آیات ہیں۔ محکمات اور متشابہات۔

محکمات آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی تشریح کی ضرورت ہے۔ حدیث انہی متشابہات کی تفسیر ہے۔

نماز کی ہیئت اور اس کی رکعات اور اس کے اوقات وغیرہ اور اسی طرح زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ جاننے کے لیے حدیث ضروری ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ[1] اور ہم نے تیری طرف قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اس کی تعلیم کی تشریح کر دے جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الکتاب و مثلہ یعنی مجھے کتاب اور اس کی مثل بھی دی گئی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور مثل سے مراد حدیث ہے۔

علامہ شاطبی فرماتے ہیں: فکان السنۃ بمنزلۃ التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب[2] پس حدیث قرآنِ مجید کے احکام کی تفسیر اور شرح ہے۔

---

[1] النحل ۱۶، ۴۴ [2] الموافقات ص۱۰

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "اللہ کے اقوال حدیث نبوی کی تشریح و توضیح ہیں اور جملہ احادیث قرآن کی شرح ہیں"۔ (قواعد التحدیث ص ۳۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی عمرانؓ بن حصین نے ایک شخص کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم احمق آدمی ہو۔ کیا قرآن میں یہ لکھا ہے کہ نماز ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور ان میں قرأت جہراً نہیں ہے۔ پھر نماز اور زکوٰۃ کے بعض احکام و مسائل ذکر کیے اور اس آدمی سے پوچھا کہ آیا قرآن میں یہ مسائل تفصیلاً مذکور ہیں؟ قرآن نے ان احکام کو مجملاً بیان کیا ہے۔ حدیث نے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ (الموافقات جلد ۴)

قرآن مجید میں اطاعتِ رسولؐ کی تاکید:

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[1] یعنی رسولؐ جو کچھ تمہیں دے اس کو لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ[2] جس نے رسولؐ کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس آیت کریمہ میں رسولؐ کی اطاعت کو اللہ کی کے مترادف قرار دیا ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[3] یعنی تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں عمدہ نمونہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ[4] کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دے تو انہیں کوئی اختیار باقی رہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حدیث اسلامی قانون کا مستقل ماخذ ہے۔

بخاری کی روایت ہے: انی ترکت فیکم امرین ان تمسکتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ و سنتی۔ یعنی میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔

اس حدیث کو ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۸۰ پر عبداللہ بن عمرو بن عوف سے

---

[1] الحشر ۵۹: ۷ [2] النساء ۴: ۸۰ [3] الاحزاب ۳۳: ۲۱ [4] الاحزاب ۳۳: ۳۶

روایت کیا ہے۔ بیہقی نے یہی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ فرمان نقل کیا ہے

صحابہ کا طرزِ عمل : رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام حدیث اور سنت کو اسلامی قانون کا مستقل ماخذ سمجھتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کا طرز عمل قانون کے بارے میں منقول ہے۔

کان ابوبکر اذا ورد علیہ حکم نظر فی کتاب اللّٰہ تعالیٰ فان وجد فیہ مایقضی بہ قضی بہ وان لم یجد فی کتاب اللہ نظر فی سنۃ رسول اللہ فان وجد فیہا مایقضی بہ قضی بہ فان اعیاہ ذلک ۔ سأل الناس ھل علمتم ان رسول اللہ قضی فیہ قضأ فربما قام الیہ القوم فیقولون قضی فیہ بکذا او کذا ۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی قانونی معاملہ آتا تو پہلے وہ قرآنِ کریم میں اس کا حل تلاش کرتے ۔ اگر وہاں مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ صادر فرمادیتے ۔ اگر وہاں سے حل نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے کہ اس بارہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ کیا ہے بسا اوقات کچھ لوگ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

سیاتی قوم یجادلونکم بشبہات القرآن فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ[2]

آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآنی شبہات میں تم سے جھگڑا کریں گے ۔ ایسی صورتوں میں سنتوں کے ذریعے ان پر حجت قائم کرنا کیونکہ اصحاب سنن اللہ کی کتاب کو زیادہ جانتے ہیں۔

آئمہ کا طرزِ عمل : فقہاء نے ہمیشہ سنت کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں : لو لا السنن ما فہم احد منا القرآن[3] ۔ اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی قرآن حکیم کا فہم نہ حاصل کر سکتا ۔۔۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :۔

اجمع المسلمون علی ان من استبان لہ سنۃ عن رسول اللہ لم یحل لہ ان یدعہا بقول احد[4] مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۴۱ [2] مقدمہ المیزان بحوالہ اسلامی قانون نمبر جلد ۱ ص ۳۰۵

[3] مقدمہ المیزان بحوالہ اسلامی قانون نمبر ص ۳۰۱ ۔ [4] اعلام الموقعین جلد ۲ ۔ ۳

کسی پر رسول اللہ کی سنت واضح ہو جائے تو پھر اس کے لیے کسی کے قول کی وجہ سے اس کو ترک کر دینا جائز نہیں ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ کل ما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ و کل مالم یوافقہ والسنۃ فاترکوہ[۱] ہر وہ چیز جو کتاب اور سنت کے مطابق ہو۔ اُسے قبول کرلو اور جو مخالف ہو اسے ترک کر دو۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: من رد حدیث رسول اللہ فھو علی شفا ھلکۃ[۲] جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو رد کر دیا وہ ہلاکت کے کنارے پر کھڑا ہے۔

اسلامی قانون سازی کے لیے حدیث سے متعلق چند باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

تدوین فقہ کے لیے حدیث اور سنت کے حسب ذیل معلومات ضروری ہیں۔

۱۔ ناسخ و منسوخ

۲۔ مجمل و مفسر

۳۔ خاص و عام

۴۔ محکم و متشابہ

۵۔ احکام کے درجے مثلاً وجوب۔ مندوب۔ مباح وغیرہ۔

۶۔ عہد نبویؐ کے سیاسی۔ معاشی اور معاشرتی حالات پر گہری نظر ہونا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

ان کنت ترید النظر فی معانی شریعۃ رسول اللہ فتحقق اولا حال الامیین الذین بعث فیھم التی ھی مادۃ تشریعۃ وثانیا کیفیۃ اصلاحہ لھا بالمقاصد المذکورۃ فی باب التشریع و التیسیر واحکام الملۃ[۳] اگر تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے رموز کو سمجھنا چاہتے ہو تو پہلے عرب امیوں کے حالات سے متعلق مکمل آگاہی حاصل کرو۔ جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ وہی آپ کی شریعت کا تشریحی مادہ ہیں۔ اس کے بعد آپؐ کی اصلاح کی کیفیت جانو۔ جو آپ نے ان مقاصد کے تحت کی ہے جن کا تذکرہ، تشریح اور تفسیر احکام ملت کے باب میں ہو چکا ہے۔

---

[۱] جامع اہل العلم از اسلامی قانون نمبر [۲] کتاب المناقب لابن جوزی

[۳] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صفحہ ۱۲۳۔

۳۔ اجتہاد: اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ اجتہاد ہے۔ یہ لفظ جہد سے مشتق ہے جس کے معنی ایک شخص کا انتہائی درجہ تک کوشش کرنا ہے۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اس سعی بلیغ کو کہتے ہیں۔ جو ایک متقن کتاب اللہ اور سنت رسول کی روشنی میں نئے نئے پیش آمدہ مسائل کا حل معلوم کرنے کے لیے کرتا ہے۔

وجوب اجتہاد کے دلائل از روئے قرآن مجید: قرآن مجید نے مذہبی اور دنیاوی امور میں عقل سے کام لینے پر بہت زور دیا ہے اور اس کے برعکس جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان کو چوپاؤں سے تشبیہ دی ہے۔

قرآن مجید میں عقل و فکر کے استعمال کرنے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ[1] یہ کتاب جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے۔ برکت والی ہے۔ تاکہ وہ اس کی آیات پر غور کریں، اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا[2] کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[3] جو لوگ ہمارے معاملہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کشادہ کر دیتے ہیں۔

از روئے حدیث: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اذا حکم الحاکم فاجتہد ثم اصاب له اجران اذا حکم اجتہد ثم اخطأ فله اجر[4] جب کوئی حاکم فیصلہ دینے میں صحیح اجتہاد کرے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

رسول کریم صلعم نے حضرت معاذ بن جبل رض کو بحیثیت معلم اور قاضی یمن کی طرف روانہ کیا اور دریافت فرمایا:

کیف تقضی اذا عرض قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان

---

[1] سورۂ ص ۳۸ : ۲۹

[2] محمد ۴۷ : ۲۴ [3] عنکبوت ۲۹ : ۶۹ [4] صحیحین۔

لم تجد فی سنۃ رسول اللہ ولا فی کتاب اللہ قال اجتہد رای ولا آلو ا [1]

اگر تمہارے سامنے کوئی قضیہ پیش آ جائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق۔ آپؐ نے فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں موجود نہ ہو۔ انہوں نے کہا اللہ کے رسولؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپؐ نے پوچھا اگر سنتِ رسول میں بھی نہ ملے اور نہ کتاب اللہ میں۔ انہوں نے کہا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔

عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا آپؐ کے پاس دو شخص آئے۔ آپؐ نے فرمایا: تم ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ کے سامنے میں یہ کیسے جرأت کر سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تم فیصلہ کرو میں نے عرض کیا کیسے کروں۔ آپؐ نے فرمایا: اجتہد یعنی اجتہاد کرو۔ اگر تمہاری رائے صائب ہوئی تو دس نیکیاں ملیں گی اور اگر غلطی کی تو ایک نیکی۔ [2]

از روئے عمل صحابہ کرامؓ: علامہ سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے پیش آتا تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں سے مسئلہ کا حل نہ ملتا تو سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرتے اگر وہاں سے نہ ملتا تو صحابہؓ کو جمع کرتے۔ اگر کسی کو سنتِ رسولؐ کا علم ہوتا تو وہ بتا دیتا۔ آپؓ خدا کا شکر بجا لاتے اگر صحابہ میں سے کسی کو بھی سنت علم نہ ہوتا تو بہترین اشخاص کا انتخاب کرتے اور ان سے رائے لیتے اور کثرتِ رائے پر فیصلہ صادر فرماتے [3]

مجتہد کے ضروری اوصاف:

۱۔ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مزاجِ شریعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ مزاج قرآنِ مجید اور حدیث پر وسیع اور گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ مجتہد عاقل بالغ ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ قرآن مجید اور حدیث کے منشا کو سمجھ سکے۔

۳۔ نئے ابھرتے ہوئے مسائل اور حوادث کا جو جدید احکام وضع کرنے کے متقضی ہوتے ہیں، جاننا ضروری ہے۔

---

[1] ابوداؤد۔ ترمذی [2] کنز الاعمال جلد ۳ صہ ۱۷۳ نمبر ۲۶۱۸۔ [3] تاریخ الخلفاء، صہ ۴۳۔

۴۔ عربی زبان کا ماہر ہو۔
۵۔ اجماعی مسائل سے واقف ہو۔
۶۔ صحابہؓ اور تابعین کے اقوال سے جو احکام کے سلسلہ میں ان سے منقول ہیں، آگاہ ہو۔
۷۔ فقہاء سلف کے اقوال کا علم رکھتا ہو۔
۸۔ ذہین اور تیز فہم ہو تا کہ قیاس کے ذریعے احکام کے اسباب و علل معلوم کر سکے۔
۹۔ متقی ہو تا کہ لوگ فتوی پر عمل کرنے کے لیے اس پر اعتماد کر سکیں۔

اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ کسی اجتہاد کو قانون کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل امور کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔
۲۔ اجتہاد کو مقبولیت عامہ حاصل ہو اور لوگ اس کے پیروکار ہوں۔ مثلاً، فقہ حنفی شافعی۔ مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں مانتی ہیں۔
۳۔ کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے دے۔ مثلاً عثمانی سلطنت نے فقہ حنفی کو اپنا ملکی قانون قرار دیا تھا۔
۴۔ اسلامی حکومت میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو۔

اجتہادی رائے کی شرعی حیثیت: اجتہاد ایک رائے ہے جو کتاب اور سنت کی روشنی میں قائم کی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت نص کی نہیں۔ اس میں غلطی کا بھی امکان ہے اجتہادی رائے سے اختلاف کی وجہ سے کسی کو کافر یا فاسق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ اجماع: چونکہ اجماع وسیع اساس پر ایک اجتہاد ہے۔ اس وجہ سے اجماع سے متعلق اجتہاد کے تحت بحث کی جاتی ہے۔

اجماع جمع سے مشتق ہے۔ جس کے معنی اکٹھا کرنا یا اکٹھا ہونا ہے۔ لیکن اصطلاح میں امت کے اہل حل و عقد کا کسی معاملہ میں اتفاق اور اتحاد کر لینے کا نام اجماع ہے اصول کی کتابوں میں یہ تعریف مذکور ہے۔

وھو اتفاق اھل الحل والعقد من امتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی امر من الامور[1] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اہل حل و عقد کے کسی

---

[1] منہاج الاصول برحاشیہ التقریر والتحبیر جلد ۲ ص ۱۴۱

معاملہ میں اتفاق کا نام اجماع ہے۔

اجماع کے واجب ہونے کے دلائل قرآن مجید کی رُو سے۔

قرآن مجید میں آتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ[۱] اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے اولو الامر (حاکم) ہیں۔

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا[۲] جو شخص اللہ کے رسولؐ کی مخالفت کرے گا۔ جب کہ ہدایت ظاہر ہو گئی ہو اور مومنوں کی راہ ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کا رُخ ادھر پھیر دیں گے۔ جدھر وہ چلے اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

پہلی آیت میں حاکم کی اطاعت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنوں کے راستے کے علاوہ دوسرا راستہ گمراہی اور ضلالت ہے جو تباہی کا موجب ہے۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجماع دلیل شرعی ہے۔

دوسری دلیل از رُوئے حدیث: مشہور حدیث ہے۔ امتی لا تجمع علی الخطاء او علی الضلالۃ: یعنی میری امت غلط بات یا گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

دوسری حدیث ترمذی کی ہے: ید اللہ مع الجماعۃ یعنی جماعت کے ساتھ اللہ کی تائید اور نصرت ہے۔

تیسری دلیل از رُوئے عمل صحابہؓ: تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ خلفائے راشدین کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے اکابر صحابہ کو بلاتے اور ان سے مشورہ لیتے پھر طے شدہ فیصلہ پر عمل کرتے۔ یہ طے شدہ فیصلہ اجماعی تصور کیا جاتا ہے۔

ابن مسعود کا قول ہے:۔ ما رآہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسنٌ

---

[۱] النساء ۴: ۵۹ [۲] نساء ۴: ۱۱۵۔

یعنی جس چیز کو مسلمانوں اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

اِجماع کی وسعت: اجماع کے دائرہ اور وسعت کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ حضرت امام مالکؒ صرف مدینہ کی رائے کو ہی معتبر سمجھتے ہیں۔ حضرت امام احمد اور داؤد ظاہری صحابہؓ کے اجماع کو معتبر خیال کرتے ہیں[۱] جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ اجماع کے لیے حد بندی درست نہیں ہے۔ بلکہ کسی زمانہ میں تمام مجتہدین کا کسی فیصلہ پر اتفاق کر لینا ہی اجماع ہے۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا اجماع مجتہدین کی اکثریت سے وقوع میں آتا ہے یا کل مجتہد کے اتفاق سے؟ فقہا کی اکثریت تو یہی کہتی ہے کہ ایک زمانہ کے تمام مجتہدین کا ایک رائے پر اتفاق کر لینا ہی اجماع ہے۔ مگر بعض جید فقہا یہ کہتے ہیں کہ اکثریت کی رائے سے بھی اجماع واقع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں:۔ انه ينعقد مع مخالفة الاقل یعنی اجماع اقلیت کے باوجود بھی واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اجماع کا فیصلہ کسی حد تک زمانہ کے تقاضا کے مطابق ہوتا ہے۔ حالات اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں تو اجماع کے فیصلے میں تبدیلی لازمی آئے گی۔ لہذا کسی زمانہ کے علماء کے اجماع سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ایک اجماع دوسرے اجماع کی تنسیخ بھی کر سکتا ہے۔

اجماع کی قسمیں: اجماع کی دو قسمیں ہیں:
۱۔ قولی ۲۔ سکوتی

قولی یعنی کسی معاملہ سے متعلق ایک زمانے کے فقہاء مجتہدین کا متفق ہو کر ایک ہی حکم بیان کر دینا قولی اجماع کہلاتا ہے۔ اجماع کی یہ شکل سارے علماء کے نزدیک مسلمہ حجت ہے۔

سکوتی۔ یعنی کسی معاملہ سے متعلق ایک زمانے کے کسی ایک مجتہد نے ایک حکم کا فتوی صادر کیا ہو اور اس فتوی کا علم اس زمانے کے دوسرے فقہاء کو ہو گیا ہو۔ مگر کسی نے نہ تو اس کی مخالفت کی ہو اور نہ تائید کی ہو۔ اس حجت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

انعقاد اجماع کے شرائط: جس مسئلہ کے متعلق اس عہد کے تمام فقہا متفق الرائے ہوں، یہی اجماع قطعی ہے اور کامل یقین کا فائدہ دیتا ہے۔ لیکن علماء کی ایک قلیل جماعت اختلاف کرنے والے ہوں اور ان میں فقہاء کے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں تو ایسا اختلاف اجماع کی قطعیت کا مانع نہ ہوگا۔

بعض فقہاء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ فقہاء کی جماعت کثیر کا فیصلہ قطعی اجماع ہے۔ خواہ اختلاف کرنے والی قلیل جماعت کے فقہاء میں اجتہاد کرنے کے تمام اوصاف موجود ہوں[۱]

---

[۱] اعلام الموقعین جلد ا صـ ۲۴

ابن جریر ابو بکر الرازی، ابو الحسن خیاط کبی کے استاد وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔ حنفی، شافعی اور مالکیوں کے نزدیک اگر اختلاف کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تو اکثریت کا فیصلہ جائز اور واجب العمل ہوگا۔ اس فیصلہ سے اختلاف کرنے والا شخص کافر نہیں کہلا سکتا۔

اجماع کے افراد کے معیاری اوصاف :

جن فقہاء سے اجماع منعقد ہوتا ہے ان کو حسب ذیل اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔

۱۔ قرآن مجید کے اسرار و رموز کا بخوبی علم رکھتا ہو۔
۲۔ سنتِ رسولؐ کو روایت کے اصولوں سے جانچنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔
۳۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی سے واقفیت اور ان کے اجماع کا علم رکھتے ہوں۔
۴۔ قیاس کے ذریعے استنباط کے اصول معلوم ہوں۔
۵۔ قوم کے مزاج اور جدید رجحانات اور تقاضوں کا علم ہو۔
۶۔ عملی حیثیت سے بلند کردار اور اخلاقِ حمیدہ سے متصف ہوں اور اوامر پر عمل کرنے والے اور منہیات سے بچنے والے ہوں۔

اجماع کے اختیارات کی وُسعت :

۱ جدید تقاضوں کی مناسبت سے نئے قوانین بنانا
۲۔ پرانے اجماعی فیصلوں میں جدید تقاضوں کے مطابق ترمیم کرنا۔
۳۔ وہ احکام جو تدریجاً نازل ہوئے۔ ان کو معاشرتی حالات کے لحاظ سے مقدم اور مؤخر کرنا۔
۴۔ وہ احکام جو وقتی تقاضوں کے تحت ہیں ان کو موجودہ تقاضوں کے مطابق ڈھالنا۔
۵۔ جن احکام میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو معقول دلیل کی بناء پر ترجیح دینا۔
۶۔ فقہاء کی مختلف رائوں اور فیصلوں میں جدید تقاضوں کے مطابق مناسب ترجیحی صورت پیدا کرنا۔

اجماع کے فیصلوں کی شرعی حیثیت :

اجماع کے فیصلے واجب العمل ہیں۔ ان کی مخالفت جائز نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اصول میں ہے:

فان استبط المجتہدون فی عصر حکما واتفقوا علیہ یجب علی اھل ذلک العصر قبولہ فاتفاقہم صار بینۃ علی ذلک الحکم فلا یجوز بعد ذلک مخالفتہم[1]

جب مجتہدین کسی زمانہ میں کسی حکم کا استنباط اور اس پر اتفاق کرلیں تو اس زمانہ والوں پہ اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ اس کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ یہ اتفاق اس حکم پر ایک واضح دلیل ہے۔

اجماعی فیصلوں پہ اس زمانہ کے تقاضوں کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس پہ عمل کرنا اسی زمانہ والوں پہ واجب ہے۔ بعد کے لوگ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے زمانہ کے اجماعی فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ حالات کے بدلنے سے اجماعی فیصلوں میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

۵- قیاس: قیاس کا لغوی معنی ناپنا یا کسی چیز سے مقابلہ کرکے موازنہ کرنا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں "علت" کو مدار بنا کر سابقہ فیصلہ اور نظیر کی روشنی میں نئے مسائل حل کرنے کو قیاس کہتے ہیں"

تقدیر الفرع بالاصل فی الحکم والعلۃ[2] یعنی حکم اور علت میں فرع کو اصل کے مطابق کرنا۔

یہ تعریف اور بھی واضح ہے۔

الحاق امر بامر فی الحکم الشرعی لاتحاد بینہما فی العلۃ، یعنی دو مسئلوں میں اتحاد علت کی وجہ سے ایک کا حکم دوسرے پہ لگا دینے کا نام ہے۔

وضاحت: قیاس کی تعریف کی وضاحت یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام کا دارومدار مخصوص اغراض اور مصالح پہ ہے۔ وہی اغراض اور مصالح ان احکام کی علت ہیں۔ جب ایک حکم کی علت دوسرے حکم میں پائی جائے تو پہلے کا حکم دوسرے پہ لگا دیا جاتا ہے مثلاً قرآن مجید میں شراب حرام ہے۔ حرمت کی وجہ نشہ ہے۔ اب جو بھی نشہ آور اشیاء ہوں گی۔ ان سب پہ شراب کا حکم صادر کرکے حرام قرار دیا جائے گا۔

جواز قیاس کے دلائل از روئے قرآن مجید: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ

---

[1] توضیح بر حاشیہ تلویح ص ۵۰ [2] نور الانوار ص ۲۱۴

وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ؎۱ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں ماسوائے علم والوں کے اور کوئی نہیں سمجھتا۔

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَار ؎۲ سوائے بصیرت والو عبرت حاصل کرو۔

ان آیات میں مسلمانوں کو دنیا کی حالت دیکھ کر استنباط کا ایما ہے۔

از روئے حدیث:

انا اقضی بینکم بالرای فیما لم ینزل فیہ وحی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جن امور سے متعلق وحی نازل نہیں ہوتی ان کا فیصلہ میں اپنی رائے سے کرتا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن مسعودؓ سے فرمایا:-

اقض بالکتاب والسنۃ اذا وجدت فیھما فاذا لم تجد الحکم فیھما اجتھد۔ یعنی جب تم قرآن اور سنت میں کوئی حکم پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور جب قرآن اور سنت میں حکم نہ پاؤ تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔

حضرت معاذ بن جبل والی حدیث مشہور ہے کہ جب ان کو یمن کا قاضی مقرر کیا گیا تو ان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ تو حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا۔ قرآن کی رو سے۔ پھر آنحضرتؐ نے دریافت کیا اگر قرآن میں وہ حکم نہ پاؤ تو؟ انہوں نے جواب دیا اس وقت سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا اگر سنت میں حکم نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذؓ نے جواب دیا۔ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس جواب کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی پسند فرمایا اور اجازت دی۔

از روئے اقوال صحابہؓ:

تمام صحابہ قیاس کرنے کے بارے میں متفق ہیں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو لکھا

اعرف الامثال والاشباہ وقس الامور عندک یعنی امثال اور نظائر کو پہچانو اور سمجھو۔ پھر مسائل کو ان پر قیاس کرنا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے جد کے بارے میں ایک موقع پر فرمایا۔

اقضی فیہ برای ؎۳ یعنی اپنی رائے سے اس کے بارے میں فیصلہ کرتا ہوں

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا۔

؎۱ عنکبوت ۲۹ : ۴۳ ؎۲ الحشر ۵۹ : ۲ ؎۳ منہاج الاصول

"میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں. اگر صحیح ہے تو اللہ کی جانب سے، اور غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے. اللہ اور اس کا رسولؐ اس سے بری ہیں"۔ ؎

قیاس کے ارکان

۱۔ اصل مقیس علیہ (جس پر قیاس کیا جائے)

۲۔ فرع مقیس (جس چیز کو قیاس کیا جائے)

۳۔ حکم جو قیاس کے بعد لگایا جاتا ہے

۴۔ علت وہ مشترک وصف جو مقیس علیہ اور مقیس یا اصل اور فرع میں ہوتا ہے. مثلاً شراب اصل ہے بھنگ فرع. نشہ وصف مشترک اور حرام ہونا حکم ہے)۔

شرائط قیاس: ۱۔ مقیس علیہ نص (جس نص سے قیاس کیا جاتا ہے) کا حکم خاص حالات اور واقعات پر مبنی نہیں ہونا چاہیئے۔

حدیث میں آتا ہے من شھد لہ خزیمہ فھو حسبہ یعنی خزیمہؓ جس کے حق میں گواہی دے دیں، وہ اس کے لیے کافی ہے. اس سے یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا ہے کہ دعویٰ کے لیے ایک شخص کی شہادت کافی ہے. یہ حکم خاص خزیمہؓ کے لیے ہے۔

۲۔ علت ایسا وصف ہو۔ جو شرعاً قابل اعتبار ہو اور بالکل صریح واضح اور معین ہو۔

۳۔ اصل و فرع یا مقیس علیہ اور مقیس میں ایک ہی وصف موجود ہو۔

۴۔ جو حکم قیاس سے استنباط کیا جائے. اس کی وجہ سے نص کے حکم میں تبدیلی نہ واقع ہونی چاہیئے۔

۵۔ جو حکم قیاس سے استخراج کیا جائے اس کی نوعیت نص کے احکام کے ماحصل کی ہونی چاہیئے کسی نص کے محض الفاظ پر قیاس کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

قیاس کا دائرہ وسعت: قیاس کا دائرہ اثر اجماع سے کہیں زیادہ وسیع ہے. کیونکہ ایک زمانہ کے تمام فقہاء کا ایک مسئلہ پر متفق ہونا بہت مشکل ہے بخلاف قیاس کے. کیونکہ اس میں تمام فقہاء کا اتفاق شرط نہیں بلکہ ہر مجتہد کتاب اور سنت کی روشنی میں ہر مسئلہ میں قیاس کر سکتا ہے۔

کتاب اور سنت میں ہر قسم کی جزئیات اور تفاصیل موجود نہیں. ہر زمانہ میں نئے نئے مسائل ابھرتے چلے آ رہے ہیں. نئے ابھرنے والے مسائل کا حل ضروری ہے. اس

؎ اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۴۔

لیے نئے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے قیاس ضروری ہے۔ اس لیے اسلام نے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قیاس کا دروازہ کھول دیا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنی فرماتے ہیں:۔

"عہد نبویؐ سے لے کر ہمارے اس دور تک تمام فقہاء نے زندگی کے ان سارے معاملات میں قیاس سے کام لیا ہے۔ جن کے لیے دینی احکام کے اثبات و اظہار کی ضرورت پڑی اور اس مدت کے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ حق کی نظیر حق ہوتا ہے اور باطل کی نظیر باطل لہٰذا کسی شخص کے لیے یہ زیبا اور جائز نہیں کہ وہ قیاس کا انکار کرے۔ کیوں کہ قیاس کا مآل و مفاد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ان امور میں کتاب و سنت کے تشابہ اور اس کے مثل ہے۔ جس سے کتاب و سنت خاموش ہیں اور جب نظیر حق حق ہوتا ہے تو قیاس جو حق کا نظیر ہے۔ وہ بھی حق ہی ہوگا۔[۱]

۶۔ معروف: فقہاء نے معروف کی یہ تعریف کی ہے۔ عادۃ جمہور قوم فی قول او عمل یعنی قول یا عمل میں جمہور کی عادت کا نام ہے۔ معروف کا دوسرا نام تعامل اور عادت بھی ہے۔

قرآن مجید کے رواج کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ[۲]

یعنی بچہ کے باپ پر دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری دستور کے مطابق ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ[۳] اور جو غریب ہو تو دستور کے مطابق اپنا خرچ لے لے۔

حدیث میں آتا ہے: نہی عن الرسوم الفاسدۃ و امر بالصالحۃ[۴]

رسول کریمؐ نے بری رسموں سے منع فرمایا ہے اور اچھی رسموں کے قبول کرنے کا حکم فرمایا۔

ایک موقع پر عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ما راہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن و ما راہ المسلمون قبیحاً فھو عند اللہ قبیح۔ یعنی جس

---

[۱] اسلامی قانون نمبر چراغ راہ ص ۲۲۸ جلد اول [۲] بقرہ ۲: ۲۳۳ [۳] النساء ۴: ۶ [۴] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۴۔

کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جس کو وہ برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔

معروف کی دو قسمیں ہیں:۔ ۱۔ معروفِ خاص ۲۔ معروفِ عام

معروف خاص: جو کسی خاص علاقہ یا خاص طبقہ میں رائج ہو۔

معروف عام: جو عام لوگوں میں رائج ہو اور کسی خاص طبقہ اور علاقہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

۷۔ اِستحسان: لغت میں استحسان کے معنی ہیں کسی چیز کو اچھا سمجھنا۔ لیکن فقہ کی اصطلاح میں تعریف یہ ہے۔ قطع المسئلۃ عن نظائرھا بما ھو اقوی[۱]

یعنی کسی مسئلہ کے حکم کو قوی وجہ سے اس کے نظائر سے الگ کر لینا۔

اِستحسان کی اہمیت اور ضرورت: ہر دور کے تقاضے الگ ہوتے ہیں اور نئے نئے مسائل اٹھ کر سامنے ہیں۔ بسا اوقات تمام تقاضوں اور نئے مسائل کا حل قاعدہ اور قانون میں ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قیاس اپنی وسعت کے اثر کے باوجود نئے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے ان حالات میں فقہاء نے مسلمانوں کی مصلحت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر یا ملکی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ایک اصول مقرر کر دیا کہ ضرر رساں پہلو ترک کر کے مفید پہلو اختیار کر لیا جائے، تاکہ الٰہی حکمت کے ساتھ ہم آہنگی ہو اور بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا راستہ ہموار ہو سکے۔

حسب ذیل تصریحات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

الاستحسان ترک القیاس و الاخذ بما ھو اوفق للناس[۲]

استحسان قیاس کو ترک کر کے اس امر کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا زیادہ ضامن ہو۔

الاستحسان طلب السھولۃ فی الاحکام فیما یبتلی فیہ الخاص و العام[۳] استحسان ان امور میں سہولت طلب کرنا ہے۔ جن میں خاص و عام سب مبتلا ہیں۔

الاخذ بالسعۃ و ابتغاء الدعۃ[۴] استحسان وسعت کو اختیار کرنے اور فراخی کو طلب کرنے کا نام ہے۔

ان سب تصریحات کا ماحصل یہ ہے کہ فلاح و بہبود کی بنا پر مشکل اور ضرر رساں پہلو

---

[۱] کتاب التحقیق [۲] المبسوط ص ۱۴۵ [۳] المبسوط ص ۱۴۵ [۴] المبسوط۔

کو چھوڑ کر آسان اور راحت والا پہلو اختیار کیا جائے۔ یہ طریقہ الٰہی حکمت کے عین مطابق ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ [1] اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا [2] اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: خیر دینکم الیسر: تمہارا اچھا دین یُسر ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت ارشاد فرمایا: یسرا ولا تعسرا قربا ولا تنفرا لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا، مشکل میں نہ ڈالنا۔ ان کو قریب لانا اور متنفر نہ بنانا۔

اقسام: استحسان کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ استحسانِ سنت ۲۔ استحسان اجماع

۳۔ استحسان ضرورت ۴۔ استحسان قیاسی

"استحسانِ ضرورت" اس وقت واقع ہوگا جب کسی حکم پر عمل کرنے سے دشواری پیدا ہوتی ہو اور ضرر رساں اور غیر منصفانہ پہلو زیادہ عیاں ہوں۔ بنی نوعِ انسان کی فلاح وبہبود مجروح ہوتی ہو۔ ایسی حالت میں حکمت الٰہی کے مطابق اس حکم کو چھوڑنا ضروری ہے آسانی اور سہولت اور فلاح وبہبود کی خاطر دوسری راہ اختیار کرنا ضروری ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ حکم عبادات سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ بلکہ امورِ دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔

۲۔ مصلحت عامہ شریعت کی منشاء کے مطابق ہو۔

استحسان قیاسی: استحسان قیاسی کبھی ظاہری اور متبادر قیاس کی رُو سے کسی مسئلہ کا ایک حکم ہوتا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے دشواری پیش آتی ہے۔ یا ضرر رساں ثابت ہوتا ہے ایسی صورت میں ظاہر قیاس کے خلاف زیادہ قوی اور صحت مند قیاس کی بناء پر کسی دوسرے حکم کو ظاہر کرنے کا نام استحسان قیاسی ہے۔

استحسان سنت: کسی مسئلہ کا قیاسی حکم چھوڑ کر اس کے خلاف اس حکم پر عمل کیا جائے جو سنت میں ثابت ہے۔

---

[1] بقرہ ۲: ۱۸۵ [2] بقرہ ۲: ۲۸۶۔

استحسانِ اجماع: کسی مسئلہ کا قیاسی حکم ترک کر کے اس کے خلاف اس کا دہ حکم اختیار کر لیا جائے۔ جس پر اجماع منعقد ہوا ہو۔

استحسان کی یہ دو قسمیں درست نہیں اس لیے جو حکم سنت میں موجود ہو اور جس پر اجماع ہو اس کو استحسان نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ استحسان ظاہری قیاس کو چھوڑ کر اس حکم کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو اور لوگوں کی ضرورتوں کے زیادہ موافق ہو۔ فقہاء اس وقت یہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جب سنت اور اجماع خاموش ہوں۔

۸۔ استصلاح یا مصالح مرسلہ: فقہاء کی اصطلاح میں صرف ضرورت اور مصلحت عامہ کو اساس بنا کر مسائل استنباط کرنے کا نام استصلاح یا مصالح مرسلہ ہے۔

تعریف یہ ہے:۔ بناء الاحکام الفقهیة علی مقتضی المصالح المرسلة
یعنی مصالح مرسلہ کی اقتضاء پر احکام و مسائل کی اساس قائم کرنا۔

مرسلہ مصالح کی شرائط: فقہاء نے مصالح مرسلہ سے کام لینے کی حسب ذیل شرائط مقرر کی ہیں۔

۱۔ مسئلہ عبادات سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ امور دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔
۲۔ مصلحت عامہ شریعت کی منشاء کے مطابق ہو۔
۳۔ یہ مصالح ان مصالح کے مشابہ ہوں جن کو شریعت میں اولیت حاصل ہو وہ پانچ ہیں۔ (۱) حفظ دین (۲) حفظ نفس (۳) حفظ عقل (۴) حفظِ نسل (۵) حفظ مال۔
۴۔ ان مصالح کے حصول کا یقین کامل ہو۔
۵۔ قومی اور مکمل فائدہ اور مصلحت سے ان کا تعلق ہو

مصالح مرسلہ سے امام مالکؒ نے زیادہ کام لیا ہے۔

مصالح مرسلہ کے دلائل: ۱۔ شریعتِ اسلامی کی بنیاد ہی بنی نوعِ انسان کی فلاح پر ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے قانون سازی میں مصلحتِ عامہ کو خاص ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ [1]

---

[1] الحج ۲۲ : ۷۸۔

اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا [1] اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ [2] اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

۲۔ صحابہ کرامؓ بھی مصالح کا اعتبار کرتے تھے۔ مثلاً کتابتِ قرآن۔ خلافت کے لیے طریقۂ انتخاب جمعہ کی نماز میں دو اذانیں۔ اسلامی حکومت کی محکمہ جاتی تقسیم وغیرہ، ایسے امور تھے کہ صحابہ کرامؓ نے محض مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر انہیں انجام دیا تھا۔

۹۔ استدلال: استدلال مصدر ہے استدلّ سے جس کے معنی ہیں کہ اس نے دلیل تلاش کی اور حاصل کر لی۔ لیکن فقہی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ استدلال ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو نہ نص ہو۔ نہ اجماع اور نہ قیاس۔

ھو دلیل لیس بنص ولا اجماع ولا قیاس

استدلال کی اہم اقسام: ۱۔ ایک حکم کا دوسرے حکم کے ساتھ بغیر کسی خاص علت کے متعلق ہونا۔ التلازم بین الحکمین من غیر تعین علۃ

۲۔ استصحاب الحال: استصحاب کے لغوی معنی باقی رکھنے کے ہیں۔ اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اس امر کو تسلیم کر لینا کہ جو حالت پہلے تھی۔ وہ اس وقت تک قائم ہے جب تک اس کے خلاف ثابت نہ کیا جائے مثلاً امام شافعیؒ کے نزدیک مفقود الخبر اس وقت تک زندہ متصور ہو گا۔ جب تک اس کی موت ثابت نہ کی جائے۔ اس وقت تک نہ اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم ہو گی نہ اس کو ایسے مورث کی جائیداد سے محروم رکھا جائے گا۔ جو اس کی غیر حاضری میں فوت ہوا۔

۳۔ استدلال بالقیاس المنطقی: یہ ایسا قول ہے جو چند جملوں سے مرکب ہو جنہیں مان لینے کے بعد اس کے نتیجہ کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہو جائے۔ جیسے بیع ایک معاملہ ہے اور ہر معاملے کا جزء

---

[1] البقرہ ۲: ۲۸۶۔ [2] بقرہ ۲: ۱۸۵۔

اعظم رضامندگی ہے۔ دونوں جملوں کی صداقت کو مان لینے کے بعد اس نتیجہ کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ بیع کا جزوِ اعظم رضامندگی ہے۔

قسم اول کی چار قسمیں ہیں: ۱۔ جب تعلق دو مثبتہ قضیوں میں ہو۔ مثلاً کہ جو شخص جائز طلاق دینے کا مجاز ہے وہ بطور جائز ظہار بھی کر سکتا ہے۔

۲۔ جب تعلق دو منطقی قضیوں میں ہو۔ مثلاً اگر وضو بغیر نیت کے جائز ہے تو تیمم بھی بغیر نیت کے جائز ہے چونکہ تیمم بغیر نیت کے جائز نہیں۔ اس لیے وضو بھی بغیر نیت کے جائز ہو سکتا — یہ حنفیوں کا رد ہے۔

۳۔ جب تعلق ایک مثبت اور ایک منفی قضیہ میں ہو۔ مثلاً جو امر جائز ہے وہ ممنوع یا حرام نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جب تعلق ایک منفی اور ایک مثبت قضیہ میں ہو۔ مثلاً کہ جو جائز نہیں وہ ممنوع ہے۔

استدلال کا وسعتِ اثر: استدلال استنباط شرعی کے لحاظ سے ان تمام استدلال پر حاوی ہے جو قیاس کی حد میں داخل نہیں ہوتے۔ قاضی عضد کا مقولہ ہے کہ حنفیوں کا مسئلہ استحسان اور مالکیوں کا مسئلہ مصالح مرسلہ دونوں استدلال کے تحت آجاتے ہیں۔

۱۰۔ اسلام سے ماقبل شرائع: فقہ اسلامی کا ماخذ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ؕ (الانعام ۶: ۹۰) یہ وہ لوگ جنہیں اللہ نے ہدایت کی ہے ان کی ہدایت کی پیروی کر۔

دوسری جگہ آتا ہے: ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ ہم نے آپ کو وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیمؑ کی پیروی کیجیے۔

مسند احمد بن حنبل میں ایک روایت ہے: یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلیة؛ یعنی اسلام میں جاہلیت کی اچھی باتوں پہ عمل کیا جاتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل تھا کہ "اگر کسی بات کے متعلق براہِ راست وحی نہ آتی تو آپ اہل کتاب کے طور طریقوں پہ عمل کرنا پسند فرماتے تھے"۔

اس وجہ سے محدثین نے فرمایا: وإن شرع من قبلنا يلزمنا ما لم ينقض الله بالانكار۔ یعنی پہلی شریعتوں پہ عمل کرنا ضروری ہے جب تک وحی

الٰہی کی طرف سے اس پہ انکار نہ کیا جائے

اسلام سے ماقبل شرائع سے استفادہ زمانہ کے تقاضوں پہ مبنی ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ماقبل کی شریعتوں سے استفادہ ہوا ہے۔

۱۱۔ **تعامل:** تعامل سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا عمل ہے۔ فقہاء نے مسائل کے استنباط کے وقت اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔

اصحاب وہ لوگ ہیں جنہوں نے براہِ راست رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کی ہے ان سے بڑھ کر مزاج شناس نبوت کون ہو سکتا ہے۔ ان کی رائے اور عمل کو اہمیت کیوں نہیں دی جا سکتی اس وجہ سے فقہاء نے رسول کریم صلی اللہ علیہ کے اصحاب کے قول و عمل کو فقہ اسلامی کا ماخذ قرار دیا ہے قرآن اور حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ[1] مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی اتباع کی۔ ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس آیتِ کریمہ میں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا جملہ تعامل صحابہ کرام کو ماخذ قرار دینے پر روشنی ڈالتا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: فعلیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا و عضوا علیھا بالنواجذ[2] تم لوگ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو مضبوطی کے ساتھ اس پر جمے رہو اور مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑے رکھو۔

ایک اور روایت ہے: ما انا علیہ و اصحابی[3] جس راستے پر میں اور میرے اصحاب ہیں وہی حق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ جو دل کی نیکی علم کی گہرائی اور تکلیف کی کمی میں اس امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی صحبت اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لیے چن لیا ہے

---

[1] التوبۃ ۹: ۱۰۰ [2] ابو داؤد [3] ترمذی

تم لوگ ان کے فضل کو پہچانو۔ ان کے نقش قدم پر چلو اور ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو جہاں تک ہو سکے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ یہی لوگ ہدایت مستقیم پر ہیں"۔ [1]

فقہاء کا مسلک: صحابہ کرام کے تعامل کے بارے میں فقہاء کا مسلک اصول فقہ میں مذکور ہے: یجب اجماعا فیما شاع فسکتوا المسلمین ولا یجب اجماعا فیما ثبت الخلاف بینھم [2]
جو بات تمام صحابہ میں مشہور ہو اور جس کو انہوں نے تسلیم کر لیا ہو اس کا اتباع واجب ہے۔ اور جس میں کچھ اختلاف ہو اس میں اتباع واجب نہیں۔

ملکی قانون: فقہ اسلامی کا ماخذ ملکی قانون بھی ہے۔ تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ رسول کریم صلعم نے ان قوانین کو معمولی اصلاح کے بعد قبول فرمایا جو عرب میں رائج تھے۔ مثلاً

۱۔ مدعی سے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے جاتے تھے۔ اگر گواہ نہ ہوتے اور مدعا علیہ انکار کرتا تو مدعا علیہ کو قسم دی جاتی تھی۔

اسلامی فقہ کا بھی یہ مسلمہ اصول ہے۔ البینة علی المدعی و الیمین علیٰ من انکر۔ گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور قسم انکار کرنے والے کے ذمے ہے۔

۲۔ تملیک جائیداد کی مختلف صورتیں تھیں۔ بیع۔ ہبہ۔ رہن۔ اجارہ وغیرہ ان کو قائم رکھا

۳۔ بیع کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ بیع سلم۔ مرابحہ۔ تولیہ وغیرہ۔
ان میں سے فساد کی تمام صورتوں کو باطل کر دیا اور صحیح صورتوں کو رواج دیا۔

۴۔ وصیت کا دستور

۵۔ زمین کو بٹائی پر دینے کا رواج تھا۔

حضرت عمرؓ نے بہت سے قوانین مفتوحہ ممالک کے باقی رکھے۔ مثلاً عراق۔ شام مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بہت حد تک رومی۔ یونانی اور ایرانی قانون لگان و مال گزاری کو باقی رکھا۔ ظلم و زیادتی کی صورتوں کی اصلاح و ترمیم کر دی۔

---

[1] مشکوٰۃ ص ۲۹ [2] توضیح و تلویح جلد ۲ ص ۱۷

اسلامی قانون کی خصوصیات

۱۔ مساوات: اسلامی قانون کی مابہ الامتیاز خصوصیت مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً [1] اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ [2] اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ اللہ جاننے والا اخبردار ہے۔

وَاِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً [3] اور تم سب ایک ہی جماعت ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ان العباد کلھم اخوۃ [4] انسان سب آپس میں بھائی بھائی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: یاایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی [5] اے لوگو! سنو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عربی کو عجمی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اگر قوانین موضوعہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے

---

[1] النساء ۴: ۱ [2] الحجرات ۴۹: ۱۳ [3] المومنون ۲۳: ۵۲ [4] احمد ابو داؤد۔

[5] مسند احمد

کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر، انیسویں صدی کے اوائل سے پہلے نظریہ مساوات کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اب قدرے موضوعہ قوانین میں مساوات کی جھلک نظر آتی ہے وہ بھی اسلام کی خوشہ چینی ہے۔

۲- حریت: اسلامی قانون کی دوسری خصوصیت حریت کو برقرار رکھنا ہے۔ ہم اس خصوصیت کے چند شعبوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں۔

حریت فکر: اسلامی قانون حریت فکر کا علمبردار ہے اور عقل کو ہر قسم کے اوہام اور اندھی تقلید کی لعنت سے نجات دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار عقل سے کام لینے کی دعوت دی ہے اور جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان کو چوپاؤں سے تشبیہ دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ [1] آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں۔ اس کے ساتھ جو لوگوں کو نفع دے اور پانی میں جو اللہ بادل سے اتارتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس کے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے۔ ان لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ [2] اور عقل والوں کے سوائے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا۔

قرآن مجید کے نزدیک عقل سے کام نہ لینے والوں اور اندھا دھند تقلید کرنے والوں کو چوپاؤں سے بدتر قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا

---

[1] البقرہ ۲: ۱۶۴ [2] آل عمران ۳: ۷

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ [1] اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں اور ان لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو۔ جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: دین المرء عقلہ ومن لا دین لہ لا عقل لہ [2] انسان کا دین اس کی عقل ہے اور جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔ یتفاضل الناس بالعقل فی الدنیا والاخرۃ [3]

حسب عقل لوگ ایک دوسرے سے دنیا اور آخرت میں فضیلت حاصل کریں گے۔

من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین۔ جب اللہ کسی کو بھلائی دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

ب۔ **حریت عقیدہ**: اسلام وہ پہلا دین ہے۔ جس نے مکمل طور پر عقیدہ کی آزادی کی ضمانت دی ہے۔ اسلامی قانون کے لحاظ سے ہر ایک انسان آزاد ہے کہ وہ جو چاہے عقیدہ اختیار کرے اور کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ اسے عقیدہ کو ترک کرنے پر مجبور کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [4] دین میں کوئی زبردستی نہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [5]

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔

ج۔ **حریت قول**: اسلام نے معروف قول کے اظہار کی کامل آزادی دی ہے لیکن وہ قول جو سوسائٹی پر برا اثر ڈالتا ہے اس سے روکا

---

[1] البقرہ ۲: ۱۷۰-۱۷۱ ۔ [2] کنوز الحقائق حرف دال [3] کنوز الحقائق حرف الیا
[4] البقرہ ۲: ۲۵۶ [5] یونس ۱۰: ۹۹

ہے تاکہ سماج میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔

ارشادِ الٰہی ہے:۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ[1] وہ جنہیں اگر ہم زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم دیں گے۔ اور بُری باتوں سے روکیں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر یعنی افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔

سید الشهداء حمزه بن عبد المطلب و رجل قام الی امام جائر فامره و نهاه فقتله: یعنی شہیدوں کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص جس نے ظالم امام کے سامنے کھڑے ہو کر اسے امر و نہی کی اور اس امام کے ہاتھوں وہ قتل ہوا۔

جہاں اسلامی قانون حریت قول کا علم بردار ہے۔ وہاں معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے حریتِ قول پر کچھ قیود اور پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ[2] اللہ بری باتوں کے مشہور کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو۔

د۔ معاشی آزادی: اسلام سے قبل مزدور سرمایہ داروں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے وہ جال سود در سود کا تھا۔ اسلامی قانون نے سود کو حرام قرار دے کر مزدوروں کو سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً[3]

اے ایمان والو بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ۔

اس طرح ان تمام لوٹ کھسوٹ کے ذرائع آمدن کو بھی ممنوع قرار دے دیا تاکہ انسان حرص وطمع کا شکار ہو کر ناجائز ذرائع سے دولت نہ کمانی شروع کر دے۔

ر۔ معاشرتی حریت: اسلام سے قبل مرد کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت ایک غلام کی تھی۔ ترکہ کا وارث ہونا تو بجائے خود ایک ترکہ سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے عورت کو اس معاشرتی غلامی سے نجات دلانے کے

---

[1] الحج ۲۲: ۴۱ [2] النساء ۴: ۱۴۸ [3] آل عمران ۳: ۱۳۰

لیے ایسے قوانین مقرر کیے جن کی وجہ سے عورت کی حیثیت بہت بلند ہوگئی اور زندگی کے ہر پہلو میں مرد کے برابر اس کو حقوق مل گئے۔ عورت کی عمومی حیثیت سے اس کے لیے یہ قانون مقرر کیا لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۴/۳۲) مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ (النساء ۴: ۷)

مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں۔ اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو ان کے والدین اور قریبی چھوڑیں۔

بیوی ہونے کی حیثیت سے یہ قانون مقرر کیا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ [۱] اور عورتوں کے لیے پسندیدہ طور پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں۔

بیٹی کی حیثیت سے یہ قانون مقرر کیا۔ لَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ [۲]

اور وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں۔

س۔ سیاسی آزادی:

دنیا میں ہزارہا سال سے بادشاہ کی مطلق العنانی کا تصور چلا آرہا تھا اس کا ہر حکم قانون تصور کیا جاتا تھا اور وہ خود کسی قانون کے تحت نہیں ہوتا تھا۔ اسلام نے اس قانون کو باطل قرار دے کر بنی نوع کو سیاسی آزادی کا جان افزا پیغام سنایا۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ [۳]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے صاحبِ امر ہیں پھر اگر تم میں کسی چیز میں باہم اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ یعنی قانون کی طرف۔ یہاں اللہ اور رسول قائم مقام قانون کے ہیں کیوں کہ اسلامی قانون کا ماخذ اللہ اور رسول ہی ہیں۔

نظام حکومت چلانے کے لیے اصولِ شوریٰ مقرر کر دیا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ [۴] کہ انسانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ نظامِ حکومت باہمی

---

[۱] البقرہ ۲: ۲۲۸ [۲] ممتحنہ ۶۰: ۱۲ [۳] النساء ۴: ۵۹ [۴] الشوریٰ ۴۲: ۳۸

مشورت سے چلائیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ [1] تو نظامِ سلطنت کے چلانے میں ان سے مشورہ کر۔
رسولِ کریم صلعم فرماتے ہیں: ماشاور قوم الا هدوا [2] جس قوم نے نظامِ حکومت چلانے میں باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال قبل اسلام نے حریت کو قانون کا اصول مقرر کیا قوانینِ موضوعہ میں اٹھارہویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں اس اصول کو جگہ دی گئی اس سے قبل ان قوانین میں حریت کی کوئی دفعہ نہیں ملتی۔

۳۔ عدل و انصاف: عدل و انصاف قانون کی روح ہے۔ اسلام نے اس روح کو اپنے قانون میں برقرار رکھا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:
وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ [3] اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی۔ (البقرہ ۲: ۱۷۸)
آزاد کا بدلہ آزاد سے غلام کا بدلہ غلام سے اور عورت کا بدلہ عورت سے لیا جائے۔
رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اقیموا حدود اللہ فی القریب و البعید و لا یاخذکم فی اللہ لومة لائم۔ (مشکوٰة باب الحدود)
اللہ کی حدیں بلا تمیز دور و نزدیک پر جاری کرو اور کسی ملامت کرنے والے کی پروا نہ کرو۔ حضرت ابوبکرؓ نے مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد سب سے پہلا خطبہ دیا وہ قانونی عدل و انصاف پر تھا۔

"تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی ہوگا۔ جب تک کہ میں اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک کمزور ہوگا۔ جب تک میں اس سے دوسرے کا حق نہ لے لوں۔"

۴۔ سادہ اور سہل: اسلامی قانون سادہ اور سہل ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جس وجہ سے انسان کی فطرت اسلامی قانون سے متنفر نہیں ہوتی۔

اسلامی قانون عقل کے معیار پر اترتا ہے۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو بار بار غور و فکر کرنے

---

[1] آلِ عمران ۳: ۱۵۹ [2] کنوز الحقائق حدیث ۸۷ [3] نساء ۴: ۵۸

کی دعوت دی ہے اور جو لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ ان کو چوپاؤں سے تشبیہ دی ہے شیعہ مجتہدین نے عقل کو فقہ کا ماخذ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں کتاب اللہ، سنت اور اجماع سے کوئی مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو وہاں پہ عقل سے کام لے کر اس مسئلہ کو حل کر لینا چاہیئے۔

۵۔ **لچک دار**: اسلامی قانون میں لچک ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

۶۔ **امن کا ضامن**: اسلامی قانون امن کا ضامن ہے۔

۷۔ **اللہ کی حاکمیت**: اسلامی قانون میں اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ ہے۔ اور خلیفہ صرف اسلامی قانون کا محافظ اور نافذ کرنے والی قوت ہے۔

۸۔ **وسعت**: اسلامی قانون میں وسعت ہے اسلام اجتہاد کو وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اعضائے حکومت

مجلس وضع قوانین

(بائی لاز)

حکومت کے تین اہم شعبے ہیں:

ا۔ مجلس وضع قوانین (مقننہ)

ب۔ عاملہ،

ج۔ عدلیہ

ان میں مقننہ یا مجلس قانون ساز Legislature سب سے اہم ہے۔ ہر حکومت کو قوانین اور قواعد وضوابط بنانے پڑتے ہیں تاکہ وہ شہریوں اور عمال کے لیے راہیں متعین کر دیں جن پہ ان کو چل کر قوم اور ملک کی فلاح کا کام کرنا ہے اس کے بغیر کسی حکومت کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔

طلوع اسلام کے وقت قوانین کا سرچشمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔

آپ کے وفات کے بعد خلفائے راشدین کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی قومی یا انفرادی مسئلہ پیش آتا تو صاحب الرائے صحابہؓ کو بلاتے، ان کے سامنے مسئلہ پیش کرتے تو وہ خلیفہ کے فرائض قانون سازی میں اس کے قانونی مشیر ہوتے اور ضمنی قوانین (بائی لاز) وضع کرتے۔

شرائطِ رکنیت: (۱) مسلمان ہونا
(۲) بالغ ہونا
۳۔ کتاب و سنت سے گہری واقفیت ہونا
۴۔ اجتہاد کا ملکہ ہونا
۵۔ ملکی اور بین الاقوامی مسائل پہ گہری نظر رکھنا
۶۔ اعلیٰ کردار کا مالک ہونا۔

ارکان مجلس وضع ضمنی قوانین کا انتخاب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ مجلس کی تشکیل انتخاب اور چناؤ دونوں طرح سے ہوتی تھی۔

وفد ہوازن کے واقعہ میں رسولِ کریم صلی اللہ نے مہاجرین اور انصار سے فرمایا، کہ نمائندے منتخب کرکے۔ ان کے ذریعے اپنی مرضی سے مجھے مطلع کرو۔ یہ نمائندوں کا انتخاب مجلس قانون ساز کے لیے سند ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جو وفود آتے تھے۔ وہ عوام کے ہی منتخب شدہ نمائندے ہوتے تھے۔

ان تاریخی واقعات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ارکانِ مجلس کا انتخاب عوام کی رائے سے جائز ہے۔

شرائط: ۱۔ اسلام: مجلس قانون ساز کے رکن کے انتخاب کے لیے مسلمان ہونا اولین شرط ہے قرآن مجید میں آتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (آل عمران) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے سوا کسی کو اپنا رازدان نہ بناؤ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کسی قسم کی کمی نہیں کریں گے۔

۲۔ عقل و بلوغت

۳۔ عدل: فاسق و فاجر کی خبر شرعاً غیر معتبر ہے تو مجلس قانون ساز کے رکن کے

انتخاب میں اس کی رائے کیسے معتبر ہو سکتی ہے اس وجہ سے رائے دہندگان کا عادل ہونا ضروری ہے۔

مجلس قانون ساز کے فرائض و حقوق

فرائض: ۱۔ کتاب و سنت اور تعامل صحابہ کی روشنی میں حسب ضرورت ایسے قوانین وضع کریں جو قوم اور ملک کی فلاح کے ضامن ہو۔

۲۔ جو بھی قانون وضع کرنا ہو۔ مفاد عامہ وریاست کو مدنظر رکھ کر اس پر آزادانہ غور و فکر کرے۔

۳۔ خلیفہ کے افعال و کردار کی کڑی نگرانی کرے۔ اگر خلیفہ جادہ مستقیم سے ہٹنے لگے اس کو راہِ ہدایت پر آنے کا مطالبہ کرے۔

۴۔ اگر خلیفہ ہدایت پر نہیں آتا تو بوقت ضرورت اس کو الگ کر دے۔

حقوق: ۱۔ مجلس کے ہر رکن کو خلیفہ یا دیگر عمالِ حکومت کے افعال۔ پالیسی پر تنقید کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

۲۔ اگر خلیفہ مجلس کے مشورہ کے بغیر کوئی قانون نافذ کرنا چاہے تو مجلس کے ہر رکن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ سے مشاورت کا مطالبہ کرے۔

۳۔ اگر مجلس عوام کی رائے سے ایک میعاد معین کے لیے وجود میں آئی ہے تو خلیفہ کو کسی قسم کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجلس کو برخاست کرے۔ ہاں اس میعاد کے گزرنے کے بعد وہ مجلس خود برخاست ہو جائے گی۔

۴۔ اراکین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیت المال کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے کمیشن مقرر کریں یا خلیفہ سے حساب دینے کا مطالبہ کریں۔

مجلس کی صدارت: خلفائے راشدین کی سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ خلفائے راشدین خود صدارت فرمایا کرتے تھے۔ لیکن یہ مسئلہ حالات اور زمانہ کے تقاضوں سے تعلق رکھتا ہے۔

قانون سازی کا طریقہ

۱۔ مسودہ قانون یا تو حکومت کی طرف سے پیش ہوگا یا مجلس کے ارکان کی طرف سے پیش

ہو گا۔

۲۔ ہر رکن غیر جانب داری اور خلوص سے اس تجویز پر غور و فکر کرے گا۔

۳۔ مجلس کے ہر رکن کو پیش کردہ تجویز کرنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ حکومت کے خلاف کرے یا حکومت کی موافقت میں۔

۴۔ مجلس اگر ضرورت سمجھے تو اہم مسائل کے بارے میں ارکانِ مجلس کے علاوہ دوسرے صاحب الرائے اصحاب سے بھی فتویٰ لے سکتی ہے۔

۵۔ مخصوص مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے کمیٹیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔

۶۔ عوام کی مشکلات اور مصائب خلیفہ یا قائم مقام خلیفہ تک پہنچانا اس مجلس کے دائرہ عمل میں شامل ہے۔

۷۔ اگر خلیفہ یا عمال اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس مجلس کا یہ فرض ہے کہ وہ خلیفہ یا عمال سے جادہ ہدایت پر چلنے کا مطالبہ کرے۔

۸۔ ضمنی قانون کثرتِ رائے سے منظور کیا جائے گا۔

۹۔ کوئی ضمنی قانون اسلام کی روح کے منافی نہیں ہو گا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ [1] اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں شامل ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ [2] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

عاملہ یا انتظامیہ

حکومت کا اہم صیغہ Organ. عاملہ یا انتظامیہ Executive ہے اس کا کام

---

[1] المجادلہ ۵۸: ۲۰ [2] المائدہ ۵: ۴۴

ملک کے قوانین کا نفاذ کرنا اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

لفظ عاملہ دو معنوں پر مشتمل ہے وسیع معنی کے اعتبار سے اس جماعت کو کہتے ہیں جو حکومت کے تمام ادنیٰ اور اعلیٰ حکام پر مشتمل ہو اس صورت میں حکومت کے تمام ملازمین جو انتظامی امور کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے ہیں مجموعی طور پر عاملہ یا انتظامیہ Executive کہلاتے ہیں گلکرائسٹ کہتا ہے۔

"وسیع معنی میں عاملہ میں حکومت کے تمام حکام شامل ہیں سوائے ان حکام کے جو قانون بناتے ہیں یا اس کی تشریح کرتے ہیں"

محدود معنی کے اعتبار سے عاملہ سے مراد رئیس مملکت ہے مثلاً شاہِ انگلستان۔

عاملہ کی تنظیم کے اصول: عاملہ کی تنظیم کے چند اصول ہیں انہی اصولوں پر اس کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عاملہ کی تنظیم اس طرح کی جائے جس سے عاملہ میں اتحاد یک جہتی ایک دوسرے پر اعتماد اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ عاملہ کا اہم فرض پاس شدہ قوانین کا نفاذ کرنا ہے۔ اگر اختیارات اراکین مجلس عاملہ میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں تو بحث و مباحثہ میں کافی وقت صرف ہوگا اور اراکین میں یک جہتی اور اتحاد کا رشتہ ٹوٹ جانے کا قوی احتمال ہے۔ اس وجہ سے اختیارات کا سرچشمہ ایک ہو۔ پھر کام کی آسانی کے لیے کچھ اختیارات دوسرے عمال کو دیدیئے جائیں تاکہ وہ خوش اسلوبی سے کام سر انجام دے سکیں۔ عہد نبویؐ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات تمام اختیارات کا مرکز تھی آپ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین تھے۔ کام کی سہولت کے لیے انہوں نے عمال کو اختیارات سونپ دیئے تھے۔

اسلام میں خلیفہ کی ذات تمام اختیارات کا سرچشمہ ہے لیکن خلیفہ کی ذات قانون سے بالادست نہیں ہے۔ اس کو قانون کے دائرہ میں رہ کر ہی اپنے اختیارات استعمال کرنے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ [1] اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ

---

[1] النساء ۴ : ۵۹

کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو اور اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو
تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لے جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں اولی الامر کو اختیارات کا سرچشمہ قرار دیا ہے،
ہاں اگر عوام یہ سمجھیں کہ اولی الامر (خلیفہ) اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہا ہے اور جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے تو اس جھگڑے کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی روشنی میں دور کیا جائے۔ اللہ اور رسولؐ کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام قانون کی بالادستی کا حامی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ [1] جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں اس وجہ سے جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا فان انا احسنت فاعینونی وان انا زغت فقومونی [2] اگر میں نیکی کروں یعنی شریعت محمدیؐ کا پیروکار رہوں تو میری مدد کرنا اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔ اسلام میں امیر اختیارات کا مرکز ہے لیکن شریعت کی حدود کے اندر۔ اگر وہ ان حدود کو پھاندنے کی کوشش کرے تو عوام کا فرض ہے کہ اس کو درست کریں۔

۲۔ عمال کو مرکز کی طرف سے اتنے اختیارات ضرور ملنے چاہییں کہ وہ احسن طریق پر فرائض سرانجام دے سکیں۔ اگر مجلس عاملہ کو اختیارات حاصل نہیں تو سلطنت کے امور خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکے گی۔ لیکن اتنے بھی اختیارات نہیں دے دینے چاہییں کہ وہ عوام پر ظلم کرنا شروع کر دے۔

۳۔ عاملہ کی میعاد کم سے کم اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ اس عرصہ میں حکومت کے انتظام میں پوری دلچسپی لے سکے۔

عاملہ کے فرائض

عاملہ کے فرائض ہر ریاست میں اس کے اپنے حالات کے باعث الگ الگ

---

[1] المجادلہ ۵۸: ۲۰ [2] کتاب الاموال لابی عبیدہ ص ۲۶۶

ہوتے ہیں۔ تاہم چند فرائض حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اندرونی انتظام: حکومت کا اولین فرض ملک میں امن و امان قائم رکھنا اور قانون کی پابندی کرانا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (البقرہ ۲: ۱۲۶) یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ ملک میں امن قائم کرنا حکومت فرض ہے اس فرض کی ادائیگی کے لیے ایک محکمہ ہونا ضروری ہے۔

۲۔ دفاعی فرائض: دوسرا اہم فرض ملک کی سرحدوں کی بیرونی دشمنوں اور اندرونی شورشوں اور بغاوتوں سے حفاظت کرنا ہے اس لیے حکومت محکمہ دفاع قائم کرتی ہے اور ارشادِ الٰہی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ (الانفال ۸: ۶۰) اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو۔ تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

۳۔ امورِ خارجہ: ہر ایک ریاست کے دنیا کی دوسری ریاستوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ایک خاص محکمہ ہوتا ہے، جس کو محکمہ امور خارجہ کہتے ہیں۔

۴۔ مالیاتی اختیارات: مالیات کے صحیح نظام آمد اور خرچ میں توازن حکومت کا ایک اہم عنصر ہے۔ حکومت لوگوں سے ٹیکسوں اور محصولات کی شکل میں بڑی بڑی رقوم وصول کرتی ہے۔ یہ کام محکمہ مالیات کے سپرد ہوتا ہے ارشادِ الٰہی ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً (توبہ ۹: ۱۰۳) یعنی ان کے مالوں سے صدقہ لے۔

رسول کریم صلعم فرماتے ہیں: ان اللہ افترض علیہم صدقہ توخذ من اغنیاءھم فترد فی فقرائہم (مسلم جلد اکتاب الایمان) یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر (مسلمانوں پر) صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے کہ وہ امراء سے لے کر غرباء میں تقسیم کیا جائے۔ ارشادِ الٰہی اور فرمانِ نبویؐ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حکومت لوگوں سے ریاستی کاروبار چلانے کے لیے رقوم حاصل کرے۔ اس طرح قرآن میں اصولی طور مصارف کی مدات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَ
الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ
ابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (توبہ ۹ : ۶۰)

صدقات صرف فقراء کے لیے ہے مساکین اور اس صیغہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہے اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے اور قرض داروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے، یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

۵۔ تعلیم: اسلامی حکومت کے فرائض میں سب سے اہم فرض ترویج تعلیم ہے کیوں کہ تعلیم نبوت کے اولین مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے: لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران ۳ آیت ۱۶۴) یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب سکھاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر ۳۹ آیت ۹) آپ کہہ دیجئے کیا علم والے اور جہل والے برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریمؐ فرماتے ہیں: افضل العبادۃ طلب العلم (کنوز الحقائق حرف الھمزہ) بہترین عبادت علم کا طلب کرنا ہے۔" طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء) ہر مسلم پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔ بعض احادیث میں مُسلمۃ کا لفظ آتا ہے۔

۶۔ تبلیغ: تبلیغ اسلام اسلامی حکومت کا اہم فریضہ ہے ارشادِ الٰہی ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۳: ۱۱۰) تم بہترین امت ہو، جو سارے انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہو۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

مندرجہ بالا فرائض کے علاوہ عاملہ متعدد اور فرائض بھی سرانجام دیتی ہے۔ تجارت،

صنعت، زراعت، صحت عامہ، رسل ورسائل، حمل ونقل۔ کارکنوں کی نگرانی واحتساب۔ آبادکاری وغیرہ انتظامیہ بھی کرتی ہے۔

الغرض عاملہ کے اختیارات اور فرائض میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

عدلیہ Judiciary

حکومت کا تیسرا صیغہ عدلیہ (قضا) ہے۔ قضا اس فیصلے کو کہتے ہیں۔ جو با اختیار ادارے کی طرف سے بطور حکم فیصل صادر ہو۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، "قضا ایک فرض اور محکم ذمہ داری ہے اور ایک قانون ہے واجب العمل (المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۶۰) ابن ہمام حنفی فرماتے ہیں۔ قضا ادارہ ہے جو نزاعی مقامات کا فیصلہ دیتا ہے (فتح القدیر جلد ۶ ص ۳۵۶)

محمود بن محمد بن عرنوس فرماتے ہیں۔ حکومت کے مقرر کردہ با اختیار ادارے کی طرف سے کتاب وسنت اور احکام شرعیہ کی روشنی میں لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ کرنے اور مقدمات کا فیصلے کرنے کا نام قضا ہے (تاریخ القضا فی الاسلام)

اس صیغہ کا یہ کام ہوتا ہے کہ صیغہ مقننہ نے جو قوانین بنائے ہیں اور انتظامیہ نے جو قوانین بنائے ہیں اگر ان کی کوئی شخص خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے کیا سزا دی جائے اور عدل قائم کرے۔ عدلیہ (قضا) کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہوتا ہے یا نہیں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا ملی ہے یا کہ نہیں۔

اسلام بلا تفریق مذہب وملت عدل وانصاف کو حکومت کا اہم فرض قرار دیتا ہے اور اسی پر سوسائٹی اور حکومت کی بقا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور عدل وانصاف کے احکام اتارے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ [2] اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى [3] اور تم جب بات کہو

---

[1] الحدید ۵۷: ۲۵ [2] النساء ۴: ۵۸ [3] الانعام ۶: ۱۵۲

تو انصاف سے کام لو۔ چاہے وہ تمہارا اقربی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ [1] یقیناً اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (المائدہ ۵: ۸) عدل قائم کرو کیوں کہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عادل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں جگہ دے گا جن میں سے ایک امام عادل ہوگا [2]

عدلیہ کی آزادی

قاضی فیصلہ جات کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ خلیفہ یا کسی اور با اثر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے کسی فیصلے پر مجبور کرے۔ بلکہ وہ اسے کسی مقدمہ کی دوبارہ سماعت کے لیے بھی مجبور نہیں کر سکتا۔

القاضی اذا قضی فی حادثۃ فی الحق ثم امر السلطان ان یسمع ھذہ الحادثۃ ثانیا بمشھد من العلماء لا یفترض علی القاضی ذلک [3] قاضی جب کسی مقدمہ میں کوئی فیصلہ کر چکے اس کے بعد سلطان اسے حکم دے کہ وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو اس حکم کا ماننا قاضی کے لیے ضروری نہیں۔

اسلامی حکومت میں قاضی اپنے دائرہ اختیارات میں یہاں تک آزاد ہے کہ وہ خلیفہ کو اپنی عدالت میں بلا سکتا ہے۔ اور اس کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے اور خلیفہ بلا چون وچرا عدالت میں حاضر ہوگا۔

---

[1] نحل ۱۶: ۹۰ [2] بخاری [3] باب خامس کتاب ادب القاضی

اسلامی حکومت کے اوصاف

۱۔ حکومت الٰہیہ قائم کرنا

اسلامی حکومت کا پہلا وصف دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کی حکومت کو حکم کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ [۱] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔

وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ [۲] یعنی خدا کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے تو تم ایمان لاتے ہو۔ پس حکومت کا منصب صرف اللہ کے لیے ہے (جو) بلند (اور) بڑا ہے۔

خدا کی حکومت اس دنیا میں کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں دیتا ہے کہ اس کے نازل کردہ قانون کو دنیا میں نافذ کیا جائے۔

ارشادِ الٰہی ہے۔ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ [۳] سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ [۴] جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ [۵] ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے

---

[۱] یوسف ۱۲ : ۴۰ [۲] المومن ۴۰ : ۱۲ [۳] المائدہ ۵ : ۴۸ [۴] المجادلہ ۵۸ : ۲۰

[۵] الحدید ۵ : ۲۵۔

ساتھ کتاب اور میزان آتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ؎۱

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ ظالم ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلامی ریاست کی سب سے بڑی خصوصیت حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔

اسلام تمام بنی نوعِ انسان کو ایک اصل کی شاخیں قرار دیتا ہے۔ یہ وہ

۲۔ وحدت: عظیم الشان پیغام ہے جو ایک امی نبی نے دنیا کو دیا۔ نسلِ انسانی کی وحدت کا تصور تہذیب انسانی پر وہ احسان ہے، جس کی نظیر دنیا کی کسی تہذیب نہیں ملتی۔

ارشادِ الٰہی ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء ۴: ۱)

اے لوگو اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰: ۱۹) اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اللھم ربنا ورب کل شیئ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ ؎۲ ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس تعلیم کی روشنی میں اسلامی حکومت بلا امتیاز نسل و رنگ، مذہب و ملت تمام لوگوں کو اخوت کی سلک میں منسلک کرتی ہے اور کسی شخص سے بھی امتیازی سلوک نہیں برتتی۔ یہ امتیاز اور خصوصیت صرف اسلامی حکومت کو ہی حاصل ہے۔ یہودی صرف اپنے آپ کو ہی خدا کے محبوب سمجھتے ہیں اور تمام دنیا کو ملیچھ تصور کرتے ہیں۔ ہندو مذہب چار ذاتوں کی تعلیم دیتا ہے اور برہمن کو باقی ذاتوں پر فوقیت دیتا ہے۔ سب سے مظلوم اور گھٹیا ذات شودر ہے۔

فاشزم کی بنیاد ہی ایک خاص قوم اور نسل کی فوقیت پر ہے۔ حکمران طبقہ دوسرے طبقوں سے افضل ہوتا ہے۔ اس نظام میں اعلیٰ نسل کا فرد حاکم ہوتا ہے اور عوام محکوم فاشزم اس طبقاتی تقسیم کو معاشرے کے لیے مفید سمجھتی ہے۔

؎۱ المائدہ ۵: ۴۵ ؎۲ مسند احمد، ابوداؤد

نازی ازم تحریک کی اساس ہی اس نعرہ پہ اٹھائی گئی تھی کہ جرمن قوم ، اعلیٰ قوم ہے صرف اسی قوم کو دوسری اقوام پہ حکومت کرنے کا حق حاصل ہے
سرمایہ داری نظام میں سرمایہ داروں کو برتری حاصل ہے اور اس نظام میں مزدور غلام بن کر رہ گئے ہیں ۔

۳ ۔ مساوات :

مساوات سے یہ مطلب لینا کہ تمام لوگ ہر لحاظ سے برابر ہیں ۔ صحیح نہیں ۔

ہر فرد دوسرے فرد سے قدوقامت ، رنگ وروپ ، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اعتبار سے جدا ہے ۔ اس اختلاف کے دو سبب ہیں :

۱ ۔ پیدائشی سبب

۲ ۔ ماحول کا اثر

پیدائش کے وقت ہر فرد مختلف استعدادوں اور قوتوں کا مالک ہوتا ہے ۔ بعض ذہین وفطین ہوتے ہیں اور بعض غبی ۔ بعض جسمانی طور پر مضبوط اور توانا ہوتے ہیں اور بعض نحیف اور لاغر ۔ یہی اختلاف انسان کی ترقی اور زندگی کی رونق کا سبب ہے ۔

ماحول کا اثر :

ان کی ذہنی اور جسمانی ترقی ماحول کے زیر اثر ہے اگر کسی کو صحت مند ماحول میسر آجائے تو وہ دنیا میں ترقی حاصل کر سکتا ہے ۔

اگر خراب میسر آجائے تو اس کی تمام فطری صلاحیتیں اور استعدادیں نشوونما پانے سے رک جاتی ہیں جس طرح ایک بیج ہوتا ہے اس میں پودے کے تمام اجزا پنہاں ہیں اور وہ پودے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ۔ اگر بیج کو صحیح ماحول نہ آئے تو اس کی تمام مخفی استعدادیں ضائع ہو جاتی ہیں ۔

اس مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں تمام انسان نہ تو ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں اور نہ ہیں ۔ علم تمدن میں مساوات کا صرف مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کو سیاسی ، سماجی ، قانونی اور اخلاقی طور پہ بغیر امتیاز رنگ ونسل اور بلا تفریق دین ومذہب مساوی حقوق حاصل ہیں "

اگر مذاہب عالم اور دنیاوی تحریکات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہیں کہ صرف اسلام ہی حقیقی مساوات کا علمبردار ہے ۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں ہر انسان کو مساوی حقوق دیئے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

۱۔ سماجی مساوات: اسلام تمام بنی آدم کو ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں قرار دیتا ہے اور پیدائشی طور پر کسی کو ایک دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، گورا ہو کالا ہو۔ مشرق کا رہنے والا ہو۔ مغرب کا رہنے والا ہو۔ کسی قوم کسی نسل کسی علاقے کا رہنے والا ہو۔ سب بحیثیت انسان برابر ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً [۱] اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا [۲] اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [۳] مومن بھائی بھائی ہیں۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قد اذھب اللہ عنکم عیبۃ الجاھلیۃ و فخرھا بالاباء انما ھو مومن تقی و فاجر شقی و الناس بنو ادم - و ادم من تراب [۴]

یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے تم میں سے جاہلیت والے تکبر اور آباؤ اجداد پر تفاخر کو دور کر دیا ہے کیوں کہ اصول صرف یہ ہے کہ ایک شخص نیک عمل کرنے والا اور خدا کو ماننے والا ہوتا ہے اور دوسرا بدعمل اور بدبخت اور سب لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا۔

اللھم ربنا و رب کل شیئ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ [۵]
اے ہمارے رب ہر چیز کے پالنے والے میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبے میں فرمایا۔

ایھا الناس الا ان ربکم واحد ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علی عربی و لا لاحمر علی اسود و لا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ [۶]

---

[۱] النساء ۴:۱ [۲] یونس ۱۰:۱۹ [۳] الحجرات ۴۹:۱۰ [۴] ترمذی جلد ابواب المناقب [۵] احمد، ابوداؤد [۶] مسند احمد

لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے تعاون کرنا عار سمجھتے تھے اسلام نے اس مصنوعی تفریق کو بھی ختم کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھپھی کی شادی اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کر دی۔

ب۔ معاشرتی مساوات: معاشرتی مساوات کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد کو بلا امتیاز ذات پات تمام معاشرتی حقوق حاصل ہوں مثلاً جان و مال، عفت کی حفاظت تعلیم اور حفظانِ صحت کا مناسب انتظام وغیرہ۔

I۔ جان کی حفاظت: انسانی جان کی قدر و قیمت جو اسلام کی نظر میں ہے وہ کہیں اور نہیں پائی جاتی۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا[1] اور جو کوئی کسی جان کے بدلہ کے قتل کرے یا زمین میں فساد کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ[2] اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا: فان اللّٰه تعالی قد حرم علیکم دماءکم واموالکم و اعواضکم الا بحقها کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا[3] اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں حرام کر دی ہیں اور ان چیزوں کو ایسی حرمت بخشی ہے جو حرمت تمہارے اس شہر، اس مہینہ اور اس دن کو حاصل ہے مگر حق شرعی کے سلسلہ میں یہ بات باقی نہ رہے گی

II۔ مال کی حفاظت: جس طرح جان کی حفاظت، معاشرہ کی پائیداری اور استحکام کے لیے ضروری ہے اسی طرح مال کی حفاظت بھی۔ اس وجہ سے اسلام نے مال و دولت کے حصول کے لیے جائز ذرائع بھی بیان کر دیے

---

[1] المائدہ ۵: ۳۲ [2] بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳ [3] بخاری کتاب الحج

اور ناجائز بھی۔ تاکہ معاشرہ میں مال کی غلط تقسیم اور لوٹ گھسوٹ کی وجہ سے ناہمواریاں پیدا نہ ہوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ [1]

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من اقتطع حق امرء مسلم بيمينه فقد اوجب الله له النار وحرم عليه الجنة [2] جس نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ذریعے ہضم کر لیا۔ اس کے لیے اللہ نے جہنم کی آگ واجب اور جنت اس پر حرام کر دی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جان، عزت اور مال کی حرمت بیان کرتے ہوئے بیان فرمایا: فان دماءكم واموالكم واعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في بلدكم هذا في شهركم هذا [3] بے شک تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزتیں تم پر ایسی ہی حرام ہیں جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔

III ۔ آبرو کی حفاظت: اسلام نے نسل انسانی کو عظمت اور شرف کے بلند مینار پر کھڑا کیا ہے۔ اسی شرف کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ [4]

اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری دی۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ [5] اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انہوں نے سجدہ کیا۔ سوائے ابلیس کے اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

انسانی احترام کے پیش نظر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا:

فان دماءكم واموالكم واعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا۔ بے شک تمہارا خون تمہارا مال اور تمہاری عزت تم پر ایسی ہی حرام

---

[1] النساء ۴: ۲۹ [2] مسلم [3] بخاری و مسلم [4] بنی اسرائیل ۱۷: ۷۰ [5] البقرہ ۲: ۳۴

ہیں جس طرح یہ دن ۔

۱۷ **مساوات:** یہ جزوی امتیاز صرف معاشرتی اور تمدنی معاملات میں ہے لیکن عدالتی معاملات میں اسلام نے ہر فرد کے درمیان ہر لحاظ سے ترازو کو برابر رکھا ہے قانون کی نظر میں ہر کس و ناکس برابر ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اقیموا حدود اللہ فی القریب والبعید ولا یاخذکم فی اللہ لومۃ لائم[1] اللہ کی حدیں بلاتمیز دور و نزدیک سب پر جاری کرو اور کسی ملامت کرنے والی کی پرواہ نہ کرو۔

عہد نبوی میں ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ اگر اس کو سزا ہو گئی تو جگ ہنسائی ہوگی۔ حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول کریم کے پاس جا کر عورت کو چھوڑ دینے کی سفارش کریں۔ جب اسامہؓ حضورؐ کی خدمت میں گئے اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کے لیے لب کشائی کی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما ھلک من کان قبلکم انھم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع و یترکون الشریف والذی نفسی بیدہ لو فاطمۃ فعلت ذلک لقطعت یدھا[2] تم سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ سزا نیچ لوگوں کو دیتے تھے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

۷ ۔ سیاسی مساوات: سیاسی مساوات سے مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت ، رنگ و نسل ملک کے نظام میں حصہ لے سکتا ہے اور ہر ایک کو ترقی کرنے کے برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

جو شخص قرآن اور حدیث پر نظر رکھتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اسلامی حکومت کی باگ ڈور صرف فرد واحد کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ نظامِ حکومت میں ہر فرد کو مساوی حق حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حکومت کے معاملات میں باہمی مشورہ کیا کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ[3] یعنی ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الحدود ص ۳۱۳ [2] بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع والشریف [3] الشوریٰ ۴۲ : ۳۸ ۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ [1] معاملات میں ان کا مشورہ لے۔ پھر جب پختہ ارادہ کرے تو اللہ پر بھروسہ کر۔ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے ما شاور قوم الا هدوا [2] یعنی جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس نے فلاح پائی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معاملات حکومت میں صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

۱۶۔ اقتصادی مساوات: اسلام کا اقتصادی نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اسلام نہ تو مغربی ممالک جیسی سرمایہ داری کا مؤید ہے اور نہ اشتراکی ممالک جیسی اشتمالیت کا۔ سرمایہ داری نظام میں دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جاتی ہے۔ اشتراکی نظام سرمایہ داروں کا گلا گھونٹ کر زبردستی ان سے مال و دولت چھین لیتا ہے اس کے برعکس اسلام جائز طریقوں سے دولت کمانے کی ترغیب دیتا ہے اور دولت کو صرف چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے دیتا۔ ذاتی ملکیت کو نسل تسلیم کرتا ہے لیکن اجتماعی مفاد کو نظر انداز بھی نہیں کرتا۔

اسلام میں تصورِ ملکیت: تمام معاشی دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اللہ کی یہ ملکیت انسان کے پاس امانت ہے تاکہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق فائدہ اٹھائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ اللہ کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ اور مخلوق کے فائدہ کے لیے زمین بنائی ہے وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ہم نے تم کو زمین پر آباد کیا اور اس میں تمہارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیئے ہیں۔ وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہے کہ سطح زمین پر جو کچھ ہے وہ سب اجتماعی فائدے کے لیے ہے جو بھی اجتماعی فائدے کو نظر انداز کر کے دولت جمع کرے گا، وہ اللہ کا مجرم ہوگا۔

۴۔ شخصی آزادی: اسلامی حکومت میں ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہوتی ہے اور اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک

---

[1] آل عمران ۳: ۱۵۹ [2] کنوز الحقائق حدیث ص ۸۷ (طبرانی)

وُہ اپنی آزادی کو دوسروں کے کسی مفاد کو نقصان پہنچانے یا خطرے میں ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے۔ خطبے کے دوران ایک شخص نے اُٹھ کر کہا "یا رسول اللہ میرے ہمسائے کس جرم میں پکڑے گئے ہیں۔ آپؐ نے سنا اور خطبہ جاری رکھا۔ اس نے پھر اٹھ کر یہی سوال دہرایا۔ آپ نے پھر خطبہ جاری رکھا۔ اس نے تیسری بار پھر اٹھ کر اپنا سوال کیا۔ تب آپ نے حکم دیا کہ اس کے ہمسایوں کو چھوڑ دیا جائے۔

دو مرتبہ سوال سن کر سکوت اس وجہ سے فرمایا کہ کوتوال مسجد میں موجود تھا تاکہ وُہ گرفتاری کی کوئی معقول وجہ بتادے۔ جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "خَلُّوا لَہ جیرانہ (ابو داؤد) اس کے ہمسایہ کو رہا کر دو۔

اسلام کا شخصی آزادی کے متعلق یہ اصول کہ "لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل" (موطا) اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ آزادی سکونت: قرآن مجید میں آتا ہے: سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ [۱] کہ زمین میں چلو پھرو، دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کو نواجث شئتم و بیننا و بینکم ان لا تفسکوا دما ولا تقطعوا ولا تظلموا احدا [۲] ترجمہ: تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان یہ شرط ہے کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم رہزنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو۔

۶۔ فکر و عقیدہ کی آزادی: اسلام ہی وہ دین ہے جس نے حریت اعتقاد کو تسلیم کیا ہے اور ہر فرد کو یہ آزادی بخشی ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ [۳] یعنی دین کو کوئی زبردستی منوانا نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَنْ کَفَرَ فَعَلَیْہِ کُفْرُہٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِہِمْ یَمْہَدُوْنَ [۴] جو کفر کرتا ہے تو اس کا وبال کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنی جان کے لیے سامان کرتے ہیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ کفر اور غلط عقیدہ کی سزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ غلط عقیدہ کی وجہ سے کسی کو سزا دے۔

---

[۱] العنکبوت ۲۹:۲۰ [۲] نیل الاوطار جلد ۷، ص ۱۳۹ [۳] البقرہ ۲:۲۵۶ [۴] الروم ۳۰:۴۴

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ مومن ہو جائیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ [۱] تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

داعی اور مبلغ اپنے عقیدہ کو منوانے کے لیے صرف تذکیر اور موعظہ حسنہ سے کام لے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ پس تم یاد دلاؤ، تم صرف یاد دلانے والے ہو تمہیں ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

۷۔ رائے کی آزادی: اسلام نے رائے کے اظہار کرنے پر کسی قسم کی قدغن نہیں لگائی خواہ دینی ہو یا غیر دینی۔ غیر دینی امور کے متعلق رائے کے اظہار کرنے کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی۔ ہاں دینی امور کے متعلق فساد فی الدین کے خوف سے مجتہد کے لیے یہ شرط لگا دی ہے کہ اجتہاد قرآن مجید اور سنتِ رسول کے مخالف نہ ہو۔ چنانچہ اسلام نے قیاس کو مصادرِ تشریع میں سے ایک مصدر قرار دیا ہے۔

جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل سے ایک حدیث مروی ہے کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا اگر تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش کیا جائے تو کس چیز سے فیصلہ کرو گے انہوں نے کہا۔ جو کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو۔ انہوں نے کہا جو اللہ کے رسولؐ نے فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا وہ قضیہ ایسا ہو جس کے متعلق رسولؐ نے کوئی فیصلہ نہ دیا ہو تب کیا کرو گے تو انہوں نے فرمایا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا [۲]

ایک اور حدیث ہے جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے۔ اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اسے ایک اجر ملیگا۔ اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے"

غیر دینی امور کے متعلق صحابہ کے اپنی رائے کے اظہار کرنے کے واقعات رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بے شمار ہیں۔ ایک غزوہ میں آپ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ فلاں فلاں جگہ پر اتریں۔ ایک صحابیؓ نے آپ سے دریافت کیا۔ یہ فیصلہ وحی سے کیا ہے یا اپنی رائے سے۔ آپؐ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا تو یہ

---

[۱] الکافرون ۱۰۹: ۶ [۲] ابو داؤد و ترمذی

اتارنے کی جگہ مناسب نہیں اس کی بجائے فلاں منزل مناسب ہوگی۔ چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔

۸۔ شوریٰ: حضرت امام راغبؒ "شوریٰ" کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "شوریٰ" کا مفہوم آراء کا حاصل کرنا ہے اس کے لیے پہلے دو سمتیں متعین ہوتی ہیں۔ ایک سمت رائے لینے والے ہوتے ہیں دوسری طرف رائے دینے والے ایک سمت اپنی ذمہ واریوں کے دائرہ میں مہم معاملات سے دوچار ہے۔ ایسی حالت میں ایک سمت کے اصحاب دوسری سمت کے لوگوں سے رائے طلب کرتے ہیں اور سلامتی وکامیابی کے لیے ایک فیصلہ پر پہنچ کرتے ہیں پس اسی کا نام شوریٰ ہے"۔[۱]

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی شوریٰ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ،

"شوریٰ کی روح یہ ہے کہ جماعت کے افراد میں سے ہر فرد اپنے علم اور قابلیت کے مطابق اپنی آراء اور خیالات پیش کردیتا ہے ایک دوسرے کے نظریات آپس میں ملتے ہیں اور اس سے ایک اچھا فیصلہ ہاتھ میں آجاتا ہے"۔[۲]

شوریٰ کی اہمیت از روئے قرآن مجید: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ[۳] معاملات میں ان کا مشورہ لے۔

دوسری جگہ مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کے متعلق آتا ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[۴] اور ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

شوریٰ کی اہمیت از روئے حدیث: ما شاور قوم الا هدوا[۵] جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

حضرت عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگرچہ اللہ اور اس کا رسول شوریٰ سے بے نیاز ہیں مگر شوریٰ کا یہ حکم اس لیے ہے تاکہ امت کے لیے رحمت ہو۔ اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا۔ کبھی اعلیٰ درجہ کی رہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ

---

[۱] مفردات القرآن لفظ شوریٰ جلد ۲ ص ۴۶۵ [۲] تفسیر مظہری آل عمران جلد ۲ ص ۱۶۲
[۳] آل عمران ۳: ۱۵۸ [۴] الشوریٰ ۴۲: ۳۸ [۵] طبرانی۔ کنوز الحقائق حدیث ۸۷

کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا ۱؎

حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر ہم کوئی چیز کتاب و سنت میں نہ پائیں تو کیا کریں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قانون جاننے والے عبادت گزار سے مشورہ کرو۔ پھر یہ ہدایت فرمائی لا تمضوا فیہ رای خاصۃ یعنی ایسے موقع پر کسی شخص کی انفرادی رائے کو نافذ نہ کرنا (اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۵۴)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: ما رأیت احداً اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ یعنی میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اصحاب سے مشورہ کرتا ہو۔

بزرگان دین کی نظر میں شوریٰ کی اہمیت: ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قانون شوریٰ پر عامل تھے تم بھی اس پر عمل کرنا"۔ ۲؎

سقیفہ کے شوریٰ میں حضرت عمرؓ نے عوام کو یہ فرمایا: فمن بایع عن غیر مشورۃ المسلمین فانہ لا بیعۃ لہ (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۳)

اگر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو خلیفہ بنایا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

خلفائے راشدین کا یہی تعامل تھا کہ جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جاتا اور ان کے سامنے پیش آمدہ مسئلہ رکھ دیا جاتا تو ان سے رائے طلب کی جاتی۔ کثرت رائے سے جو طے ہوتا وہی فیصلہ نافذ کر دیا جاتا تھا۔

علامہ شوکانی یمانی لکھتے ہیں کہ:

"مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ سے کام لیتے تھے جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے"۔ ۳؎

ابن خورندادلکھتا ہے کہ:

"امیر حکومت کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ قانون شوریٰ سے قوت حاصل کرے یہ ہو سکتا ہے کہ امیر حکومت کسی معاملہ میں اتنی واقفیت اور مہارت نہ رکھتا ہو جس

۱؎ بیہقی شعب الایمان عن ابن عباس ۲؎ تفسیر مظہری جلد ۲ ص ۱۶۱ ۳؎ فتح القدیر جلد ۱ ص ۵۲۶

قدر معاشرہ کے دوسرے افراد رکھتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم پر صورت حال مشکلات سے پُر ہو جائے دونوں صورتوں میں شوریٰ کا انعقاد اور ماہرین علم و فن کی رائے لینا ضروری ہے۔ جنگی معاملات میں فوج کے کمانڈروں سے مصالح عامہ کے سلسلے میں عوام کے نمائندوں سے مملکت کے نظم اور تعمیر و ترقی کے معاملہ میں اول درجہ کے مدبروں دفتری حکام، انتظامی افسروں اور وزیروں سے شوریٰ میں رائے لینی چاہیئے۔" [1]

شوریٰ کی غرض و غایت: علمائے اسلام نے شوریٰ کی غایتوں کے اظہار کے لیے حسب ذیل الفاظ بیان کیے ہیں۔

۱۔ الاستظہار برایہم (استصواب رائے عامہ) یعنی شوریٰ سے رائے عامہ کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۔ التطییب لانفسہم (اطمینانِ قلوب) شوریٰ کے فیصلہ سے رائے عامہ کا اظہار ہوتا ہے۔

۳۔ ان تکون سنۃ بعد لامۃ تکوینِ قانونِ عامہ یعنی امت کے لیے واجب التعمیل قانون بن جائے

۴۔ ارشاد للاجتہاد (اجتہاد) شوریٰ سے درست نتائج تک پہنچنے میں مدد ملے [2]

۹۔ عدل : عدل کے لغوی معنی ہیں دو حصوں کو اس طرح تقسیم کرنا کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا برابر بھی کمی بیشی نہ ہو۔

اسلامی اصطلاح میں عدل کی تعریف سید شریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"عدلِ افراط اور تفریط کے درمیان ایک نقطۂ مساوات ہے جو اطراف کو برابر رکھتا ہے اور حق پر آکر رُک جاتا ہے"

اسلامی حکومت میں ادنیٰ و اعلیٰ شاہ و گدا، مسلم و غیر مسلم عدالت کی نظر میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص۳۶۰

[2] البحر المحیط ابو حیان اندلسی جلد ۳ ص۹۸ روح المعانی علامہ آلوسی جلد ۴ ص۹۴، ۹۵؛ تعریفات سید شریف ص۵۱۔ الاجتہاد

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؎[1]
آزاد کا بدلہ آزاد سے غلام کا بدلہ غلام سے اور عورت کا بدلہ عورت سے لیا جائے۔ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ قانون کی نظر میں سب لوگ یکساں ہیں۔ عہد نبویؐ کا مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ قریش کو یہ بات ناگوار گزری کہ ان کے قبیلے کی کسی عورت کو سزا ملے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت اسامہؓ سے کہا کہ وہ رسول کریم صلعم کی خدمت میں جاکر سفارش کریں۔ جونہی حضرت اسامہؓ نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے زبان کھولی تو رسول کریمؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور لوگوں کو بلا کر ایک بلیغ خطبہ دیا فرمایا:

انما هلك الذين قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد والله لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها۔ کہ تم سے پہلے ایسے لوگ ہلاک کر دیے گئے کہ جب ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے معاف کر دیتے اگر کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے قسم بخدا اگر فاطمہ بنت محمد صلعم بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں۔

۱۰۔ امن و دفع شر: اسلامی ریاست کا ایک وصف ظلم و فساد کو دور کر کے دنیا میں امن کا قیام ہے۔ یہ وصف اسلام کے نام کے اندر مضمر ہے اسلام کے لغوی معنی صلح کے اندر داخل ہونا ہیں۔ مسلم وہ ہے جو خدا اور اس کے بندوں سے صلح کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ؎[2]۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم سارے کے سارے سلامتی کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ؎[3] اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی جھک جا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی حقیقت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: التعظيم لامر الله والشفقة على عيال الله ؎[4] اللہ کے احکام کی تعظیم کرنا اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا۔

؎[1] البقرہ ۲: ۱۷۸ ؎[2] البقرہ ۲: ۲۰۸ ؎[3] الانفال ۸: ۶۱ ؎[4] بیہقی کتاب الایمان

انسانوں سے محبت کرنے کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ [۱]

ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے زیادہ محبت کرتا ہے ۔

یقول اللہ ان کنتم تریدون رحمتی فارحموا خلقی [۲]

اللہ کہتا ہے اگر تم میری رحمت کی امید کرتے ہو تو میری مخلوق پر رحم کرو ۔

امن کا فروغ ہی طاغوتی طاقتوں کو دبانے سے ہے ۔ اس کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے ۔

فَاقْتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ [۳] (ان طاغوتی طاقتوں سے) جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو ۔ پھر اگر طاغوتی طاقتیں رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لیے نہیں ۔

اگر طاغوتی طاقتوں کو زیر نہ کیا جائے تو دنیا ظلم و فساد سے بھر جائے گی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ (البقرہ ۲ : ۲۵۱)

اگر اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے ذریعے طاغوتی طاقتوں کو نہ گراتا تو آسمان اور زمین کا تمام نظام برباد ہو جاتا ۔

ترمذی میں ایک روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے منع نہ کریں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے گناہ کو عذاب میں مبتلا کر دے ۔

۱۱ - رواداری : جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام وحدتِ انسانی کا پیغام لے کر آیا ہے اس پیغام کو فروغ اور تقویت دینے کے لیے اسلام مذہبی اور سیاسی رواداری کی تعلیم دیتا ہے یہی تعلیم امن عالم کی ضامن ہے ۔

I - مذہبی رواداری : اسلام دوسرے مذاہب کے متعلق یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمام آسمانی مذاہب خدا کی طرف سے ہیں اور ان کے بانیوں اور کتب پر ایمان لانا ضروری ہے ۔ اس وقت تک مسلمان دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک پہلی کتب اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتا ۔

---

[۱] بیہقی کتاب الایمان [۲] کنوز الحقائق حرف الیاء [۳] البقرہ ۲ : ۱۹۲

قرآن مجید میں آتا ہے:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ [1]

اور جو ایمان لائے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا گیا ہے اور تجھ سے پہلے اتارا گیا

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَعِیْسٰى وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ ۲: ۱۳۶) تم کہو، ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ [2] رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔

قرآن مجید کی واضح تعلیم ہے کہ تمام قوموں میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ [3] اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

II - سیاسی رواداری: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (التوبہ ۹) اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ [4]

اللہ تمہیں ان سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور

---

[1] البقرہ ۲: ۴ [2] البقرہ ۲: ۲۸۵ [3] فاطر ۳۵: ۲۴ [4] الممتحنہ ۶۰: ۸

تمہیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کرو اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

وفد (نجران) علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخلوا علیہ مسجدہ بعد العصر فحانت صلاتہم فقاموا یصلون فی مسجدہ فاراد الناس منعہم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوھم فاستقبلوا۔[1]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عصر کے وقت نجران کا وفد آیا۔ آپ نے اس کو مسجد میں جگہ دی۔ ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے لوگوں نے ان کو منع کرنا چاہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو روک دیا۔ پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔

۱۲۔ عوام کی فلاح و بہبود: زمینی حکومتیں جب کسی علاقے کو فتح کرتی ہیں تو اپنی قاہرانہ، سفاکانہ شان و جبروت دکھانے کے لیے ہر قسم کے جور و ستم ڈھاتی ہیں لیکن اسلامی حکومت امن و سلامتی کا پیغام لے کر آتی ہے ملک میں امن و سلامتی قائم کرنا، عوام کی خیر خواہی کرنا اور انہیں ترقی کے بام عروج تک لے جانے کی کوشش کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

۱۳۔ حکومت اور انسانیت: اسلامی حکومت کی بنیاد انسانیت پر ہوتی ہے۔ خلافتِ راشدہ دنیا کی پہلی حکومت ہے، جس کی اس بلند تصور پر اساس تھی۔ اسلامی حکومت نہ تو قومیت پر مبنی ہوتی ہے اور نہ بین الاقوامیت پہ بلکہ اس کی بنیاد انسانیت پر مبنی ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت اپنے کاموں میں مرضی عامہ، مساوات، حقوق انسانی کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ جب تک ایک شخص بھی ضروریات کا محتاج ہے، رئیس مملکت عوام کے سامنے جوابدہ ہے۔

۱۴۔ انتخاب: اسلام سے قبل موروثی بادشاہت کا دور دورہ تھا۔ اسلام نے موروثی بادشاہت کو ختم کر کے رئیس مملکت کا انتخاب عوام یا ارباب حل و عقد کے ہاتھوں میں دیدیا۔ اسلام کے دورِ اول میں خلفاء راشدین کے انتخاب پہ نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خلفاء راشدین کا انتخاب براہِ راست شورٰی

---

[1] زاد المعانی فی ہدی خیر العباد

کے ذریعہ ہوا۔

۱۵۔ **اصلاح معاشرہ:** اسلامی حکومت ان تمام معاشرتی، اقتصادی، تمدنی اور سیاسی برائیوں کا قلع قمع کر دیتی ہے جو سوسائٹی کے بگاڑ کا موجب ہوتی ہے مثلاً زنا، قمار بازی، سود خواری، چوری، رشوت خوری، اقربا پروری، سرمایہ داری، جاگیرداری، ڈاکہ زنی، کم تولنا۔ فریب دہی وغیرہ

۱۶۔ **ہمسایہ ممالک سے برادرانہ تعلقات:** دنیاوی حکومتیں حرص و ہوا کے نشہ میں کمزور حکومتوں پر بلا وجہ جارحانہ حملے کرتی ہیں۔ لیکن اسلامی حکومت اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ، برادرانہ تعلقات رکھتے ہوئے ان کی بہبود کا خیال رکھتی ہے

اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کے اصول

۱۔ اسلامی حکومت کے تمام معاملات صلح اور امن پر مبنی ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اسلام سلامتی، صلح اور امن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی حکومت خارجہ پالیسی میں ہر رنگ میں امن کی روح قائم رکھتی ہے ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال ۸: ۶۱) اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ ۲: ۱۹۳) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو پھر وہ رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوائے اور کسی کے لیے نہیں۔

۲۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی ایک عالمی انسانی برادری قائم کر کے تمام اقوام عالم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتی ہے۔ کیونکہ اسلام نسل انسانی کی وحدت

کا پیغام لے کر آیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا (یونس ۱۰: ۱۹) سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ آپس میں جھگڑ پڑے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (بیہقی) ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کے عیال سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

۳۔ اسلامی حکومت عہد و پیمان کا احترام کرتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴) عہد کے پورا کرو یقیناً عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۵: ۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاہدے پورے کرو۔

۴۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی بین الاقوامی عدل پر مبنی ہوتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۵: ۸) اے ایمان والو! اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسائے کہ عدل کا دامن چھوڑ دو تم بہرحال انصاف کا معاملہ کرو یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

۵۔ چھٹا اصول جنگ کے متعلق یہ ہے کہ جارح قوم کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے ارشادِ الٰہی ہے: وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (بقرہ ۲: ۱۹۰) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ اور حد سے آگے نہ بڑھو۔

ظلم کو مٹانے کے لیے جنگ کرنا ناگزیر ہے لیکن اسلام جنگ میں بھی تعدی سے منع کرتا ہے اور بدلہ اتنا ہی لینا چاہیے جتنا حق ہے ارشادِ الٰہی ہے: وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ ۴۲: ۴۰) اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب شکست کھا چکے تو انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے اس کو ذلیل نہیں کرنا چاہیئے۔

۶۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حق کا ساتھ دیتی ہے اور اثم اور عدوان کے خلاف برسرپیکار رہتی ہے۔
ارشادِ الٰہی ہے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (المائدہ ۵: ۲) یعنی نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرو اور گناہ زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

۷۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کا ایک نمایاں اصول یہ ہے کہ جب دو مسلمان ملکوں کے درمیان لڑائی چھڑ جائے تو محاربین کے درمیان صلح کرائی جائے لیکن اگر کوئی فریق صلح پر رضامند نہ ہو تو اسلامی ریاست اس فریق کا ساتھ دے گی جو مظلوم ہوگا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الحجرات ۴۹: ۹)

اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرادو پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی پر ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرادو اور انصاف کرو۔ کیوں کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔